ہندوستان کے محکمہائے تعلیم میں منظور شدہ
اردو کا علمی و ادبی ماہوار
رسالہ
ادبی دنیا
نقشہ عالم کے مندرجہ ممالک تک ہندوستانیوں کے ساتھ اردو زبان پہنچ چکی ہے
مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مرقع
جولائی سنہ ۱۹۳۱ء
ڈائرکٹر۔ آنریبل جسٹس سر عبدالقادر
ایڈیٹر۔ تاجور نجیب آبادی
سالانہ چندہ چار روپے بارہ آنے محصول وی پی ۴؍
INDIA'S FOREMOST ILLUSTRATED MAGAZ E OF
URDU LITERATURE

Kindly peruse the advertisement and refer "Adabi Dunya," when writing to.

F. M. SAQI,
Advertising Manager.
ADABI DUNYA,
LAHORE.

(ادبی دنیا کے جملہ مضامین کا کاپی رائٹ بحق ادبی دنیا محفوظ ہے)

رجسٹرڈ .... ایل نمبر ۲۴۸۲ Checked 1978

فہرست مضامین

جلد ۵ بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء نمبر ۱

تصاویر:- سہ رنگی (۱) سفینۂ آرزو - (۲) ... کا سرورق - یک رنگی - (۳) ایلمن برن - (۴) جناب نفیس خلیلی - (۵) پروفیسر آر گاموو - (۶) پروفیسر بدر الاسلام فضلی بی اے - (۷) سید علی اختر (۸) سردار موہن سنگھ دیوانہ ایم اے پی ایچ ڈی -

آئینۂ عالم

پنجاب یونیورسٹی

(۱)

پنجاب یونیورسٹی کے متعلق ادبی دنیا کے سلسلۂ مضامین نے صوبے کے مقتدر اہل الرائے کی توجہ کو بیدار کر دیا ہے۔ عمائد پنجاب کے بہت سے خطوط ہمیں موصول ہوئے ہیں جن میں پنجاب یونیورسٹی کی تحریکِ اصلاح پر اظہارِ تحسین کے ساتھ اِس سلسلے کو جاری رکھنے پر اصرار کیا گیا ہے۔ اجازت حاصل کرنے کے بعد ہم اِن خطوط کو شائع کریں گے۔

پنجاب کی مجلسِ آئین ساز کے مشہور ممبروں نے یونیورسٹی کے متعلق ادبی دنیا کے مضامین کو پڑھ کر ہمیں مطلع فرمایا ہے کہ وہ اِس سوال کو اپنے ہاتھ میں لیکر ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کرانے میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں گے۔ کالجوں کے پروفیسر اِس مضمون سے بیحد دلچسپی لے رہے ہیں۔ دفتر ادبی دنیا میں روزانہ دو چار استاد اِس سلسلے میں مزید معلومات فراہم کر کے پہنچا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی حلقہ ایک ہُو کا منتظر تھا۔

اِس تجویز پر بھی غور ہو رہا ہے کہ آنریبل وزیرِ تعلیم اور ہز ایکسیلنسی گورنر پنجاب کے پاس منتخب حضرات کا ایک وفد پنجاب یونیورسٹی کے متعلق شکایات پیش کرے۔

پنجاب یونیورسٹی کے حالات ایک تحقیقاتی کمیشن کی ضرورت مدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ ہر وہ شخص جو اِس یونیورسٹی سے کسی حیثیت سے بھی متعلق ہے یہ جانتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کو "اوور ہال" کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ بقول پروفیسر برج نرائن

"پنجاب یونیورسٹی ایک فریب اور دھوکا ہے۔" اور اِس کے طلسمِ فریب کو توڑنا ہر علم دوست کا فرض ہے۔

آج سے بہت پہلے اصلاح کی یہ تجویز ملک کے سامنے پیش ہو جانی چاہیئے تھی۔ مگر نہ ہو سکی، کیونکہ "پہلے کون بولے؟" کا سوال درپیش تھا اور اِس کے جواب میں ذاتی مصلحتیں، مروتیں، اور خطرات ہر بولنے والی زبان میں لکنت پیدا کرتے چلے آئے تھے۔ لیکن تمام خطرات، تمام مصالح اور تمام مروتوں کو پسِ پشت ڈال کر پہلے بولنے والے کی حیثیت ہم نے اختیار کر لی ہے اور آج دیکھتے ہیں کہ صوبے کے شش جہات میں پہلے بولنے والے کا نعرۂ حق گونج رہا ہے اور اب خطرات خاموش ہیں۔ مصلحتوں کی ڈراؤنی شکلیں ایتھر میں تحلیل ہو چکی ہیں۔ اور مروتیں؟ ہاں مروتیں گلہ گذار نظر آتی ہیں، مگر مفادِ عامّہ کے مقابلے میں شخصی مفاد کو سامنے آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

ہر کام کے لئے ایک وقت اور ہر وقت کے لئے ایک کام ہوا کرتا ہے۔ اب پنجاب یونیورسٹی کے تفصیلی جائزہ لینے کا وقت آ چکا ہے۔ اب یہ تحریک استبدادی طاقتوں کے بس کی نہیں رہی ہے۔ اب یونیورسٹی کے اہلِ استبداد کو سمجھ لینا چاہیئے کہ جبر و استبداد کے خاتمہ کا وقت آ گیا ہے۔

(۲)

ایک ضروری اصلاح

پنجاب یونیورسٹی کے "بورڈ آف سٹڈیز" کے فرائض میں عربی، فارسی، اردو اور پشتو کے امتحانوں کے واسطے نصاب کی تجویز و تنسیخ اور اِن زبانوں کی تعلیم و ترویج کی نگرانی ہے۔ چونکہ عربی کی طرح فارسی بھی ایک مستقل زبان ہے، اور اُس کی طرح ایم۔ اے تک اِس کی بھی تعلیم ہے۔ اور اگرچہ اردو بھی وسعتِ حدود میں فارسی کی ہم پلہ بلکہ بعض پہلوؤں سے اُس سے بھی زیادہ ترقی پذیر ہے لیکن پنجاب یونیورسٹی چونکہ دیسی زبانوں کو ترقی دینے کے خلاف ہے اِس لئے ہم صبر کر کے سرِدست خاموش ہو جائیں گے اگر فارسی اور اردو ایک جدا بورڈ کے سپرد کر دی جائیں۔ اور عربی اور پشتو کے لئے الگ ایک بورڈ مقرر ہو جائے۔

موجودہ بورڈ میں ایسا ممبر کوئی بھی نہیں جو اِن چاروں زبانوں میں درک رکھتا ہو۔ پھر ایسا بورڈ بنانے کے معنی کیا ہیں جس میں ممبر اپنی بے خبری سے کسی زبان کو نقصان پہنچا سکتے ہوں۔

بورڈوں کی ترتیب حسب ذیل ہونی چاہیئے

سنسکرت اور ہندی کے لئے ایک بورڈ

فارسی اور اردو۔

عربی اور پشتو۔

سنسکرت اور ہندی کے لئے الگ بورڈ موجود ہے۔ تو باقی چار زبانوں کے واسطے جن میں تین زبانیں اپنی مستقل ہستی رکھتی ہیں ایک بورڈ کیوں بنایا گیا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ ہر زبان یونیورسٹی میں ایک کس مپرسی کی حالت میں ہو گئی ہے۔ اور اردو کی حالت تو ناگفتہ بہ حد تک پہنچ چکی ہے کیونکہ اردو سے واقفیت، اور دلچسپی رکھنے والا بورڈ میں کوئی نہیں ہے۔ اور جو کوئی ہے بھی وہ بعض ممبروں کی مروت اور مصلحت کے سبب خاموش رہنا پسند کرتا ہے۔

(۳)

کنوینر اور چیئرمین

یونیورسٹی کے "بورڈ آف سٹڈیز" میں عملی طور پر کنوینر کے معنی چیئرمین کے لئے جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ بورڈ کی میٹنگ میں کنوینر صاحب تشریف لائے اور پوچھے بغیر چیئرمین کی حیثیت اختیار کر لی اور چیئرمین کے اختیارات برتنے شروع کر دئے۔ مثلاً ممتحنوں کے تقرر کے لئے بورڈ کی میٹنگ ہو رہی ہو۔ تو کنوینر صاحب اپنے گھر سے اپنے فدا کاروں اور دوسری یونیورسٹیوں کے کاروباری دوستوں کے ناموں کی ایک فہرست تیار کرا لائے۔ اور اُس فہرست کو سانس روکے بغیر پڑھنا شروع کر دیا۔ بیچ میں کسی ممبر کو نئی تجویز یا کسی نام سے اختلاف کرنے کی کبھی جرأت بھی ہوئی تو اُس کی آواز نقار خانہ میں طوطی کی آواز بنا دی گئی۔

ضرورت ہے کہ اس طریقۂ کار کی اصلاح کی جائے اور کنوینر کو سیکرٹری کی حیثیت سے بڑھ کر چیئرمین بننے کی اجازت نہ دی جائے۔

ممبران کو بورڈ کی میٹنگ میں تجاویز پیش کرنے اور تجاویز سے اختلاف کرنے کی اپنے اندر جرأت پیدا کرنی چاہیئے اور کنوینر کی مرتبہ فہرست کو تو معرض بحث میں ہرگز نہ آنے دینا چاہیئے۔

(۴)

ممتحنوں کا تقرر

ممتحنوں کا تقرر بھی کسی اصول کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ بورڈ کے کسی ممبر کو ممتحن بنانا سخت بے اصولی ہے۔ (۱) جس ممبر کو ممتحن بننے کی زیادہ خواہش ہو اُسے بورڈ سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ (۲) چونکہ تمام امتحانات عموماً تھوڑے تھوڑے وقفے کے آگے پیچھے ہوا کرتے ہیں اس لئے یہ قاعدہ بنا دینا چاہیئے کہ کسی ممتحن کو ایک ہزار پرچے سے زیادہ دیکھنے کے لئے نہ دئے جائیں اور اگر وہ کسی دوسری یونیورسٹی کا بھی ممتحن ہے تو وہ پرچے بھی اُسی تعداد میں شامل سمجھے جائیں، کیونکہ یونیورسٹیوں کے امتحانات عموماً ایک ہی موسم میں ہوا کرتے ہیں، اور امتحانوں کے موسم میں کوئی دیانتدار ممتحن اپنا روزمرہ کا کاروبار جاری رکھتے ہوئے ایک ہزار پرچوں سے زیادہ نہیں دیکھ سکتا۔

(۵)

صوبے کے ممتحنوں کی فہرست

اپنے صوبے کے اہل علم وفضل کی ایک فہرست یونیورسٹی کے "بورڈ آف سٹڈیز" کے سامنے رہنی چاہیئے اور اُنہیں باری باری سے اس شرف کا حصہ دار بنایا جائے۔ ہر ممتحن کے لئے تین سال کی میعاد مقرر ہونی چاہیئے۔ تین سال کے بعد اگر فہرست ممتحنین میں اس امتحان کے پرچوں کو کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ملے تو اُسی کو دوبارہ ممتحن بنایا جا سکتا ہے۔

دوسری یونیورسٹیوں سے داد و ستد کا مروجہ طریقہ جاری نہیں رہنا چاہیئے۔ اس سے اپنے صوبے کے اہل علم کی حق تلفی اور اس سے بڑھ کر اُن کی توہین بھی ہوتی ہے۔

(۶)

زاید ممبروں کی تعداد میں اضافہ

پنجاب یونیورسٹی کے موجودہ ممبروں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس میں اضافہ کی ضرورت ہے اور اگر سردست یہ مشکل ہو تو زاید ممبروں کی تعداد میں معقول اضافہ کر دینا چاہیئے۔ تاکہ علمی تعاون و موالات کا دائرہ وسیع ہو جائے۔ اور کام کے لوگوں کو آگے بڑھنے کا موقعہ مل سکے۔

(۷)

مشرقی علوم کی نمائندگی

پنجاب یونیورسٹی میں مشرقی علوم کی نمائندگی کرنے والا جہت سے کوئی نہیں ہے۔ مولوی فاضل، شاستری۔ گیانی۔ اور دوسرے خالص مشرقی امتحانات کی نمائندگی وہ لوگ ہرگز نہیں کر سکتے۔ جنہوں نے عربی، فارسی، اور سنسکرت میں ایم۔ اے کے امتحانات پاس کر رکھے ہیں۔ کیونکہ مثلاً مولوی فاضل میں منطق و فلسفہ اور علوم و فنون کی ایسی کتابیں ہیں جنہیں موجودہ اورینٹل فیکلٹی کا کوئی ممبر قسم کھانے کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔

شمس العلماء علامہ مفتی محمد عبداللہ ٹونکی مرحوم کے بعد پھر کسی عالم کو مشرقی علوم کا نمائندہ نہیں بنایا گیا۔ یہ ایسی کمی ہے جس کی طرف سے دردناک حد تک بے پروائی برتی گئی ہے۔ اب اس کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ ایسے علماء کو یونیورسٹی کا ممبر کیا جائے جو مشرقی زبانوں کو

بلاواسطہ (یعنی انگریزی کی مدد کے بغیر) لکھ پڑھ سکتے ہوں اور مشرقی علوم میں دستگاہ رکھتے ہوں۔ جو مستشرقین یورپ کے اقوال کو وحی اور اُن کی کتابوں کو صحائف آسمانی نہ خیال کرتے ہوں۔

(۸)

چند سال پہلے مشرقی علوم کے امتحانات پاس کرنے والوں کو مختاری کا امتحان دینے کی اجازت ہوتی تھی، مگر یہ رعایت اب منسوخ کر دی گئی۔ مشرقی علوم کے جن فاضلوں نے اس سلسلے میں مختاری کا امتحان پاس کرلیا تھا، باخبر حضرات جانتے ہیں کہ ایل ایل بی پاس کرنے والے عام پلیڈروں کو قانونی بحث میں اُن کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی، اُن کا طریقۂ استدلال قانونی مباحث میں مسکت اور حیران کُن ہوتا تھا۔ مگر جب پنجاب یونیورسٹی میں اُنکا کوئی نمائندہ نہ رہا تو اس رعایت سے وہ محروم کر دئے گئے۔

ہمیں اصرار ہے کہ وہ ہمارا حق تھا اور اپنی جماعت کے اِس حق کو ہم یونیورسٹی کے ارباب اختیار سے حاصل کرکے دم لیں گے۔

(۹)

پنجاب یونیورسٹی کی کارگذاریوں میں پچھلے دنوں ایک اور اضافہ ہوا ہے۔ مشرقی زبانوں کے حقوق کو نظر انداز کر دینا یوں تو یونیورسٹی کی ایک دیرینہ عادت ہے۔ لیکن اب کے اس عادت نے عداوت کی صورت اختیار کرلی ہے، پہلے آرٹ سائڈ کے طلبہ کو عربی، فارسی، اور سنسکرت میں سے کسی ایک زبان کو لازمی مضمون کے طور پر لینا پڑتا تھا۔ شروع شروع میں عربی اور سنسکرت صرف دو زبانوں کو یہ شرف حاصل تھا اور فارسی معمولی حیثیت میں تھی، لیکن پروفیسر کشوری موہن مترا ایم۔اے (عربی و فارسی) کی مسلسل کوششوں سے یونیورسٹی نے فارسی زبان کو بھی عربی اور سنسکرت کا ہم رتبہ بنادیا۔ مگر یونیورسٹی کی جدید عنایت نے اس اصل کو مع سود واپس کرلیا۔ اب کے یونیورسٹی کے بدلیشی پسندوں نے یہ قانون بھی پاس کیا ہے۔ کہ کوئی طالب علم عربی۔ فارسی اور سنسکرت کی بجائے فرانسیسی اور جرمن زبان بھی لے سکتا ہے۔ گویا اب طالب علم ایم۔اے تک مشرقی لٹریچر سے (جن میں اُن کے ملک اور اُن کے بر اعظم کی مکمل تاریخ کا ریکارڈ ہے) بے خبر رہا کریں گے۔ دوسری جانب یہ قانون پہلے ہی سے منظور ہے کہ کوئی طالب علم دیسی زبانوں (اردو، ہندی، پنجابی) کی بجائے ملٹری سائنس لے سکتا ہے۔ تو آئندہ طلبہ کی وہ جماعت جو فرانسیسی اور ملٹری سائنس لیکر اپنی تعلیم ختم کرے گی۔ وہ ہندوستانی زبانوں اور مشرقی لٹریچر سے اسی طرح اجنبی اور بیگانہ ہوگی جس طرح یورپ کے عام باشندے۔ تو اب جن طالبعلموں نے اردو ہندی اور پنجابی کی بجائے ملٹری سائنس مضمون اختیاری کے طور پر لی اور عربی، فارسی اور سنسکرت کی جگہ فرانسیسی پڑھی تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ ملکی زبان سے بھی نابلد ہے اور مشرقی زبان سے بھی انہیں بےخبری رہی۔ اب وہ انگلستان میں رہیں یا فرانس میں، ہندوستان میں تو اُن کے لئے گنجائش نہیں نکل سکتی۔ یا ہماری یونیورسٹی یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ انگریز تا ابد تک ہندوستان کے حاکم رہیں گے۔ اور ہندوستانی اس لئے پیدا ہوا ہے کہ انگریزوں یا فرانسیسوں کی خانسامی کیا کرے۔

یونیورسٹی کے اِس استبداد کے خلاف ملک بھر کو صدائے احتجاج بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ ملک کے اخباروں، انجمنوں اور سبھاؤں کو اِس معاملے پر جلد سے جلد توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی اِس روش کے خلاف آواز بلند کرنے کے ساتھ ہی اِس کی بھی ضرورت ہے کہ سنڈیکیٹ کے اُن ممبروں سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا جائے جو اورینٹل فیکلٹی کے نمائندے بنکر گئے ہیں۔ جنہوں نے دیسی زبانوں کو یونیورسٹی میں اس لئے پامال کیا کہ اُن کے خیال میں یہ زبانیں مشرقی زبانوں کی ترقی میں سدّراہ ہو رہی ہیں۔ مگر مشرقی زبانوں کے حقوق کی پھر بھی وہ حفاظت نہ کر سکے۔

اِن حضرات کو اپنی جگہ ایسے ممبروں کے لئے خالی کر دینی چاہئے۔ جو مشرقی زبانوں سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ہی دیسی زبانوں کو بھی تعلیمات میں زندگی کا حق دینے پر رضامند ہوں۔

ڈاکٹر شجاع الدین کے قابل قدر ایثار، تعلیمی خدمات، ملی خدمات اور اُن کی بے نظیر قابلیت کا ہمیں اور ہر علم دوست کو دل سے اعتراف ہے اور یقیناً وہ ہر پنجابی کے بالعموم اور ہر مسلمان کے خاص طور پر احترام و سپاس کے مستحق ہیں۔ لیکن اِن صفات کے ساتھ ہی بدقسمتی سے اُن کے دل میں دیسی زبانوں کے لئے کوئی ہمدردی نہیں۔ سنڈیکیٹ میں اُن کی موجودگی اردو زبان کے لئے سب سے زیادہ بربادکُن ثابت ہوئی ہے اس لئے ہم عریاں الفاظ میں اُن سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ اور اُن کے ساتھی سنڈیکیٹ سے مستعفی ہو کر اپنی نشستیں دوسرے مسلمان ممبروں کے لئے خالی کر دیں۔

غضب خدا کا۔ ہر صوبے کی یونیورسٹی میں اردو، ہندی، گجراتی، مرہٹی، بنگالی وغیرہ کے ایم۔اے کے نصاب تجویز ہو چکے ہیں۔ ہر صوبے میں اِن زبانوں کے ایم۔اے کے سند یافتہ موجود ہیں مگر پنجاب میں جہاں اردو زبان ہندوستان کے تمام صوبوں کی مجموعی حیثیت سے بھی

زیادہ نشوونما پا رہی ہو۔ اُس صوبے کی یونیورسٹی اُسے ۵۰ نمبروں کی اختیاری حیثیت سے آگے نہیں بڑھنے دیتی اور ہر ممکن طریقے سے اُسے پامال کر رہی ہے۔ اور پھر اس معاملے کی بوالعجبی پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدی از دستِ خویشتن فریاد

(۱۰)

ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں میں مشرقی زبانوں کے امیدواروں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ امتحان میں سوالات کا جواب انگریزی اور دیسی زبان میں سے کسی ایک میں حسبِ منشا دے سکتے ہیں۔ مگر پنجاب یونیورسٹی جو مشرقی علوم و فنون ہی کی نشر و اشاعت کیلئے عالمِ وجود میں آئی تھی۔ مشرقی امتحانات کے امیدواروں کی راہ ترقی میں ہر ممکن روک پیدا کر رہی ہے۔ یہاں انٹرنس سے اوپر کے امتحانات میں انگریزی کے سوا کسی ملکی زبان میں طالب علم کو جوابات لکھنے کی اجازت نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ جن طلبہ کی انگلش کمزور ہے، وہ خواہ عربی، فارسی اور سنسکرت میں کتنے ہی قابل ہوں اُن کی قابلیت کی کہیں پوچھ نہیں ہوتی اور وہ انگریزی کی کمزوری کے سبب عربی، فارسی یا سنسکرت کے امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں۔ اِس کے برعکس بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ مشرقی زبانوں کے نالائق طلبہ انگلش کے زور پر اِن زبانوں کے امتحان میں اچھے نمبر لے کر پاس ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے پردے میں بھی انگریزی ہی کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اِس کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ مشرقی زبانوں سے شغف رکھنے والے طلبہ حوصلہ ہار کر بددل ہو جاتے ہیں اور نااہل اِس آڑ میں انگریزی کے گھمنڈ پر پاس ہو کر مشرقی زبانوں کے اسکالر شمار ہونے لگتے ہیں۔

یونیورسٹی کے ممبروں کو اِس جانب جلد توجہ کرنے کی ضرورت ہے اس بارے میں دوسری یونیورسٹیوں کی پیروی کی جانی چاہیئے۔

پنجاب یونیورسٹی بھی اپنے طلبہ کے لئے یہ سہولت بہم پہنچائے۔ اس تجویز کو بہت جلد قانون کی صورت دینے کی ضرورت ہے۔ مشرقی زبان کے پرچے کا جواب امیدوار کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ وہ چاہے انگلش میں جواب دے خواہ کسی دیسی زبان میں۔

(۱۱)

جو لوگ ... سے انگریزی نہیں جانتے مگر مشرقی ادبیات میں امتیازی مہارت رکھتے ہیں یا کسی خاص شعبۂ علم و ادب پر اُن کی عمیق تحقیقات ہے اُن کے واسطے پنجاب یونیورسٹی کے پاس کوئی عزت و سرفرازی نہیں ہے۔ کوئی اپنی ریسرچ کو انگریزی کا جامہ پہنا دے تو "ڈی لٹ" کی ڈگری لے کر ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ عربی، فارسی، سنسکرت یا اردو میں اپنی تحقیقات کو پیش کرے تو خواہ اُس کی یہ تحقیق و تنقید کیسی ہی گراں بہا ہو، یونیورسٹی اُسے سونگھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ حالانکہ یورپ کی یونیورسٹیاں کسی کتاب کی تصحیح اور انڈکس بنانے پر بھی (جو حقیقۃً کوئی علمی کام نہیں بلکہ محض کلاریکل ورک یا معمولی لیاقت کے منشیوں کا کام ہے) بڑی بڑی ڈگریاں دے دیتی ہیں، ہماری یونیورسٹیوں کی غلامانہ ذہنیت مشرقی طرز کے اہلِ علم و فضل کے حق تلف کر رہی ہے انگریز پرستی تو کوئی بات بھی ہوئی مگر انگریزی پرستی کے لئے تعزیراتِ ہند کی کون سی دفعہ ہمیں مجبور کرتی ہے؟

ہندوستان کو مستقبل قریب میں نوآبادیات کا درجہ حاصل ہونیوالا ہے اور اُس وقت انگریزی کی حیثیت وہی ہو جائے گی جو یونیورسٹی کے غلامانہ ذہنیت رکھنے والوں نے دیسی زبانوں کو دے رکھی ہے۔ یہ زمین مستقبل زیادہ سے زیادہ دو سال میں بصورتِ حال تبدیل ہو جائے گا۔

تو کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ پنجاب یونیورسٹی دیسی زبانوں میں تحقیق و تنقید کرنے والے اہلِ علم کے حقوق تسلیم کر کے اُن زبانوں کی حفاظت و حمایت کرے۔

ہمارا مطالبہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی ایسے اہلِ علم و فضل کی دماغی کاوشوں کے لئے بھی کوئی ڈگری تجویز کرے۔

(۱۲)

پنجاب اورینٹل سوسائٹی کا قیام

پنجاب یونیورسٹی درخواستوں اور التجاؤں کو ہمیشہ سے ٹھکراتی آئی ہے اور یہ مشق اِس کی اسقدر پختہ ہو چکی ہے کہ درخواستیں پیش کرنے کے کوئی معنی نہیں رہے، اب ضرورت ہے آئینی ایجی ٹیشن کی۔ اور اُس کے لئے ایک منظم جماعت درکار ہے۔ چند سال ہوئے ہم نے اورینٹل سوسائٹی کے نام سے ایک ایسوسی ایشن قائم کی تھی مگر افسردہ دل ساتھیوں کے سبب وہ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکی۔

اب اسکی نشاۃ ثانیہ کا موزوں وقت آگیا ہے، چنانچہ ہم نے اس سوسائٹی کو از سرِ نو قائم کر لیا ہے۔ اگلی اشاعت میں اُس کے پروگرام کی تفصیل اور کارکنوں کی فہرست شائع کی جائے گی۔

پنجاب اورینٹل سوسائٹی کا مقصد مشرقی زبانوں (جس میں ملکی زبانیں

بھی شامل ہیں) کی حفاظت و اشاعت اور مشرقی زبانوں کے اساتذہ کے حقوق کی نگرانی ہوگا ۔

اِس سوسائٹی کے زیرِ اہتمام مؤثر طریقہ پر ایجی ٹیشن کر کے پبلک اور حکومت کو پنجاب یونیورسٹی کی مشرقیات سے مسلسل بے اعتنائی پر توجہ دلائی جائے گی ۔

"فلیبلغ الشاہد الغائب"

سید عابد علی صاحب ہمارے عزیز دوست ہیں ۔ ادبی دنیا کے قارئین اُن سے اچھی طرح واقف ہیں ۔ لیکن چند لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ہم سے مصنوعی ناراضی کا اظہار کرنا ایک خاص وقت تک کے لئے ضروری سمجھتے ہیں ۔ فارسی (ایم اے) کے پرچے آؤٹ ہونے کے متعلق اُنہوں نے جو بیان ہمیں دیا تھا حالات موجودہ میں ہم بھی چاہتے ہیں کہ وہ اِس بیان سے پھر جائیں ۔ اور ہم سے جنگ زرگری جاری کر دیں ۔ اتنی سی بات میں اگر اُن کا کوئی فائدہ ہوتا ہے تو اُس فائدہ کو حاصل کرنے میں ہمیں اُن کا مددگار بننا چاہیئے ۔ لیکن آج کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں ماہ جون کی تیس تاریخ ہے ، اِس تاریخ کو وہ اپنی ڈائری میں ہماری اِس پیشگوئی کے ساتھ درج کر لیں کہ

جس وقت کا اُنہیں انتظار ہے وہ کبھی نہ آئے گا کیونکہ وہ اُن کے ایک نااہل ترین حریف کے لئے مقدر ہو چکا ہے ۔

سُنا جاتا ہے کہ اِس بار بی ۔ اے کا نتیجہ شائع ہونے میں تاخیر کا باعث یہ ہوا کہ عربی کے پرچوں میں طلبہ بہت زیادہ فیل تھے ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عربی کا کون سا پرچہ ایسا تھا جس میں فیل ہونے والے طلبہ زیادہ تھے یا کسی ممتحن نے اپنی قابلیت کا مظاہرہ ضرورت سے زیادہ کیا؟ آخر طلبہ کے مستقبل کو کیوں خطرہ میں ڈالا گیا؟

ایک بار پہلے بھی یہ واقعہ ہو چکا ہے کہ بیرون پنجاب کے ممتحنوں نے پرانے عربی کورس سے پرچہ بنا دیا تھا اور طلبہ نے امتحان کے وقت صدائے احتجاج بلند کی تھی ، اِس لئے اُن کا اس پرچے میں دوبارہ امتحان لیا گیا تھا ۔ پنجاب اور خود لاہور میں جب عربی کے اساتذہ ایسے ہیں جو ممتحن بن سکتے ہیں اور پہلے بنائے جاتے رہے ہیں ۔ تو اب اُن میں کون سا ایسا نقص پیدا ہو گیا کہ وہ معتوب التفات ہو گئے ۔

اِس بارے میں سنڈیکیٹ کے ممبروں کو ذاتی مروتوں سے بالا ہو کر یہ غور کرنا چاہیئے کہ کہیں اِس پردے میں ذاتی مناقشات تو کام نہیں کر رہے ہیں؟

فارسی ایم ۔ اے کا ایک پرچہ اسلامیہ کالج کے پاس تھا اور دوسرا دیال سنگھ کالج کے اور تیسرے پرچے کے ممتحن مولوی محمد اسمٰعیل صاحب ایم اے فورمن کرسچین کالج کے پروفیسر تھے ۔ اب خدا جانے کن وجوہ یا بنا پر اسلامیہ کالج سے پرچہ لے کر ایک دوسرے کالج کے اردو لیکچرر کو دیدیا گیا ۔ کیا پروفیسر محمد عمر خاں صاحب یا مولینا روحی جیسے فضلائے روزگار سے یہ اعزاز بالاتر سمجھا گیا؟

دیال سنگھ کالج میں پروفیسر مترا جو عربی و فارسی کے ڈبل ایم اے ہونے کے علاوہ یورپ اور ایشیا کی کئی زبانیں جاننے کی طرح جانتے ہیں اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے اوق نصاب کی بھی تکمیل کر چکے ہیں ۔ بیس سال سے عربی اور فارسی ادبیات کے مطالعہ کو مشغلۂ زندگی بنا رکھا ہے ۔ الہ آباد یونیورسٹی کے مدتوں ممتحن رہے ہیں ۔ پنجاب یونیورسٹی میں عربی و فارسی ایم اے کے ممتحن بنائے جاتے رہے ہیں ، مدت سے فارسی ایم اے کو پڑھا رہے ہیں ۔ آخر اُنہیں کس خطا پر فارسی ایم اے کے زمرۂ ممتحنیں سے الگ کیا گیا؟

ایف ۔ اے اور بی ۔ اے کے فارسی کورسوں کے اغلاط شائع کر کے وہ طلبہ اور اساتذہ کو ہمیشہ قابلِ قدر امداد پہنچاتے رہتے ہیں ۔ پنجاب یونیورسٹی کو اُن کا سپاس گذار ہونا چاہیئے ۔ کہ اُس کے ایڈیٹروں کی پروفیسر مترا صحیح رہنمائی کرتے رہتے ہیں ۔

مولوی محمد اسمٰعیل صاحب ایم ۔ اے پروفیسر فورمن کرسچین کالج ایک فسٹ گریڈ کالج کے سنیئر پروفیسر ہیں ۔ فارسی اور عربی ادبیات پر عبورِ تام رکھتے ہیں ، ایم اے عربی و فارسی کے ممتحن رہتے چلے آئے ہیں ۔ بتایا جائے کہ اُنہوں نے ممتحن بننے سے کس بنا پر انکار کر دیا؟

پنجاب کے کالجوں میں بہتر سے بہتر عربی و فارسی کے اساتذہ موجود ہیں ، اُن کی موجودگی میں اِن زبانوں کے پرچے بیرونی حضرات کو کیوں دیئے جاتے ہیں؟

اِس سوال پر یونیورسٹی کے اُن ممبروں کو غور کرنے کی ضرورت ہے جو پارٹی بازی سے الگ تھلگ رہتے ہیں ۔

مقطع سخن

اِس دفعہ پنجاب یونیورسٹی کے حالات نے کئی ضروری مضامین کی اشاعت روک دی ۔ آئندہ ہم اِس ذکر کے لئے ایک آدھ صفحہ سے

زیادہ نہ دے سکیں گے، کیونکہ اورینٹل سوسائٹی کے بعض سرگرم اراکین اِس سلسلے کے لئے ادبی دنیا کے دامن کو تنگ پاتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ادبی دنیا مہینے میں ایک بار شائع ہوتا ہے اور اِس اہم مبحث کیلئے ہفتہ وار اور روزانہ اخبارات کی ضرورت ہے اِس لئے اورینٹل سوسائٹی کے بعض اراکین نے دو چار روزنامجات سے معاملہ طے کیا ہے۔ اورینٹل سوسائٹی کے ماہانہ جلسے بھی پنجاب یونیورسٹی کی "تحریک اصلاح" کی جانب اہل پنجاب کو توجہ دلاتے رہیں گے۔

پنجاب یونیورسٹی کے بعض نام نہاد منتظموں کے خلاف جس سلسلۂ مضامین کا ہم اعلان کر چکے ہیں اُن میں بعض حضرات نے پیش قدمی کے طور پر ہم پر حملے کرنے شروع کر دئے ہیں۔

مثلاً ایک نیم ماسٹر اور نیم لکچرار بزرگ ہیں جو اردو اور فارسی کے کئی پرچوں کے ممتحن ہیں اور ایم اے تک ہمیشہ "ساتواں پرچہ" ہی تیار کر کے پاس ہوتے رہے ہیں۔ اردو سے اُنہیں وہی تعلق ہے جو سفیدی کو سیاہی سے ہے، اُن کا محبوب مشغلہ طبلہ نوازی ہے۔ اور خاندانی اعزاز

"زنند جامۂ ناپاک گازراں بر سنگ"

چلا آتا ہے، وہ بدقسمتی سے تعلیمی لائن میں کسی نہ کسی طرح آ گھسے ہیں۔ صوبے میں ایک وزیر کی خوشنودی کے لئے حقوقِ ملی کو فروخت کرنے کے جرم میں بدنام ہو چکے ہیں۔

تخلص کے بھی گنہگار ہیں مگر عملی طور پر اِس گناہ کی اہلیت سے محروم ہیں۔ انگریزی کی تعلیم ایم اے (ہومیوپیتھک) ہے، یعنی ہومیوپیتھک کے طریقے پر تیسرے درجہ میں ایم اے کیا ہے۔

اِن بزرگوار کی باتیں سُن کر آرین قوم کے اُس نظریہ اور قانون کی قدر کا اندازہ ہوتا ہے کہ

"شودر اور اچھوت کو علم پڑھانا ایسا ہے جیسے دیوانے کے ہاتھ میں تلوار دے دینا۔"

یہ بزرگوار بھی نوک پنجے سے درست ہو کر میدان میں آنے کے لئے اذانیں دے رہے ہیں۔

اُنہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ جس آقائے بے سواد کو خوش کرنے کے لئے یہ غیر ارادی حرکتیں کر رہے ہیں اُس کے استبداد کا خاتمہ قریب ہے۔

ہم سے ہمارے ایک محترم نے بطور شکوہ فرمایا تھا کہ "آپ کی تحریر کا لہجہ ذرا سخت ہے" لیکن ہم اس کے متعلق یہ عرض کرتے ہیں کہ ہماری تحریر کا انداز سخت ہو یا نہ ہو مگر پست ضرور ہے اور یہ تکلیف وہ ایثار ہم نے اِس لئے برداشت کیا ہے کہ ہمارے مخاطب جس پستی میں ہیں اگر ہم اپنی بلندیوں سے اُنہیں خطاب کریں تو اُن تک ہماری آواز نہیں پہنچ سکتی۔ اِس لئے ہمیں اُن کی خاطر بلندیوں سے اُترنا پڑا ہے۔

سردار موہن سنگھ دیوانہ ایم اے لکچرار پنجاب یونیورسٹی کو امسال اردو ادب کے متعلق ایک محققانہ مضمون لکھنے پر کلکتہ یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دینے کی تجویز کی ہے۔

سردار صاحب طالب علمی ہی سے اردو ادبیات سے شغف رکھتے ہیں۔ پنجابی زبان کے ادبیات پر اُن کا ایک سیر حاصل مضمون ادبی دنیا میں بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ اِس کے علاوہ اردو کے شعرائے ماضی و حال کے کلام کا انتخاب بھی بڑی محنت و عرق ریزی سے کر چکے ہیں۔ اور اب کئی سال کی کتب بینی اور عمیق مطالعہ کے بعد اردو ادب اور اُس کے مشاہیر پر آپ نے ایک محققانہ کتاب تصنیف کر کے کلکتہ یونیورسٹی کو پیش کی تھی جس پر اس یونیورسٹی نے آپ کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دینی منظور کی ہے۔ ہم اس قابلِ فخر کامیابی پر سردار صاحب کو دنیائے اردو کی جانب سے دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ہمارے افسانہ نگار مسٹر ظفر قریشی دہلوی نے امسال روشن کامیابی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ہم اپنے اِس نوجوان ادیب کو ادبی دنیا کی جانب سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مشہور فاضل ادیب حضرت وحشت کلکتوی استاد مدرسہ عالیہ کلکتہ کو امسال خان بہادری کا خطاب ملا ہے۔ حضرت وحشت ہماری جانب سے ہدیۂ تبریک قبول فرمائیں۔

اِس نمبر کی سہ رنگی تصویر

ٹینی سن کی شہرۂ آفاق نظم "لیڈی آف شیلاٹ" کی ہیروئن کی ہے۔ اِس نے تمام عمر سر لنسیلاٹ کی محبت اور جدائی میں بسر کی ایک دن فرطِ شوق سے مجبور ہو کر اپنے محبوب کے قصر کی طرف چلی۔ راستے میں دریا پڑتا تھا کشتی پر بیٹھ کر اُسے عبور کیا۔ محبت اور جدائی کے متواتر صدموں سے اِسقدر مضمحل ہو چکی تھی کہ اِدھر کشتی قصر کے نیچے پہنچی اُدھر اس کا دم نکل گیا۔

مدیر

جدید الفاظ

یہ عنوان مستقل رہے گا۔ اِس کے تحت میں جدید الفاظ، جدید اصطلاحات اور دوسری زبانوں کے اہم الفاظ کا اردو ترجمہ درج کیا جایا کرے گا۔

(۱) مسٹر حفیظ الرحمٰن صاحب سیہوروی مونگیر سے حسب ذیل انگریزی الفاظ کے ہم معنی اردو الفاظ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

1. Ideal —— noun جیسے To follow the 'ideal'.
2. Ideal — — — adjective } جیسے Man in his youth retains the ideal 'element' in him.
3. 'Element' ——
4. Conference. 5. Congress. 6. Committee. 7. Mystic. 8. Myriad-minded. 9. Epitaph 10. Epitome جیسے India is an 'epitome' of the world. 11. Annivasary. 12. Bewilder.

"مجلس علمیہ" نے اِن الفاظ کے لئے حسب ذیل الفاظ تجویز کئے ہیں۔ اگر کوئی علم دوست ان سے بہتر اور زیادہ موزوں الفاظ تجویز کر سکیں تو دفتر ادبی دنیا کو مطلع فرما سکتے ہیں۔ تاجور

اردو الفاظ

(۱) اِسمی حالت ۔ معیار ۔ منتہائے مقصود ۔ نصب العین ۔ آدرش ۔

(۲) صفت ۔ معیاری ۔ آدرشی ۔

(۳) عُنصُر (۴) کانفرنس کا لفظ خود اردو بن چکا ہے بعض اسلامی اخبارات مصری پرچوں کی تقلید میں اس کی بجائے مُؤتمر بھی لکھتے ہیں۔

(۵) کانگرس ۔ (۶) کمیٹی (۷) مُتصوّف ۔ عارف ۔ سادھو ۔

(۸) ہمہ داں ۔ (۹) کتبہ ۔ (۱۰) خلاصہ ۔ اجمال ۔ لُبِ لُباب ۔ حاصل ۔

(۱۱) سالگرہ ، سالانہ تقریب (۱۲) حیران کرنا ۔ اس کا ہم معنی حیرت انگیزی ۔

تنقیدِ شعری

ہر عشق تری اُلفت کے سوا آئینہ ہے خود غرضی کا
جو تجھ سے محبّت کرتے ہیں وہ تجھ سے محبّت کرتے ہیں (تاجور)

مولانا جامی نے اپنے ایک شعر میں عشق و محبت کی تحلیل کر کے، یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عشق درحقیقت ایک قسم کی خود غرضی ہے۔ اور عاشق ایک مطلب پرست کا نام ہے۔ ہر شخص اپنی گوں اور اپنی غرض کا بندہ ہے۔ بے غرض محبت دنیا سے مفقود ہے۔ بنابریں وہ اہلِ عشق کے متعلق اپنی بے لاگ رائے کا اظہار اِس طرح فرماتے ہیں کہ

"شک نیست عاشق اند وے عاشق خود اند"

یعنی دنیا میں کسی سے عشق کا دعوےٰ کرنے والے جھوٹے ہیں، وہ صرف اپنے عاشق ہیں کیونکہ اُن کا عشق اغراض پر مبنی ہے۔ یوں بھی فطرتِ انسانی داد و ستد کے قانون پر کاربند ہے۔

انسانی معاشرت میں میل جول، دوستی، محبّت، اور اپنایت کے الفاظ "امداد باہمی اور اعانت یک دیگر" کے لئے بے تکلف استعمال ہوتے ہیں۔ اور بے غرض محبت کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔

الغرض محبّت خدا سے ہو یا مخلوق سے اُس کا تجزیہ کیا جائے تو اِس پردے میں کوئی خوبصورت سی غرض، خواہش یا آرزو نظر آئے گی۔

عاشق اپنی غرض کا بُت عشق سے پہلے ہی تراش لیتا ہے، البتہ وہ غرض اُس کی فطری مناسبت کے مطابق پست یا بلند ہوسکتی ہے فطرت میں دنائت راہ پاگئی تو وہ غرض ہوس پرستی کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اور طبیعت میں پاکیزگی، بلندی اور صحیح ذوقِ حسن ہو تو پھر شوقِ دیدار، ذوقِ لقا، آرزوئے تکلم، التماسِ ہم نشینی، یہ جذبات اغراض بن کر براہِ راست محبوب سے وابستہ ہوجاتے ہیں۔ اور اب عاشق کا مرکزِ توجہ، محبوب انہیں اغراض کے باعث بن جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ فطرت شناس جامی کی رائے میں ہر عاشق ایک غرضمند اور ہر عشق کسی غرض کا آئینہ دار ہے۔ اور نتیجے کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر عاشق درحقیقت اپنا ہی عاشق ہے کیونکہ اپنی کسی غرض کے لئے محبوب سے عشق جتا رہا ہے۔ زیبِ عنوان شعر میں شاعر بھی جامی اور فطرۃ کا ہمنوا ہے مگر اسی کے ساتھ عشق و محبت کے اِس کلیہ میں ایک نادر استثنا بھی پیدا کرتا ہے۔ وہ عشق کی ایک ایسی مافوق العادۃ مثال پیش کر رہا ہے جس کے سامنے ہر عشق سرنگوں ہے۔

وہ اِس واقعیت کو تسلیم کرتا ہے کہ ہر عشق کی بنیاد کسی غرض پر ہے۔ اور ہر عاشق اپنی غرض پرستی کے سبب درحقیقت اپنا ہی عاشق ہے اور یہ کہ کوئی ایسا محبوب نہیں ہوا جس سے کسی نے بے غرض محبّت کی ہو لیکن اے دوست تیری ذات دنیا کے تمام محبوبوں سے جدا، تیری محبّت تمام محبتوں سے ارفع اور تیرا دردِ عشق رکھنے والے تمام اہلِ عشق سے ممتاز ہیں۔ تجھ سے محبّت کرنے والے صرف تجھ سے محبّت کرتے ہیں تیری ملکوتی محبت، تیرے عشق کا دامن، غرض کی آلودگی سے پاک۔ ہر شوق، ہر حسرت، اور ہر آرزو کے تلوث سے بے داغ ہے۔ تیرے چاہنے والے تجھے اپنے لئے نہیں چاہتے کہ وہ تیرے عاشق ہیں۔ اپنے عاشق نہیں۔ تجھ میں اور تیرے چاہنے والے میں بے غرض محبت کے سوا فطرت کی کوئی لغزش حائل نہیں۔

خدا مجھ کو تجھ سے ہی محروم کر دے
جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں

عشق و محبّت کا جو بلند اور پاکیزہ معیار اِس شعر میں پیش کیا گیا ہے اُسے سامنے رکھ کر انسان اُن اعلیٰ صفات سے متصف ہوسکتا ہے جو انسان کو کائناتِ وجود کی شریف ترین مخلوق بنا دیتی ہیں۔ اور جو انسانیت اور الوہیت کے درمیانی حجابات کو چاک کر کے انسان کو خدا سے قریب کر دیتی ہیں۔ اور یہی عشق ہے جو بڑھتے بڑھتے انجام کار حسن کا آئینہ دار ہو جاتا ہے اور پھر اس مرحلے پر پہنچ کر عشق و حسن میں امتیاز نہیں کیا جاسکتا ؎

تری محبت میں میرے چہرے سے ہے نمایاں جلال تیرا
ہاں تیرے جلووں میں محو ایسا کہ تیرا آئینہ دار ہوں میں

تاجور

سفینۂ آرزو

شبِ مہتاب میں گرمِ مسافت اِک سفینہ ہے
محبّت کا سمندر، آرزوؤں کا سفینہ ہے

دماغِ حسن میں فردوسِ منزل کا تصوّر ہے
اِسی ساحل سے امیدوں کے ساحل کا تصوّر ہے

تمنّاؤں کا دل میں اِس طرح ہیجان برپا ہے
کہ جیسے بحرِ بے پایاں میں اِک طوفان برپا ہے

بہے جاتی ہے کشتی عشق کے پُرزور دھارے پر
محبّت ناخدا ہے ۔ لے ہی جائیگی کنارے پر

یہ رشکِ حُور جس کو دیکھ کر قدسی بھڑک جائیں
یہ متوالی نگاہیں ، جن سے زاہد بھی بہک جائیں

یہ جس نے زندگی بھر اک تمنّا کی پرستش کی ؛
یہ جس کی آرزو نے ایک ہی محور پہ گردش کی

یہ جس نے زندگی کا ماحصل سمجھا محبّت کو
یہ جس نے دیدیا نازک سا دل اِک بےمروّت کو

وقارِ حُسن کو جس نے کیا قرباں محبّت پر
خدائے حسن ہو کر لائی جو ایماں محبّت پر

یہ حُسنِ نوبہار اِس کا - یہ جسمِ مرمریں اِس کا
قیامت اُس پہ اندازِ اذیّت آفریں اِس کا

کھُلے بالوں سے ظاہر ہے طبیعت کی پریشانی
عیاں ہے سہمگیں چہرے سے فرقت کی پریشانی

اثر ہے سوزِ پنہاں کا الم انگیز آہوں میں
ملی ہیں رُوح کی بے تابیاں ترچھی نگاہوں میں

ہُوئیں نذرِ جفائے دوست اُمیدیں جوانی کی ؛
رہیں بے رنگ ولو اب تک بہاریں زندگانی کی

عیاں ہے اِس کے چہرے سے اور اِسکی رُوح پہ طاری
محبّت اور انجامِ محبّت کی دل آزاری ؛

قریبِ آرزو کی آخری منزل پہ آپہنچی ؛
یم مواجِ مرگِ عشق کے ساحل پہ آ پہنچی ؛

سوئے مرگ تک کی آرزو کی رہبری غم نے
اجل کو کرلیا آمادۂ چارہ گری غم نے ؛

کوئی دم اور جسمِ زار میں ہے میہمان اِس کی
نکل جائیگی دل کی آرزو سے پہلے جان اِس کی

وقار (انبالوی)

تصحیح

ادبی دُنیا کا یہ عنوان مستقل ہے۔ اِس کے تحت میں اُردو خواں و اُردو داں حضرات کی کسی لفظی، املائی یا تلفظی غلطی کی تصحیح شائع کی جایا کرے گی

بمعہ

یہ لفظ ہمراہی، معیت اور ساتھ کے معنی میں لکھا بولا جاتا ہے۔ یوپی میں عام اسعد خواں اور پنجاب میں اکثر اخبار نویس اِسے اِس معنی میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔

پرنسپل بمعہ اسٹاف، استاد بمعہ طلبہ۔ اِس غلطی سے احتیاط کی ضرورت ہے۔

اُستاد مع طلبہ۔ خط مع لفافہ، پرنسپل اور اسٹاف، پرنسپل اپنے اسٹاف کے ساتھ وغیرہ۔

تشریح۔ معہ کے ساتھ ب کا استعمال (بمعہ) درست نہیں۔ دوسرے یہ کہ معہ کی اضافت کسی غیر فارسی و عربی لفظ کی طرف درست نہیں ہوسکتی۔ جیسے پرنسپل معہ اسٹاف، میں اسٹاف انگریزی لفظ ہے۔ معہ کی اضافت اُسکی جانب صحیح نہیں۔

تصحیح کی تصحیح

"رُوح و رواں" کی تصحیح کرتے ہوئے مصحح سے ایک لغزش ہوگئی کہ رُوح اور رواں کی ر کو مضموم (پیش والی) بیان کیا گیا ہے۔ اصل میں "روح" کی ر مضموم ہے۔ اور "رواں" کی مفتوح (زبر والی)

رُوح و رَواں　　　　تاجور

سوال و جواب

سوالات

(۱) "ہفتاد دو دو فرقِ حسد کے عدو سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں"

کیا ہفتاد دو دو فرق کا مطلب صرف ۷۲ تک ہی محدود ہے، یا جیسا کہ ایک شخص کی بڑی عمر ہو جانے پر "سترہ بہترہ" کہا جاتا ہے، اس ستر بہتر کے محاورہ سے ملحق ہے۔" (راجہ صابر علی کراچی)

(۲) ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

غالب کے اس شعر کا مطلب ذرا تشریح کے ساتھ بیان فرما دیجے۔
(محمد عبداللہ عیدوی خان پور تحصیل نکودر)

(۳) ترے تیر کی خطا کیا مری حسرتوں نے روکا
نہ لپٹتیں یہ بلائیں تو یہ دل کے پار ہوتا
مرے دل کو یوں مٹایا کہ نشان تک نہ رکھا
میں لپٹ کے رو تو لیتا جو کہیں مزار ہوتا

ان اشعار کا مطلب میری سمجھ میں پورے طور پر نہیں آیا۔ بیان فرما کر ممنون فرمائیے۔ (ترلوک ناتھ کوہلی عظیم آباد)

(۴) مندرجہ ذیل لفظ کن ہجوں سے صحیح ہے؟

ہرج یا حرج؟

(عبدالمجید سجانہ مولوی غلام علی کوچہ وہاب امرتسر)

(۵) ا۔ بذریعہ ادبی دنیا مطلع فرمائیں کہ محاورے میں جس طرح "کور چشم" لوگ بولتے ہیں اسی طرح کور دماغ بھی بول سکتے ہیں یا نہیں؟

ب۔ دوسری گذارش یہ ہے کہ لفظ فکر کو جہاں تک تحقیق سے پتہ چلا یا ہے اہلِ دہلی مذکر لکھتے ہیں اور اہلِ لکھنؤ مؤنث۔

لیکن پھر بھی مرزا غالب نے اپنے شعر میں فکر کو مؤنث ہی لکھا ہے اس کی کیا وجہ ہے، کیا مرزا غالب دہلی کے نہ تھے اور اگر تھے تو پھر کیا وجہ ہوئی کہ اُنہوں نے ذیل کے مصرعہ میں فکر کو مؤنث لکھا ہے، ع

"فکر میری گہر اندوزِ عباراتِ جلیل" (سید ظہیر احمد پٹنہ سٹی)

(۶) ذیل کے دو شعر تشریح طلب ہیں ان کی شرح ادبی دنیا میں شائع فرما کر ممنون فرمائیں۔

(۱) اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو
دھرموں کے سب بکھیڑے اس آگ میں جلائیں

(۲) بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیرِ خاک بھی
ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا

پہلے شعر میں نرگن کی تشریح اور دوسرے میں چنار کی خصوصیت پر روشنی ڈالیں۔

(۷) نو ترمیم اردو مڈل کورس میں نظم "نغمۂ توحید" صفحہ ۱۸۳ میں مندرجہ ذیل اشعار تشریح طلب ہیں۔

رنگ ہر پھول میں ہے حسنِ خود آرائی کا
چمنِ دہر ہے محضر تری یکتائی کا

محضر سے کیا مراد ہے؟ اردو کورس کے فرہنگ میں محضر کے معنی "جائے خطرہ" لکھا گیا ہے۔

اس نظم کا دوسرا اور چوتھا شعر بھی حل کیجئے۔

(البشیر احمد اردو ماسٹر مڈل سکول جیٹھ پور)

(۸) مندرجہ ذیل استفسارات کے جواب قریبی اشاعت میں درج فرما کر ممنون فرمائیں۔

(ا) (۱) سحر خورشید لرزاں بر سرِ کوئے تو می آید
دلِ آئینہ را نازم کہ بر روئے تو می آید

(۲) نیارد چشمِ بیدل تابِ حسنِ بے حجابش را
کہ باشد صافیٔ آئینہ شبنم آفتابش را

(نصاب اردو میٹرک صفحہ ۴۰)

(ب) جب علم کی ترقی ہوتی ہے تو آنکھ کی خوشی کان میں چلی جاتی ہے اور جب تنزل ہوتا ہے تو کان کی خوشی پھر آنکھ میں آجاتی ہے۔

(نصاب اردو صفحہ ۱۱۷)

(ج) گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت مثبت اور معمل ہونے کے زیادہ تر

منفی اور مانع ہے۔ (انصاب اردو صفحہ ۹۴)

(د) ع: ۔ "ناگاہ آئی ایک پری زاد سامنے"

پری زاد سے کیا مراد ہے؟ (محمد عبید اللہ ٹیچر انٹہ چھاوطنی)

(۹) مندرجہ ذیل الفاظ کے صحیح تلفظ سے واقفیت بخشئے۔

فرشتہ، عجب۔ بہشت، انتظار۔

آیا فَرِشتہ ہے یا فِرِشتہ؟ عَجَب ہے یا عُجُب؟ بَہِشت ہے یا بِہشت؟ اَنتظار ہے یا اِنتظار؟

(محمد حفیظ الرحمٰن سہوروی ہیلن بازار مونگیر)

جوابات

(۱) ہفتاد و دو طریق سے مراد محاورہ "ستره بہتره" کا نہیں بلکہ مذہبی خیالات کے بہتّر فرقے مراد ہیں۔

اور "ہفتاد و دو طریق"

پیغمبر اسلام علیہ اسلام کے اس ارشاد کی جانب تلمیح ہے۔

"میری امت بہتّر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اُن میں ایک راہ راست پر ہوگا اور باقی گمراہ" (او کما قال)

شاعر مذہبی قیود سے آزاد ہو کر کہتا ہے کہ میں تو "ہفتاد و دو ملت" سے علیحدہ ہوں۔ مذہبی فرقوں کا باہمی رشک و حسد اور منافست دیکھ کر، میں نے اِن جھگڑوں سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ حروف ابجد کے حساب سے حسد کے ۷۲ عدد ہوتے ہیں اور مذہب کی آڑ میں قتل و قتال اور حسد کا مظاہرہ کرنے والے بھی بہتّر ہی فرقوں میں منقسم ہیں۔ اور اپنا مشرب ہے صلح کل، ہم کسی سے بھی حسد نہیں کرتے۔ حسد کو پسند کرتے تو بہتّر فرقوں میں سے کسی ایک میں ہم بھی شامل ہوتے۔"

(۲) ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

شارحین اِس کے معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ "تیرا ملنا اگر آسان نہیں تو دشوار ہوگا۔ اور دشوار ہوگا، تو ہمارا تجھ سے ملنا سہل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہم بڑے سخت جان ہیں دشواریوں پر بھی آسانی سے غالب آجائیں گے۔ اور تجھ سے مل سکیں گے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ تیرا ملنا دشوار بھی نہیں، بلکہ محال ہے، اور امر محال پر انسان کو قدرت حاصل نہیں ہے اِس لئے تیری ملاقات سے ہم کلی طور پر مایوس ہو چکے ہیں"

مگر یہ معنی "تکلفات بعد الوقوع" کے مصداق ہیں۔ یعنی غالب نے یہ شعر کہتے وقت یہ مفہوم پیش نظر نہیں رکھا تھا۔ یہ شارحین کی نکتہ آفرینیاں ہیں غالب "عودِ ہندی" کے مندرجہ ایک خط میں اِس شعر کا مفہوم یہ بیان کرتا ہے کہ

"تیرا ملنا اگر آسان نہیں، بلکہ دشوار ہے تو ہم اِس دشواری کو پسند کرتے ہیں، کیونکہ دشوار ہے تو سب کے لئے دشوار ہوگا۔ اور تجھ سے ہماری طرح کوئی دوسرا بھی نہ مل سکے گا۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ تیرا ملنا دشوار بھی نہیں یعنی تو نے اذنِ عام دے رکھا ہے۔ ہر کس و ناکس تجھ سے مل سکتا ہے اور تیری یہ ہمہ آمیزی ہمارے جذبۂ رشک کے لئے موجب اشتعال ہے۔

مضمونِ رشک غالب کے کلام کی ایک خصوصیت ہے اُسے دیکھتے ہوئے غالب کے بیان کردہ معنی زیادہ قریب الفہم ہو جاتے ہیں۔

(۳) آپ نے مصرعۂ ثانی غلط نقل کیا ہے صحیح یہ ہے:۔

"نہ لپٹتیں یہ بلائیں تو جگر کے پار ہوتا"

~~آپ کے نقل کردہ~~ شعر کا مطلب یہ ہے کہ

اے صیادِ کماں دار! تیرا تیر کمان سے چھوٹ کر میرے دل میں پیوست ہو کر رہ گیا اور دل کو چیر کر آر پار نہ ہو گیا۔ اِس میں تیرے تیر کی کوئی خطا نہیں، اُس کی شدّت و حدّت بدستور ہے۔ صورت یہ ہوئی ہے کہ تیرے تیر کو دل میں چھپا لینے کی کچھ حسرتیں تھیں، جنھوں نے تیر کو دل کے پار نہیں ہونے دیا، اور اُسے لپٹ گئیں۔ یہ بلائیں نہ روک لیتیں تو وہ دل کو چیرتا ہوا پار نکل کر تیری مشقِ تیر افگنی کو قائم رکھتا۔

میرے دل کو یوں مٹایا الخ

اِس کا مطلب بھی عام فہم ہے کہ

اے دوست! تیرے جور و جفا یا میرے مصائبِ عشق نے دل کو اِس بُری طرح پامال کیا ہے کہ اُس کا نشان تک بھی مٹا دیا۔ اگر اُس مظلوم و مرحوم کا کہیں مزار ہی ہوتا تو میں اُس سے لپٹ کر رو تو لیا کرتا۔

الفاظ سے جو مطلب مترشح ہو رہا ہے وہ تو یہی ہے۔ اِس کے علاوہ اگر اور کوئی صوفیانہ نکتہ بھی اِس شعر میں مضمر ہے تو وہ صوفی لوگ بتا سکیں گے۔ مجھے تو دل کے مزار سے صاحبِ دل کے لپٹ کر رونے کا مفہوم غیر قدرتی اور غیر موثر معلوم ہوتا ہے۔

(۴) ہرج بھی صحیح ہے اور حرج بھی۔ ہاں معنی میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ہرج کے معنی نقصان کے ہیں اور حرج کے معنی تنگی کے۔ میری رائے میں ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو سکتا ہے۔

(۵) (ا) کور چشم محاورہ ہے اور "کور دماغ" کو استعارہ کے طور پر استعمال
کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

"کور ذوقاں داستانہا ساختند"

یہاں کور ذوق استعارہ ہی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یعنی بدذوق
کو کور ذوق کہا گیا ہے۔ اسی طرح کوڑھ مغز کو کور دماغ کہہ سکتے ہیں۔
مگر یہ ترکیب خوشگوار نہیں معلوم ہوتی۔

(ب) فکر کو غالب کی طرح ذوق نے بھی ایک جگہ مؤنث باندھا
ہے۔ بلکہ میرے بھی مؤنث ہی باندھا ہے۔

"کفن کی فکر ہیں" شعر اس وقت یاد نہیں۔ اور غالب تو دہلوی
بھی تھے اور اکبرآبادی بھی۔ ممکن ہے اکبرآباد میں فکر مؤنث ہی استعمال
ہوتا ہو۔ پھر بعض اوقات یہ بھی تو ہوتا ہے کہ ایک لفظ ایک ہی جگہ کسی
کسی عہد میں مؤنث اور اس کے بعد مذکر یا برعکس استعمال ہونے لگتا ہے
اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ غالب کے ذوقِ انتخاب نے فکر کی
تذکیر و تانیث میں دہلی سے اختلاف کیا ہو۔

(۶) اگتی ہے وہ جو زرگوں الخ

(الف) یعنی دنیا میں مذہبوں نے جھگڑے اٹھا رکھے ہیں۔ مذہب
کا نام لے لے کر اہلِ مذہب باہمی خونریزیاں کر رہے ہیں۔ اس لئے
آؤ آتشِ محبت میں ان مذہبی بکھیڑوں کو جلا کر خاکستر کر دیں اور مذہبی
تفرقے مٹا کر محبت کو اپنا نصب العین بنائیں۔

"زرگوں" - بمعنی بے رنگ

(ب) چنار کے درخت میں چونکہ فاسفورس زیادہ ہوتا ہے اس لئے
رات کے وقت وہ درخت ایک شعلہ زار کی صورت میں دور سے دکھائی
دیتا ہے۔ ناواقف اور توہم پرست لوگ رات کو جنگل میں چنار کی چمک
دمک دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ اور اسے بھوت پریت تصور کرتے ہیں
شاعر کہتا ہے کہ میرے دل کی آتشِ محبت مرنے کے بعد قبر میں بھی
بدستور سلگتی رہے گی اور قبر سے باہر اس صورت میں نمودار ہوگی کہ میری
قبر پر سبزہ کی بجائے چنار کا درخت اگیگا۔ جو رات کے وقت آتش فشاں
نظر آئے گا۔

شعر کا مفہوم معمولی اور فرسودہ ہے اب اس قسم کے اشعار پسند
نہیں کئے جاتے۔

(۷) "چمن دہر ہے مظہر تری یکتائی کا"

مطلب۔ اے باغبانِ حقیقی! پھول پھول اور پتے پتے میں
تیرے حسنِ خود آرا کا رنگ جھلکتا ہے۔ گلشنِ ہستی کا پتہ پتہ تری شانِ
یکتائی و یک رنگی کا مظہر ہے۔

اس شعر میں محضر غلط ہے اسکی جگہ مظہر پڑھنا چاہئے۔ اس کے
علاوہ فرہنگ نویس نے "محضر" کے معنے بھی غلط لکھے ہیں۔ محضر "جائے
خطرہ" کو نہیں کہتے بلکہ محضر میموریل کے معنی میں ہے۔ میموریل پر لوگوں
سے دستخط کرا کے کسی حاکم اعلیٰ سے اس کے ذریعہ کوئی مطالبہ پیش کیا
جاتا ہے۔ ـــ

"لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی"

اس نظم کا دوسرا اور چوتھا شعر بھیجئے تو حل کیا جائے دفتر میں کورس
موجود نہیں ہے۔

(۸) (ا) سحر خورشید لرزاں بر سر کوئے تو می آید
دلِ آئینہ را نازم کہ بر روئے تو می آید

یعنی۔ اے دوست! آفتاب جو خود ایک سرچشمۂ حسن و نور ہے۔
صبح کے وقت تیرے رعبِ حسن کے سبب تیرے کوچے کی طرف لرزتا
ہوا آتا ہے۔

میں آئینہ کے دل پر ناز کرتا ہوں کہ تیرے چہرے کے روبرو
کیسے ہو جاتا ہے۔

میں نے یہ مجلسِ علمیہ کے سامنے یہ شعر پیش کیا تھا، مذکورہ بالا تشریح
مجلسِ علمیہ کی بیان کردہ ہے۔ مگر مجھے مصرعۂ ثانی کے مفہوم کے متعلق
مجلسِ علمیہ سے اختلاف ہے۔

میرے نزدیک اس شعر کا مفہوم یہ ہے :-

آفتاب اپنی گردش پوری کرتا ہوا صبح کو جب تیرے کوچے کی طرف
آتا ہے تو تیرے حسن کے رعب سے اس پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔
میں اپنے آئینۂ دل پر ناز کرتا ہوں کہ وہ ہر وقت تیرے جلوۂ رخ
کے سامنے رہتا ہے۔ حالانکہ آفتاب کو تیرے چہرے پر نظر ڈالنے
کی تاب نہیں۔

دوسرے مصرعہ میں "دلِ آئینہ" کا ترجمہ مجلسِ علمیہ آئینہ کا دل کر کے
آئینے ہی کو رخِ دوست کا مدِ مقابل ٹھہراتی ہے۔ میں اس تشریح کو
نہیں مانتا، میرے خیال میں "نازم" کا لفظ اس بات کا قرینہ ہے کہ
شاعر دلِ آئینہ سے آئینۂ دل مراد لے رہا ہے کیونکہ اپنی ہی کسی چیز پر
کسی کو ناز و فخر کرنے کا حق ہوتا ہے۔ آئینے کے دل پر آئینے کو فخر کرنے

کا حق پہنچتا ہے۔ شاعر اُس پر حیرت کا اظہار کر سکتا تھا۔ اُس پر اُسے فخر و مباہات کرنے کے کوئی معنی نہیں۔

"دلِ آئینہ" میں ضرورتِ شعری کی بنا پر قلبِ اضافت کا قاعدہ برت کر اُسے آئینۂ دل سے دلِ آئینہ بنا لیا گیا ہے۔

۲۔ نیارد چشم بیدل تاب حسن بے حجابش را الخ

مطلب:-

بیدل کی آنکھ دوست کے حسن بے نقاب کے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی۔ اُس کے آفتابِ حُسن کے سامنے اس آئینے کی جِلا شبنم بن کر فنا ہو جاتی ہے۔

(ب) علم کی ترقی کے وقت آنکھ کی خوشی کان میں چلی جاتی ہے یعنی لطفِ مشاہدہ ذوقِ سماعت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جن اشیاء کو دیکھ کر آنکھیں لذت پذیر ہوتی ہیں علم کے عہدِ ارتقا میں اُن کی بابت حالات سننے سے لطف حاصل ہونے لگتا ہے۔ اور علم کے عہدِ تنزل میں چونکہ مشاہدہ محدود ہوتا ہے، اِس لئے کسی چیز کے متعلق حالات سننے کی نسبت اُسے دیکھنے سے زیادہ سرور حاصل ہوا کرتا ہے۔

(ج) گورنمنٹ کا فرض بہ نسبب مثبت و عمل ہونے کے زیادہ تر منفی اور "مانع ہے"

مطلب:-

گورنمنٹ کا فرض پبلک کو یہ بتانا نہیں ہے کہ فلاں فلاں کام کرنا قانون کے منشا کو پورا کرتا ہے بلکہ اُسے یہ بتانا چاہیئے کہ فلاں فلاں کام مت کرو۔ باقی ہر کام کر سکتے ہو۔

(د) "ناگاہ آئی ایک پریزاد سامنے"

یہ پریزاد کون تھی؟

یہ تو جب بتایا جا سکتا ہے کہ پوری نظم یا پوری عبارت لکھ کر آپ بھیجئے۔ نصاب اردو، قرآن مجید تو ہے نہیں کہ اُسے اِس خیال سے ہم حفظ کر رکھیں کہ ممکن ہے کوئی اس کے کسی حصے کے متعلق سوال پوچھ بیٹھے۔ آپ کے کئی سوالات ب اور ج۔ بھی اسی قسم کے ہیں۔ کتاب یا پورا مضمون سامنے ہو تو اُس کے کسی فقرے کی پیچیدگی پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

موجودہ صورت میں تو ہم نے چیستانیں ہی حل کی ہیں۔ ممکن ہے کہیں سیاق و سباق کے مطابق مطلب حل نہ کر سکے ہوں۔

(۹) اردو میں اِن الفاظ کا تلفظ یہ ہے۔ فرشتہ۔ عجب۔ بہشت

انتظار۔　　　　**تاجور**

دو مزید سوالات

(۱) نیو اکاڈمی یا مجلس جدید کس تحریک کا نام ہے؟

(۲) حکیم فلاطینس کس زمانہ میں گزرا ہے اور اس کے مختصر سوانح حیات کیا ہیں؟　　　　(محمد نذیر ملتان کالج)

جوابات

(۱) New Academy یا مجلس جدید یہ اُس فلسفیانہ تحریک کا نام ہے جو رواقیت اور ابیقوریت کے بعد ایتھنز پایۂ تخت یونان میں جاری ہوئی تھی۔ اِس کی بنیاد آرسیسلاس نے ڈالی تھی جو ۳۱۵ ق م میں پیدا ہوا تھا۔ یہ شخص علاوہ فیلسوف ہونے کے نہایت زبردست خطیب تھا اور افلاطون کے فلسفہ کا حامی، مگر بعض خیالات سے متفق نہ تھا اور فلسفہ کے بجائے جو ظنیات پر مبنی ہے، اخلاق کی درستی پر زور دیتا تھا۔

(۲) فلاطینس ۲۰۵ء میں بمقام Lycopolis واقع ملک مصر پیدا ہوا تھا۔ فطرت نے اس شخص کو اعلیٰ درجہ کی دماغی قوتوں سے سرفراز کیا تھا۔ کچھ عرصہ تک سکندریہ میں ایمونیئس کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ بعد ازاں "حکمت" کا شوق اس کو کشاں کشاں مشرقی ممالک کی طرف لے گیا۔ عرصہ تک تصوف، یوگ فلاسفی اور مجاہدہ باطنی میں مصروف رہا۔ مدتوں روم میں درس دیا، بالآخر ۲۷۰ء میں وفات پائی۔

اس کے شاگرد اُسے ولی اللہ سمجھتے تھے۔ مانلے (Manley) لکھتا ہے کہ جہانتک حالات دستیاب ہو سکتے ہیں اُن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکیزگیٔ سیرت اور روحانیت کے لحاظ سے فلاسفہ میں بہت کم نفوس ایسے گزرے ہیں جو فلاطینس کے ہم پلہ قرار دئے جا سکتے ہیں۔ فرفریوس لکھتا ہے کہ آخری الفاظ جو اس کی زبان سے نکلے یہ تھے "میں جزو کو کل کی طرف لوٹا رہا ہوں"

(τὸ ἐν ἡμῖν θεῖον ἀνάγειν πρὸς τὸ ἐν τῷ παντὶ θεῖον)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالص صوفیانہ خیالات رکھتا تھا۔ فلاطینس لکھتا ہے کہ تمام مظاہرِ قدرت چاند سورج وغیرہ انسان کے فائدہ کیلئے بنائے گئے ہیں یعنی سب انسان کے خادم ہیں نہ کہ مسجود چنانچہ کئی پجاریوں سے خطاب کر کے کہتا ہے۔ لازم ہے کہ [illegible] سے دیوتا خود میرے پاس آئیں نہ کہ میں اُن کے پاس جاؤں

ادارہ

اخبار علمیہ

کشتیٔ نوحؑ کی تلاش

بائبل میں "حال پیدائش" کے باب ششم کی آیات ۱۲ - ۱۹ میں طوفانِ نوحؑ کا ذکر ہے۔ اور اگر واقعی اہلِ دنیا کی تعزیر کے لئے خدائے قہار کا قہر و غضب ایک عالمگیر سیلاب کی صورت میں رونما ہوا۔ اور حضرت نوحؑ نے خدائی ہدایت کے مطابق ایک کشتی بنائی۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ کشتی یا اس کے آثار ابھی تک موجود نہ ہوں۔ کم از کم مسٹر ولیم سٹرونگ ماہرِ فنِ تعمیرات کا خیال ہے کہ یہ کشتی کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہے۔ اور اس کی تلاش کے لئے آپ نے شکاگو میں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی ایک مجلس مرتب کی ہے۔ جس کا پتہ پوسٹ بکس ۵۰۵ شکاگو ریاست ہائے متحدہ ہے۔

بائبل سے قطع نظر سائنسدان اس امر پر متفق ہیں کہ زمانۂ قبل تاریخ میں متعدد سیلاب آئے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ بائبل میں کس سیلاب کا ذکر ہے۔ بائبل کے بیان کے مطابق یہ طوفان ولادتِ مسیحؑ سے ۲۴۶۰ سال قبل اُٹھا۔ اور حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے میں ۱۲۰ برس لگے۔ یہ کشتی سرو کی قسم کی ایک لکڑی سے بنائی گئی تھی کیونکہ اس کے خوشبو روغن کی وجہ سے اس میں تباہ کن کیڑے پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ کشتی کے اندر اور باہر سیاہ روغن کی تہ جمائی گئی تھی۔ تاکہ اس میں پانی داخل نہ ہو سکے۔ مسٹر سٹرونگ کا بیان ہے، کہ بائبل کی روایت کے بموجب اس کشتی کو تعمیر ہوئے قریباً ۴۳۹۰ سال گذر چکے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ۱۹۲۸ء میں کیش (عراق) کے کھنڈرات میں شاہانِ کلدان کے ایک رتھ کے چوبی پہیے دستیاب ہوئے جو زمین میں ۴۵ فٹ کی گہرائی پر تحت الارض سطحِ آب سے صرف ایک فٹ اوپر پڑے تھے۔ یہ پہیے شکاگو کے عجائب خانہ میں رکھے گئے ہیں اور ابھی تک اچھی خاصی حالت میں ہیں۔ کشتیٔ نوحؑ ایک بلند پہاڑ پر بنائی گئی تھی۔ جہاں ہوا رقیق اور خشک ہوتی ہے۔ اگر یہ کشتی انسانی ہاتھ یا قدرتی حوادث سے تباہ نہیں ہوئی۔ تو توقع امید ہے کہ تلاش کرنے پر دستیاب ہو سکیگی۔ بائبل کے بیان کے مطابق اس کا طول ۳۰۰ مکعب عرض ۵۰ مکعب اور بلندی ۳۰ مکعب ہے۔ مکعب کا پیمانہ مختلف ہے۔ ایرانی مکعب ۲۰.۶۷ انچ کے قریب ہے۔ اس کے مطابق کشتی نوحؑ کی لمبائی ۵۱۷ فٹ ہوئی۔

مسٹر اسحاق نیوٹن نے اپنی کتاب "یہودیوں کے مقدس مکعب" میں لکھا ہے۔ کہ کشتیٔ نوحؑ میں جو مکعب مدِ نظر رکھا گیا وہ ۲۵.۱ انچ لمبا تھا۔ اس حساب سے کشتی کی لمبائی ۶۲۵ فٹ چوڑائی ۱۰۴ فٹ اور بلندی ۶۲½ فٹ ہوتی ہے۔ اور اس میں ایک لاکھ ٹن وزن سما سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر باربرداری کے نقطۂ خیال سے بیسویں صدی کے دخانی اور برقی جہاز بھی کشتیٔ نوح کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دنیا کا سب سے بڑا جہاز "لیوی ایتھن" ۹۶۵ فٹ لمبا ہے اور اس میں صرف ۵۹۹۷۰ ٹن وزن کی گنجائش ہے۔ مسٹر سٹرونگ اپنے اعلان میں لکھتے ہیں:-

"اگر کشتیٔ نوحؑ ایسی عظیم شے دس ہزار فٹ کی بلندی پر ایک دفعہ مل جائے تو اس سے سائنس کے مسئلہ ارتقا کی دھجیاں اُڑ جائینگی اور اس سے مذہبی اعتقاد کو بے حد تقویت پہنچیگی"

انیسویں صدی میں ہالینڈ کے ایک انجنیئر نے کشتیٔ نوحؑ کے پیمانہ پر ایک جہاز بنانا شروع کیا۔ احباب نے اس کا مضحکہ اُڑایا لیکن جب جہاز مکمل ہوا تو انہیں پتہ چلا کہ یہ جہاز مروجہ پیمانہ کے مطابق بنائے ہوئے جہازوں کے مقابلہ میں ۲۰ فیصدی زیادہ اسباب اٹھا سکتا ہے۔ اور اس کی رفتار دس فی صدی زیادہ ہے۔ جناب نوحؑ حضرت آدمؑ کی دسویں پشت میں تھے۔ اس زمانہ میں پیتل اور لوہے سے کام لیا جاتا تھا۔ یہ سوال ابھی تک حل طلب ہے۔ کہ جناب نوحؑ نے اپنی کشتی میں پیتل یا لوہا استعمال کیا تھا۔ یا نہیں۔

مسٹر سٹرونگ اپنے اعلان میں اس دعوے کی تردید کرتے ہیں کہ کشتیٔ نوح میں حیوانات کی غیر محدود تعداد سوار تھی۔ اس زمانہ میں حیوانوں اور پرندوں کی اقسام ۶ سو سے کم تھیں۔ اس میں آٹھ انسان تھے۔ حیوانات کی کل تعداد ۳ سو سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ ۱۵۰ اقسام کے پرندے تھے۔ اگر ان کے سات سات جوڑے شمار کئے جائیں تو ان کی تعداد ۲۱۰۰ بنتی ہے۔ انسانوں حیوانوں اور پرندوں کی مجموعی تعداد جو کشتی میں سوار ہوئی ۲۴۹۴ سے زیادہ نہ تھی۔ لہذا

رینگنے والی مخلوق" کے لئے کافی گنجائش تھی۔ ۴۰ روز تک رات دن بارش ہوتی رہی کشتی ۵ ماہ تک تیرتی رہی۔ بارش شروع ہونے کے دس ماہ اور بارہ دن بعد کشتی کی چھت اُتار لی گئی۔ اور بارہ ماہ پورے اور دن بعد حضرت نوحؑ اور دوسرے جانور کشتی سے اُترے۔

ابھی تک کشتئ نوح کی تلاش کیوں نہیں کی گئی۔ اس کے متعلق آپ لکھتے ہیں کہ اس کے لئے کوہ ارارات کے دشوار گزار علاقوں میں گزرنا پڑتا ہے ۵۰ھ میں جوزیفس نے "یہودیوں کے آثار قدیمہ" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں وہ بیان کرتا ہے کہ اس زمانہ میں عام لوگوں کو کشتئ نوحؑ کی موجودگی کے متعلق کامل یقین تھا بلکہ بہت سے ارمنوں کے پاس ایسے تعویذ تھے جو کشتئ نوح کے روغن سے بنائے گئے تھے۔ انسائیکلوپیڈیا کی نویں ایڈیشن جو ۱۸۷۸ء میں طبع ہوئی ناقل ہے کہ ۱۸۷۶ء میں آرمینیا میں ایک خانقاہ اور ایک مسجد کوہ ارارات کے اس مقام پر تعمیر کی گئی۔ جہاں بیان کیا جاتا ہے کہ نوحؑ کی کشتی خشکی پر ٹھہری تھی۔ اور اس خانقاہ میں اس کشتی کے مآثر موجود تھے۔ سال مذکور میں اس خانقاہ پر بجلی گری اور وہ بالکل تباہ ہو گئی۔ مسٹر سٹرونگ ان روایات کو پایۂ تحقیق تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ ان کی تحقیقات کا کیا نتیجہ نکلیگا۔ بہر حال ان کی اولوالعزمی قابل تعریف جدت کا پہلو رکھتی ہے۔

آئندہ جنگ کی ہولناک تیاریاں

گزشتہ محاربۂ عظیم میں مہلک گیسوں کا استعمال بکثرت ہوا تھا۔ گو جمعیت اقوام نے اس کے بعد لڑائی میں گیسوں کا استعمال ممنوع قرار دیا لیکن اس بات کی بہت کم امید پائی جاتی ہے کہ اس امتناع کا کوئی خاص اثر ہوگا۔ امریکن کیمیکل فاؤنڈیشن کے پریسیڈنٹ کا بیان ہے کہ اب دول عالم کو کسی لشکر جرار کے مصارف برداشت کرنے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ بلکہ آئندہ جنگوں میں وہی قومیں مظفر و منصور رہیں گی۔ جن کے پاس اعلیٰ دماغ ہیں۔ آجکل ایک نئی تحریک یہ شروع ہوئی ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ کو اب کیمیاوی بنا دیا جائے۔

جنگ عالمگیر کے اختتام تک صرف تیس قسم کی سمی گیسیں دنیا کو معلوم ہو سکی تھیں لیکن سال رواں تک تقریباً ایک ہزار گیسیں دریافت ہو چکی ہیں۔ اس وقت ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کسی آئندہ جنگ کے لئے بڑے پیمانہ پر تیاریاں ہو رہی ہیں۔ دنیا میں اسوقت کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جس کے اسلحہ خانہ میں گیسوں کے کنستر اور مہلک زہریلے مادے تیار کرنے کے نسخے سربمہر موجود نہ ہوں۔ غرض ہر ملک میں کیمیاوی اجزاء سے نہایت خطرناک چیزیں تیار ہو رہی ہیں۔

اور پھر لطف یہ کہ ہر مہلک چیز کا توڑ بھی ہر جگہ زیر غور ہے۔ آتشگیر مادوں سے محفوظ رہنے کے لئے بھی "پروف" ایجاد ہو چکے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں برطانیہ کے سب سے بڑے ٹینک کا وزن دس ٹن تھا۔ لیکن برطانیہ نے حال میں جو ٹینک تیار کیا ہے اس کا وزن بیس ٹن ہے اور اس پر متحرک بندوقیں بھی لگی ہیں۔ فرانس کے قبضہ میں ۱۹۳۰ء میں تین ہزار جنگی "ٹینک" تھے۔ امریکہ نے جو جدید ترین ٹینک تیار کیا ہے وہ پینتالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل کر ہلاکت باری کرتی ہے۔

ان چیزوں سے قطع نظر آئندہ ہوائی جہازوں سے بھی زیادہ تر ہلاکت باری ہی کا کام لیا جائے گا یہاں تک کوشش ہو رہی ہے کہ اس قسم کے طیارے تیار کئے جائیں جن میں انسانی ہاتھ کو استعمال نہ کرنا پڑے چنانچہ لاسلکی کے ذریعہ سے ایسے ہوائی جہاز عرصہ تک فضا میں پرائے گئے۔ جن میں ہوا باز کوئی نہ تھا بلکہ طیاروں کی تمام نقل و حرکت تاروں کے ذریعہ سے ہو رہی تھی۔ آئندہ ہوائی جہازوں میں انسان قائد نہ ہونگے بلکہ وہ بغیر کسی انسانی قیادت کے از خود بڑے بڑے شہروں اور تجارتی مرکزوں پر اُڑ کر فاسفورس کے آتشیں بم اور دوسرا مہلک سامان گرا کر دنیا کے آرام و آسائش اور انسانیت کی راحتوں کو تباہ کریں گے۔

مخالف و محافظ جراثیم

حال میں بعض ڈاکٹروں نے دریافت کیا ہے کہ کائنات عالم مختلف النوع جراثیم سے معمور ہے اور دنیا کے تین چار ہزار امراض میں سے بہت سے امراض کے لئے علی العموم جراثیم ہی ذمہ دار ہیں۔ یہ جراثیم بالکل غیر مرئی ہیں۔ جب یہ کسی طرح جسم کے اندر داخل ہوتے ہیں تو پھر بڑی سرعت کے ساتھ بڑھنے لگتے ہیں لیکن خالق کائنات کی قدرت بے پایاں نے خود انسان کے وجود میں بھی خون کے اندر ایسے جراثیم پیدا کر رکھے ہیں جو ان بیرونی جراثیم کی مدافعت کر کے انسان کو ان ہلاکت بار حملہ آوروں سے بچاتے ہیں۔ جب بیرونی اعداء جسم انسانی پر تاخت کرتے ہیں تو اندرونی محافظوں سے ان کی کشمکش شروع ہوتی ہے۔ اگر بیرونی ترکتازوں کا حملہ ناقابل مدافعت ہو تو انسان جلد بستر علالت پر جا پڑتا ہے جب محافظ جرم مغلوب و مقہور ثابت ہوتے ہیں تو خدا کی قدرت قاہرہ انسانی حفاظت کیلئے ایک دوسرا

جاپانی زبان کی چند دلچسپ خصوصیات

ہندوستان میں خواص سے قطع نظر عوام میں مشرقِ بعید کی معاشرت و تمدن سے قطعاً لاعلمی پائی جاتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جس قدر ایک چیز نئی ہوتی ہے، اُسی قدر اُس میں دلچسپی اور جاذبیت زیادہ ہوتی ہے۔ مشرقِ بعید کے حالات نہ صرف اس لحاظ سے نئے ہیں کہ اب تک ان کے متعلق اہلِ ملک کو بہت کم معلومات حاصل ہوتے ہیں بلکہ اس لحاظ سے بھی جدید ہیں کہ ان ممالک کی تہذیب و معاشرت اُن تمام ممالک کی تہذیب و معاشرت سے جن سے ہم کسی حد تک متعارف ہو چکے ہیں بالکل جُدا ہے۔ اور یہ کہ ایک قطعی مختلف ماحول میں اس تہذیب کی پرورش ہوئی ہے۔

جاپانی زبان کے متعلق چند مہمل خیالات مشہور عوام ہیں مثلاً چینی اور جاپانی زبانیں بہت کچھ مماثل ہیں۔ دونوں زبانوں میں حروف مشترک ہیں۔ ان مشترک حروف کی تعداد ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ جن کا محفوظ رکھنا سخت دشوار ہے۔ اور یہ کہ بہت کم لوگ تمام حروف سے واقف ہیں۔ حالانکہ ان بیانات میں حقیقت کا بہت کم عنصر داخل ہے۔

سب سے پہلے میں چینی اور جاپانی زبانوں کی مماثلت کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے اسی قدر مختلف ہیں جس درجہ ترکی سے تامل۔ ایک فاضل نے جس کو دونوں زبانوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چینی زبان کے جملہ الفاظ ایک جزو صوتی (syllable) سے بنے ہیں۔ مگر جاپانی زبان کے الفاظ ایک سے زیادہ اصوات سے مرکب ہوتے ہیں چینی زبان۔ مختصر، برجستہ اور سلیس ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے جاپانی زبان کی خصوصیات۔ شیرینی۔ ملائمیت اور تکلف ہیں اور اس کا ذخیرہ وسیع المفہوم محاورات سے پُر ہے۔ چینی زبان کے الفاظ نہایت ثقیل ہیں۔ اور ان کا ادا کرنا سخت دشوار ہے۔ کیونکہ عربی کی طرح اس کے اصوات نہایت پیچیدہ مخارج سے ادا ہوتے ہیں۔ درانحالیکہ جاپانی زبان کے تمام اصوات مفرد اور سہل المخارج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں قدرتی موسیقیت اور لوچ پایا جاتا ہے۔ چینی زبان میں صرف و نحو کی تبدیلیاں نہیں ہوتیں۔ اس کے اسماء واحد و جمع جنس اور حالت کی خصوصیات سے معرا ہیں۔ اور اس کے افعال اشتقاق کی علت سے مبرا۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ اسماء اور افعال کے درمیان بھی کوئی امتیازی حد فاصل نہیں۔ محض موقع و محل کے لحاظ سے جملہ میں معنی پیدا کئے جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے جاپانی زبان ایک پیچیدہ اور جامع صرف و نحو کی مالک ہے۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصولاً یہ دونوں زبانیں ایک دوسری سے مختلف ہیں لیکن موجودہ زمانے میں چینی الفاظ اور محاورات جاپانی زبان میں بکثرت مخلوط ہو گئے ہیں۔ اور یہ الفاظ بالعموم اُس زمانے کی یادگار ہیں۔ جبکہ چینی تہذیب و تمدن کا گہرا اثر جاپان پر پڑ رہا تھا۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں جبکہ یورپین تہذیب کا دور دورہ ہے مختلف یورپین زبانوں اور بالخصوص انگریزی زبان کے بے شمار الفاظ اور علمی اصطلاحات اپنا رنگ اور صورت بدل کر جاپانی زبان کی محفل میں جانشین ہیں۔

باوجودیکہ چینی الفاظ کثرت سے جاپانی زبان میں شامل ہو گئے ہیں مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اب بھی دونوں زبانوں میں کچھ مماثلت پیدا ہو گئی ہے۔ یا بغیر اکتساب و تحصیل چینیوں کے لئے جاپانی اور جاپانیوں کے لئے چینی زبان کا سمجھنا یا بولنا آسان ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے اردو میں عربی کے الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ مگر بغیر سیکھے ہوئے اردو بولنے والوں کی سمجھ میں عربی زبان نہیں آسکتی اور نہ عرب اردو سمجھ سکتے ہیں۔

جاپان میں ابتداءً تحریر چین ہی سے آئی اس لئے اولاً چینی تحریر کا کچھ حال لکھنا مناسب ہوگا۔ جیسا پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ چینی زبان کی خصوصیات اختصار اور برجستگی ہیں۔ اس لئے اس زبان میں اکثر ایک مفہوم کو ادا کرنے کے لئے صرف ایک ہی لفظ اور اُس کے لئے ایک ہی تحریری نشان ہے۔

بظاہر یہ امر نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے کیونکہ دنیا کی تمام دوسری

معروف زبانوں میں سے کسی میں بھی یہ بات نہیں پائی جاتی۔ مثلاً عربی میں ایک ایک مفہوم کے لئے متعدد الفاظ ہیں اور ہر ایک کے لئے علیحدہ تحریری علامتیں موجود ہیں۔ اسد وضیغم عربی میں مترادف ہیں، مے اور بادہ فارسی میں ہم معنی ہیں مگر ان کے لئے تحریری علامات یعنی حروف جداگانہ ہیں۔

اس مشکل کا حل یوں ہے کہ چینی زبان میں حروف تہجی موجود نہیں (بوالعجبی دیکھو کہ ہمارے ملک میں لوگ سمجھتے ہیں کہ چینی میں ہزاروں حروف ہیں حالانکہ ایک حرف بھی نہیں) بلکہ مصری و کلدانی قدیم زبانوں کی طرح ہر مفہوم کی ایک تصویر کھینچی جاتی ہے۔ انسان نے تحریر کی ابتدا یوں ہی کی تھی۔ دوسری زبانوں نے رفتہ رفتہ ان ہی تصاویر سے حروف تہجی تیار کر لئے۔ مگر چین نے اسی قدیم طریقے پر قائم رہ کر اس کو درجۂ کمال تک پہنچایا۔ مولانا آزاد مرحوم نے سخندان پارس میں عربی حروف ہجا کی ارتقائی منازل دکھاتے ہوئے چند لطیف اشارات قلمبند کئے ہیں۔ جن کا اعادہ اس موقعہ پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(۱) سر کنڈے کی تصویر ہے کہ سیدھا کھڑا ہے۔
(ب) باب یعنی گھر کی تصویر ہے گھر والا سامنے بیٹھا ہے۔ (نقطہ)
(ج) جمل (اونٹ) کی تصویر ہے۔ اونٹ والا سامنے بیٹھا ہے۔
(ش) شجر یعنی پیڑ کی تصویر ہے اور اوپر تین چڑیاں اُڑتی ہیں۔

مرئی اشیا کی تصویر کھینچنا نسبتاً آسان ہے۔ لیکن یہ بھی اگر مکمل تصاویر ہوں تو ان کا بنانا ہر شخص کے لئے دشوار ہو جائے اور ایک ایک چیز کے لئے بہت کافی وقت صرف ہو۔ اس لئے علمائے لسان نے ان تصاویر کو اسقدر مختصر اور سادہ کر دیا کہ ان کا بنانا آسان ہو گیا۔ غیر مرئی اشیا جن کا ہم صرف خیال کر سکتے ہیں۔ اُن کی کوئی شکل یا جسم نہیں ہے ان کی تصویر بنانا ناممکن تھا۔ مگر ماہرین لسان نے اس کو اس طرح حل کیا کہ ان کے لئے بھی علیحدہ علیحدہ علامتیں بنالیں۔ اور جوں جوں نئے خیالات پیدا ہوتے رہے۔ اُن کو ظاہر کرنے کے لئے تحریری علامات بھی تیار ہوتی رہیں۔ اور اب بھی یہ عمل جاری ہے۔

ہمارے حروف ہجا بھی مقررہ نشانات ہیں اور یہ بھی غیر مرئی شے یعنی اصوات کی تصاویر ہیں۔ جن کو جمہور نے مقرر کر لیا ہے۔ شاید اس سے خیال ہو کہ بس چینی زبان کے نشانات تحریری بھی ہماری زبان کی طرح حروف ہیں۔ فرق محض تعداد کا رہ جاتا ہے مگر نہیں ہمارے حروف بذاتِ خود بے معنی ہیں۔ اور الفاظ جب ان مفردات سے ترکیب پاتے ہیں تو اس وقت ایک مفہوم کو پیش کر سکتے ہیں۔ چینی زبان میں ہر نشان ایک مکمل مفہوم پیش کرتا ہے۔ اور اس نشان کی تحلیل نہیں ہو سکتی۔

اب میں مثالوں سے اس امر کی مزید وضاحت کرتا ہوں۔ چینی زبان کی طرح ہماری زبان میں بھی چند خیالی تصاویر (ideograph) موجود ہیں۔ جو اپنا مفہوم پورا ادا کر سکتی ہیں مگر اُن کی تحلیل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ریاضی کی علامات کو لیجئے:-

(+) جمع (−) نفی (×) ضرب (÷) تقسیم (=) مساوی ہے (≡) متوازی ہے۔ (△) مثلث۔

(۱) ایک (۲) دو (۳) تین (۴) چار وغیرہ وغیرہ تمام اسی قبیل سے ہیں۔ جب ہم ان علامتوں کو دیکھتے ہیں فوراً ان کا مفہوم ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کی تحلیل نہیں ہو سکتی۔ (÷) اس علامت میں علیحدہ علیحدہ دونوں نقطے اور تیسری لکیر کچھ نہیں ظاہر کرتے۔ برخلاف اس کے اگر لفظ تقسیم کی تحلیل کریں تو اس کے اجزا ت ق س ی م ہونگے جو علیحدہ علیحدہ مفرد اصوات کے مقررہ نشان ہیں۔ ہر نشان ایک بے معنی آواز کو ظاہر کرتا ہے۔ اور کل مرکب ایک مفہوم کو۔

چینی علماء نے ان علامتوں کے بنانے میں بھی کچھ نہ کچھ ترتیب و تنظیم سے کام لیا ہے۔ جس سے ان کے سیکھنے اور یاد رکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثلاً 木 پیڑ کو ظاہر کرتا ہے 木木 جنگل کو اور 木木木 بڑے جنگل کو جس طرح علامت ÷ تقسیم بانٹ (divide) یا دیگر مترادفات کو ظاہر کر سکتا ہے۔ اسی طرح ہر چینی علامت سے ہم نہ صرف اُس کا چینی تلفظ مراد لے سکتے ہیں بلکہ اگر چاہیں تو اس مفہوم کے مترادف کسی غیر زبان کا لفظ بھی بآسانی اُس سے پڑھ سکتے ہیں۔ چنانچہ جاپانیوں نے اپنی زبان کی تحریر کے لئے یہی چینی علامات اختیار کر لیں۔ یہ نہایت آسان بات تھی کیونکہ چینی ایک علامت کو اپنی زبان میں کچھ ہی پڑھیں جاپانی اُسی علامت سے اُس کے چینی مفہوم کا جاپانی مترادف مراد لیں گے۔ گویا جس طرح 木 یہ علامت بنا کر ہم اس کو درخت پڑھیں۔ مگر جاپانی زبان میں چینی الفاظ مع اپنے اصلی تلفظ کے بھی بکثرت شامل ہو گئے ہیں اور اپنی تحریری علامت اپنے ساتھ لائے ہیں۔ لہذا اکثر ان تحریری علامات کے دو یا دو سے زیادہ تلفظ ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک چینی ہوتا ہے اور باقی جاپانی۔ تلفظ خواہ کتنے ہی ہوں جبتک معنی ایک ہے علامت بھی ایک ہی رہیگی مثلاً

آدمی کے لئے جاپانی لفظ ہیتو ہے اور چینی لفظ جِن ہے مگر تحریری علامت دونوں کے لئے یکساں ہے 人 اسی طرح "بڑے" کے لئے چینی لفظ دائی اور جاپانی اوکی ہے مگر علامت دونوں کے لئے 大 یوں ہے۔

جاپانی اور چینی تلفظ میں امتیاز اس طرح ہوتا ہے کہ جب ایک علامت مفرد ہوتی ہے تو اکثر اس کا تلفظ جاپانی ہوتا ہے اور جب مرکب ہوتا ہے تو چینی۔ مثلاً جب 人 یہ علامت مفرد آتی ہے تو ہیتو پڑھی جاتی ہے۔ مگر ایک لفظ ہے "جن کرِشا" (جن) کے معنی آدمی۔ (رِک) کے معنی طاقت شا کے معنی گاڑی کُل مرکب کے معنی آدمی کی طاقت سے چلنے والی گاڑی اس مرکب میں جن کے لئے وہی علامت 人 لکھی جائیگی مگر چونکہ مرکب لفظ ہے۔ اس کو ہیتو رکشا نہیں پڑھیں گے۔ جن رکشا کہیں گے۔

چونکہ چینی زبان میں اشتقاق ہوتا ہی نہیں اس لئے علامات اشتقاق بھی نہیں ہیں۔ برخلاف اس کے جاپانی زبان میں اشتقاق ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت پیش آئی کہ علامات اشتقاق کے لئے کوئی ذریعہ اظہار ہو اور چونکہ علامات اشتقاق بذاتِ خود بے معنی آوازیں ہوتی ہیں۔ اِس لئے اس کو علامت صوتی ہی سے ظاہر کر سکتے ہیں بس حروف ہجا کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ اس غرض کے لئے چینی زبان کی علامات ہی میں ترمیم و تنسیخ کر کے تہتر حروف تیار ہو گئے اور ہر حرف کو دو مختلف قسم کی علامتوں سے ظاہر کرنے لگے۔ ان میں سے ایک گویا خط نستعلیق ہے اور دوسرا خط شکست۔

خط نستعلیق کو کتا کانا، اور خط شکست کو ہیرا کانا، کہتے ہیں۔ اور چینی علامات تحریری (ideographs) کو کانجی کہتے ہیں۔ غیر ملکی ناموں اور تاربرقی کے لئے تمام تحریر ہمیشہ کتا کانا میں لکھی جاتی ہے۔ باقی تحریرات کانجی اور ہیرا کانا میں۔ کتا کانا یا ہیرا کانا میں کل تہتر علامات ہیں۔ یہ علامات دراصل حروف مفردہ کو ظاہر نہیں کرتیں بلکہ جس طرح سنسکرت میں क "کا" ایک حرف ثابت اور اسکے ساتھ ایک حرکت کو ظاہر کرتا ہے اسیطرح جاپانی کانا میں بھی کل چودہ حروف کی آوازوں میں سے ہر ایک کے ساتھ پانچ پانچ حرکتیں آ۔ اِی۔ اُو (جیسے تُو میں)۔ اے اور اَو (جیسے دو میں) شامل کر کے ہر ایک کیلئے علیحدہ علیحدہ علامتیں بنائی گئی ہیں۔ اِس طرح یہ کل ستر علامتیں ہوئیں۔ پانچ علامتیں بالکل علیحدہ مذکورہ بالا پانچ حروف علت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور ایک علامت نون غنہ کی۔ ان چھ علامتوں کو ملا کر چھتر علامتیں ہوتی ہیں۔ مگر اِن میں سے تین علامتیں دو دفعہ دہرائی گئی ہیں اِس لئے اُن کو خارج کر کے تہتر علامتیں رہ جاتی ہیں۔ چودہ حروف ثابت یہ ہیں۔ ک گ س ز ت د ن ہ۔ ب پ م ی ر و۔ ان میں سے بھی گ ز د ب پ اصلی نہیں ہیں۔ بلکہ ک پر " تنوین کی سی علامت بنانے سے گ ہو جاتا ہے۔ اور اسی قسم کے نشان سے س ز بن جاتا ہے۔ ت د میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور ہ ب میں بدل جاتا ہے۔ اور ہ پر ° ایسا نقطہ لگانے سے پ بن جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ جاپانی زبان میں بجز نون غنہ کے اور کوئی ساکن حرف نہیں ہے۔ اس سے دو نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اولاً یہ کہ جاپانی ساکن حرف کا تصور نہیں کر سکتے۔ اگر کسی ہندوستانی سے کہا جائے کہ "پا جامۃ" کو اُلٹا پڑھو تو وہ "ہماجاپ" پڑھیگا۔ لیکن اگر یہی درخواست ایک جاپانی سے کی جائے تو وہ "مے جاپا کہیگا۔ کیونکہ اپنی زبان میں وہ اس لفظ کی انتہائی تحلیل پا۔ جا۔ مے کر سکتا ہے۔ حالانکہ ہم اس لفظ کی تحلیل پ ا ج ا م ے کرتے ہیں۔ چنانچہ غیر ملکی زبان کے الفاظ بولتے ہوئے بھی یہ لوگ ساکن حروف کو متحرک کر دیتے ہیں۔

دوسرا نتیجہ اس کا یہ ہے کہ دوسری زبانوں میں جو سکون کے باعث جھٹکے سے لگتے ہیں۔ وہ بات جاپانی میں نہیں ہے۔ جب جاپانی بولی جاتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی دھار ہے جو مسلسل بہتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ زبان میں ایک قسم کی موسیقیت پیدا کر دیتی ہے۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ غیر ملکیوں کے لئے بھی اس زبان کو ادا کرنا شاید دنیا کی تمام زبانوں سے زیادہ آسان ہے۔

جاپانی زبان کے ثابت اصوات کو دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اردو کے مخلوط حروف بھ پھ تھ وغیرہ۔ اور ثقیل حروف ٹ ڈ ڑ اور ل موجود نہیں ہیں۔ باقی تمام اصوات ہیں۔

جاپانی زبان کی تحریر کے متعلق آخری مگر سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ سطر میں الفاظ اوپر سے نیچے کی طرف لکھے جاتے ہیں۔ اور ہر صفحہ پر سطریں داہنی طرف سے شروع کر کے بائیں جانب ختم ہوتی ہیں۔ اور ہر کتاب میں صفحات داہنی طرف سے شروع ہو کر بائیں طرف کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

آخر میں تحریر کے علاوہ چند اور خصوصیات اس زبان کی دکھانا چاہتا ہوں۔

(۱) جملہ میں ترتیب الفاظ بالکل وہی ہے جو اردو میں ہے۔ یعنی اوّل فاعل اور اُس کے متعلقات پھر مفعول اور دیگر متعلقات فعل اور سب سے آخر میں فعل۔

(۲) جاپانی زبان میں حالت فاعلی ۔ مفعولی ۔ اضافی وغیرہ کو ظاہر کرنے کے لئے جو علامات مقرر ہیں وہ اسی طرح اسم کے بعد آتی ہیں جیسے اردو میں۔

(۳) اردو ہی کی طرح جاپانی زبان میں بھی مجرور کے بعد حرف جار آتا ہے۔

(۴) اردو میں بھی ضمیر کا استعمال کم ہوتا ہے ۔ بالخصوص حالت فاعلی میں ۔ یہی کیفیت جاپانی زبان میں ہے۔

(۵) اردو میں اکثر اسمائے ذات اسم ضمیر کا کام دیتے ہیں مثلاً اعلحضرت آنجناب ۔ آنعزیز ۔ احقر ۔ فدوی ۔ مابدولت وغیرہ ۔ جاپانی زبان میں درحقیقت تمام ضمیر اسی قسم کے ہیں۔

(۶) جاپانی زبان میں صفت کو اسم سے کوئی علاقہ نہیں ۔ وہ فعل کی ایک قسم ہے اور فعل ہی کی طرح تمام صیغوں میں مشتق ہوتا ہے۔

(۷) سب سے آخری مگر سب سے زیادہ اہم خصوصیت یہ ہے کہ باوجود زندگی کے ہر شعبہ میں مغربی تہذیب کا اثر نمایاں ہونے کے ہنوز اسالیب بیان کمال آب و تاب کے ساتھ خاص مشرقی ہیں۔

محمد بدرالاسلام فضلی ۔ از ٹوکیو (جاپان)

جنونی گیت

ربابِ دل کے تاروں کو چھُوا مضرابِ وحشت نے
کیا احساس کو زیر و زبر سیلابِ وحشت نے

رگ و ریشہ میں دوڑیں مضطرب سیماب کی لہریں
لہُو کی گرم موجیں بن گئیں زہرآب کی لہریں

ہوئی آتش فگن دیوانگی دل کے نشیمن میں
جنوں کی مشعلیں روشن ہوئیں آنکھوں کے روزن میں

ستاروں کی عظیم الشان وادی جگمگاتی ہے
کہ ہو کر ریزہ ریزہ برقِ مضطر تلملاتی ہے

ستارے ناچتے ہیں اور سازِ ماہ بجتا ہے
وہ موسیقی ہے جس میں موت کا بادل گرجتا ہے

مرے اللہ شعلے کیوں نکلتے ہیں نواؤں سے
جنُوں کی بجلیاں گرتی ہیں دیوانی صداؤں سے

یہ زخمی سانپ کی مانند بل کھاتے ہوئے نغمے
یہ لہراتے ہوئے نغمے یہ تھراتے ہوئے نغمے

یہ نغمے آگ بن کر کیوں مری رگ رگ میں بستے ہیں
یہ نغمے میرے احساسات کی رُوحوں کو ڈستے ہیں

ہوا جاتا ہوں یکسر مشتعل سوزِ فراواں سے
ابھی نکلے گا نغمہ موت کا تارِ رگِ جاں سے

عدم

سوا لاکھ کے سیاہ موتی

ادریس ایک باکمال مصور تھا۔ لیکن اس کے کمال کی قدردانی نے ابھی دولت واقبال کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ دنیا رفتہ رفتہ اس کے ہنر سے آشنا ہو رہی تھی اور ادریس بہت ہی آہستہ آہستہ ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر صاحبِ کمال کی طبیعت میں ایک خاص طرح کا مدوجزر ہوتا ہے۔ کفایت شعار ادریس پر بھی ایک روز مجرمانہ فضول خرچی کا شوق طاری ہو گیا تھا اور اسی ہنگامی جوش میں اس نے دہلی کے ایک قدیم عجائب فروش سے بڑی قیمت دیکر ایک کرسی خریدی تھی۔ آبنوس اور مخمل کی اس پرانی کرسی کے ساتھ روایت یہ تھی کہ جہانگیر نے اسے اپنی محبوب ملکہ نورجہاں کے لیے چین کے ایک سیاح تاجر سے خریدا تھا۔ ایسے نوادر اب بھی دہلی میں دستیاب ہوتے ہیں لیکن ان کی صحیح عمر اور تاریخ کا پتہ لگانا بڑے اہلِ نظر کا کام ہے

اس کرسی کے دونوں بازوؤں پر شیر دہاں بنے ہوئے تھے اور اس کی پشت پر خوبصورت نقش ونگار کے درمیان جہانگیر اور نورجہاں کے نام تراشے ہوئے چینی حروف میں ہاتھی دانت کی ایک چھوٹی سی تختی پر جڑ دیئے گئے تھے۔ نشست کے گدے کا عنابی مخمل اپنی قدامت کے باعث نہ صرف مائل بہ سیاہی ہو گیا تھا بلکہ بعض جگہ سے پھٹ بھی گیا تھا۔ ادریس نے اپنے گھر لانے کے بعد اس کرسی کا نام "نورجہانی" کرسی رکھ دیا تھا۔

مصور اور شاعر کے لیے حسن کا صحیح تخیل لازمی ہوتا ہے اور اگر حسن کی پہچان عشق کی آنکھوں سے ہوا کرتی ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصور ادریس عاشق ادریس بھی تھا۔ اس کی حسین، نوجوان اور ماہ پارا بیوی پروین اس کے ذوقِ مصوری کے بعد، بلکہ اس کے ذوقِ مصوری سے پہلے ہی، اس کی تمام توجہات کا مرکز تھی۔ موقلم سے تصویروں میں رنگ بھرنا اور پروین کی پرستش کرنا بس یہی دو کام تھے جن پر ادریس نے اپنی زندگی کے اوقات تقسیم کر رکھے تھے۔ لیکن دونوں طرف اس کی محویت کو دیکھکر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کون سا کام اسے زیادہ محبوب ہے۔

"نورجہانی" کرسی کو خرید کر اپنے اسٹوڈیو (تصویر کشی کا کمرہ) میں رکھنے کے بعد ادریس اکثر پروین کو اس پر بٹھا کر اس کے جلوہ ہائے جمال سے سیراب ہوا کرتا اور اس عالم کیف میں اس کا موقلم اس کی انگلیوں میں اس طرح زندہ ہو جاتا کہ اس کی حرکتیں تصویر میں جان ڈالنے لگتیں۔ ایک دن ادریس نے جوشِ محبت میں پروین سے کہا۔ "یہ کرسی میں نے تمہارے لئے اسی طرح خریدی ہے جس طرح جہانگیر نے اسے اپنی محبوبہ نورجہاں کے لئے خریدا تھا۔ جب تم اس پر بیٹھتی ہو تو میں تمہیں نورجہاں اور اپنے آپ کو جہانگیر سمجھنے لگتا ہوں۔ پھر مجھے اس کا غم نہیں رہتا کہ دنیا نے میرے کمال کی قدر نہیں کی ہے اور ہم اپنی تنگدستی کے باعث عیش وآرام کی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ میں محبت کا بادشاہ ہوں اور تم حسن کی ملکہ ہو"

"اے سبحان اللہ!" پروین نے ہنسکر جواب دیا "تم نے تو تعریف کر کر کے مجھ سی کنیز کو اور بھی سر چڑھا دیا ہے۔ کہاں میں اور کہاں ملکہ نورجہاں! میں تو صرف تمہارے اصرار سے اس کرسی پر بیٹھی ہوں، ورنہ جب مجھے اس کے مالک کا شاہانہ جاہ وجلال یاد آتا ہے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس پر بیٹھتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ بہرحال، اس کرسی پر کا پھٹا ہوا مخمل مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اگر تم اجازت دو تو میں اسے رفو کر دوں"

ادریس نے اجازت دیدی۔ پروین مخمل کو رفو کرنے بیٹھی۔ پرانا مخمل چند جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ پروین کی خوبصورت نازک انگلیوں میں سوئی اور ریشم کا دھاگا بھی ایک معشوقانہ ادا سے چل رہا تھا، جب سامنے کے تمام حصے مرمت ہو چکے تو پروین کی انگلیاں مخمل کے اُس شگاف کو درست کرنے لگیں جو نشست کے پچھلے حصہ میں تھا۔ یہاں پر مخمل کے نیچے کی سطح اسے بہت زیادہ سخت معلوم ہوئی۔ پروین نے اپنی انگلیاں گدے کے شگاف میں ڈالیں اور ٹٹولنے کے بعد اسے ایک بٹوہ ملا جس میں کڑے کڑے دانوں جیسی کچھ چیزیں تھیں۔ پروین کا دل دھڑکنے لگا اس نے بٹوہ باہر نکالا اور ادریس کو اپنے پاس بلا کر کہا "دیکھو تو اس میں کیا ہے؟"

"دولت کا خزانہ!" ادریس نے حیرت زدہ ہو کر جواب دیا اور تھرتھراتی ہوئی انگلیوں سے بٹوہ کھولا۔ لیکن دونوں والستگان عشق و محبت اور طالبانِ دولت و مسرت کو یہ دیکھکر انتہائی مایوسی ہوئی کہ اس میں چند کالے کالے پتھر کے دانوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس پرانے اور پچکے بٹوے کے اوپر ہندی کے چند حروف لکھے ہوئے تھے جو امتدادِ زمانہ کے باعث مٹے مٹے سے دکھائی دیتے تھے۔ ادریس نے انہیں محدب شیشہ سے دیکھا تو ہندی میں:-

۸ ... ۔ H ... S ۔ ۔ ۔ 2آ ... 92%

سی لکھی ہوئی ایک تحریر نظر آئی۔ جو اگر اردو میں ہوتی تو یوں لکھی جاتی:-

۱۲۵ ... س ... ہ ... م ... ت۔ ان کے درمیانی حروف تقریباً مسخ ہو چکے تھے لیکن ادریس پھر بھی اس تحریری معمہ کو انتہائی غور سے دیکھ رہا تھا۔

پروین خاموش کھڑی تھی اور دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ کرسی کے گدے میں پتھر کے سیاہ دانے چھپا دینا بھی کیسی حماقت تھی۔ آہ! اگر اتنے ہیرے ہمیں مل جاتے! ادریس کی نگاہیں بٹوہ کے ہندی حروف پر جمی ہوئی تھیں اور دماغ پر پورا زور دیکر وہ درمیانی حروف کی جگہ بھرنے اور فقرہ کو پورا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے چہرہ پر کامیابی کی سرخی نمودار ہوئی اور وہ یکایک کہہ اٹھا۔ "پیاری پروین! میں نے پڑھ لیا۔ دیکھو۔ یہ لکھا ہے۔ ۱۲۵ سیاہ موتی۔ اب یہ بٹوہ لو اور موتیوں کو گن ڈالو۔"

پروین نے بٹوے سے دانے نکالکر گنے، جو برابر جسامت رکھنے والے اور بیدھے ہوئے ایک سو پچیس سیاہ موتی تھے۔ "پیارے! کیا تم جانتے ہو کہ یہ موتی کیسے ہیں یا ان کی قیمت کیا ہے؟" پروین نے سوال کیا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم" ادریس نے جواب دیا۔ "میں نے سیاہ موتی کبھی دیکھے بھی نہیں۔ معلوم نہیں یہ اصلی ہیں یا نقلی۔ لیکن میں اس کا ایک دانہ کسی جوہری کے پاس لیجاتا ہوں۔ دیکھوں وہ کیا کہتا ہے۔ میری واپسی تک میرا انتظار کرو اور اس اثنا میں ذرا اس بٹوے کو بھی صاف کر ڈالو۔"

(۲)

ہیرا مل پنا لال جوہری اپنی دوکان پر ایک آراستہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ ادریس نے اپنے آنے کی خبر بھیجی اور ملاقات چاہی۔ جوہری نے اسے اندر بلا لیا اور گہری نظر سے ادریس کو از سرتا پا دیکھنے کے بعد اپنے قریب بٹھایا۔

"فرمائیے۔ کیونکر تشریف لانا ہوا؟" جوہری نے پوچھا۔ "مجھ سے کیا کام ہے؟"

"میں آپ کے ملاحظہ کیلئے ایک سیاہ موتی لایا ہوں" ادریس نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے دیکھکر اپنی رائے قائم کریں۔ ممکن ہے میرا خیال غلط ہو۔ میں نے سنا ہے کہ اس فن میں آپ سے بڑا کوئی ماہر نہیں۔ اس لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

پنا لال مسکرایا۔ ادریس نے جیب سے موتی نکال کر اسکے کفِ دست پر رکھدیا۔ پنا لال نے اس سیاہ موتی کو چند طرح سے جانچا۔ آنکھوں پر شیشہ لگا کر اسے دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اسے ایک بہت ہی حساس کانٹے پر تولا۔ اس کے بعد ایک ماہرانہ انداز سے کہا۔ "یہ اصلی اور بہترین قسم کا سچا سیاہ موتی ہے۔ اس کی قیمت میرے خیال میں تقریباً ایک ہزار روپیہ ہے۔ چونکہ یہ بیدھا ہوا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا جوڑا بھی کہیں ہوگا۔ ممکن ہے یہ کانوں کے آویزے کا ایک موتی ہو۔"

یہ سنتے ہی ادریس کا دل مسرتوں کا سرچشمہ بن گیا۔ اس نے اپنے بے قابو ہو جانے والے جذبات کو دبا کر کہا۔ "جی نہیں لالہ صاحب۔ یہ کانوں کے بندے کا موتی نہیں ہے۔ بلکہ ایسے ہی ایک سو پچیس دانوں والی مالا کا ایک موتی ہے۔ باقی تمام موتی کم و بیش اس کے برابر ہیں اور غالباً ہموزن ہونگے۔"

"کیا ایسا ہے؟" پنا لال نے انتہائی حیرت سے پوچھا اور اس کی آنکھیں مٹکنے لگیں۔ "کیا آپ کو اس بات کا یقین ہے؟" ادریس اس جوہری کی حیرت اور استعجاب کا عالم دیکھکر ہنس پڑا۔

"آپ یہ سوال کیوں کرتے ہیں؟" ادریس نے پوچھا۔

"اس لئے کہ دنیا میں سیاہ موتیوں کی مالا بہت کمیاب ہے۔ اور تقریباً جتنی موجود ہیں ان کی تاریخ سے میں واقف ہوں۔ اگر اس طرح کے ایک سو پچیس موتی موجود ہیں تو میں اُنہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور اگر یہ فروخت کے لئے ہیں تو ...."

اتنا کہکر پنا لال مصلحتاً چپ ہو رہا۔ وہ ادریس کے متبسم چہرے پر نظر ڈالتا تھا اور حیرت زدہ ہو کر دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ اس خوبصورت نوجوان کو جو لباس اور تمام ظاہری حالات سے ایک غریب آدمی معلوم ہوتا ہے یہ سوا سو موتیوں کی مالا کہاں سے ہاتھ لگ گئی۔ کبھی اسے یہ خیال ہوتا تھا کہ کوئی عالی خاندان اور دولتمند بیگم صاحبہ نے اس کی فروخت کا نازک معاملہ اس کے سپرد کیا ہے۔

"ہاں" ادریس نے جواب دیا "ممکن ہے وہ موتی بیچے جائیں لیکن ابھی میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔"

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم ان کا گاہک ٹھہرا دیں" پنالال نے کہا "سیاہ موتی بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کا بازار بھی بہت محدود ہے سردست صرف ایک امریکن کروڑپتی ہے جسے ان کی تلاش ہے، اور مجھے اجازت ہے کہ میں اس کے لئے خرید لوں اگر قیمت کا معاملہ طے پا جائے۔"

"میں آپ کا بہت ہی ممنون ہوں" ادریس نے کہا۔ "آپ یقین کریں کہ اگر وہ مالا فروخت ہوگی تو اسے خریدنے کا پہلا موقع آپ ہی کو دیا جائیگا"

(۳)

"پروین! پروین!!" ادریس نے گھر آکر مسرت سے رقص کرتے ہوئے آواز دی۔ "اب ہم خواب و خیال سے بھی زیادہ دولتمند ہیں"۔

ادریس اس وقت خوشی میں آپے سے باہر تھا۔ مسرتوں نے اسے مغلوب کر دیا تھا۔ پروین جوں ہی اس کے پاس آئی اس نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر پوچھا "کہو میری نورجہاں اب کیا کیا چاہتی ہو؟ بہتر سے بہتر لباس۔ قیمتی سے قیمتی زیور۔ عالیشان سے عالیشان مکان۔ مامائیں۔ مغلانیاں۔ موٹر کار۔ نوکر چاکر اور کیا نہیں؟"

پروین کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یہ سوال کرنا ہی چاہتی تھی کہ ادریس نے فرطِ مسرت سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھدیا اور کہا۔ "بس کچھ نہ پوچھو۔ صرف اس ایک موتی کی قیمت جوہری نے ایک ہزار روپیہ لگائی ہے۔ اس حساب سے ایک سو پچیس موتی کی قیمت سوا لاکھ روپیہ ہوئی۔ وہ بٹوہ کہاں ہے؟ ذرا لانا تو"

پروین کے نازک دل پر اس ناگہانی مسرت نے کچھ عجیب اثر کیا۔ جب وہ بٹوہ لینے چلی تو خرام ناز میں قدم ڈگمگانے لگے۔ خوشی سے اس کا چہرہ گلنار ہوگیا تھا لیکن دل میں ایک لامعلوم اضطراب محسوس کر رہی تھی۔

پروین واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک تشتری تھی، موتی کے تمام دانے اس میں رکھے ہوئے اور بٹوے سے ڈھکے ہوئے تھے۔

"اس بٹوے میں میں نے ایک عجیب بات دیکھی۔" پروین نے کہا۔ "اس کے اندر کی طرف بھی ایک تحریر ہے جو ریشمی دھاگوں کی خوبصورت سوزن کاری سے کپڑے پر منقش کر دی گئی ہے۔"

ادریس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے بٹوا الٹ کر دیکھا۔ تحریر ہندی میں تھی۔ ریشمی دھاگے موتیوں سے مس ہونے کے باعث جا بجا سے اُدھڑ گئے تھے۔ پھر ادریس محدب شیشے کو کام میں لایا۔ تقریباً نصف گھنٹہ تک بہ غور دیکھتا رہا۔ پروین ادریس کے چہرے پر نظر جمائے ایک مرمریں مجسمہ کی طرح خاموش اور بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اتنے میں ادریس کے خوبصورت چہرے پر رنج و غم کا سیاہ ابر نمایاں ہوا اور وہ یکایک بول اٹھا۔ "میں نے پڑھ لیا۔ پیاری پروین سنو۔ افسوس۔ تحریر یہ ہے۔"

"میں رانی پاربتی کنور اپنی مالا کو اس کرسی کے اندر اس لئے

چھپا دیتی ہوں کہ اس بھونچال کے سمے میں لوگ اسے

میرے پتی راجہ رتن سنگھ سے چھین نہ لیں ۱۸۵۷ء"

"راجہ رتن سنگھ ایک تاریخی نام ہے۔" ادریس نے کہا "یہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے زمانہ کا مشہور راجہ تھا اور اس کے خاندان کا سب سے بڑا وارث آج بھی زندہ ہے۔ اگرچہ اب راج باقی نہیں لیکن بنگال میں ایک بڑی زمینداری کا مالک ہے۔ لوگ اسے اب بھی راجہ رنبیر سنگھ کہتے ہیں۔"

پروین نے ڈرتے ڈرتے کہا "پھر تو یہ مالا اسی کی ملکیت ہے۔"

یہ سنکر ادریس کے دل میں ایک چوٹ سی لگی۔ ایک ہلکی سی آواز نے اس کے کان میں کہا۔ "ارے بیوقوف۔ اس بٹوے کو جلا دے۔ ابھی ابھی جلا دے۔ پھر ان موتیوں کا مالک تو ہی ہے۔" ادریس نے ہاتھ کی ایک غیر ارادی حرکت سے بٹوا اٹھالیا اور جلتی ہوئی انگیٹھی کی طرف بڑھا۔ پھر ایک دوسری آواز نے جو پہلی سے زیادہ صاف تھی دوسری بات کہی۔ "اسے آگ میں ڈالتے ہی تو عمر بھر کیلئے چور بن جائیگا!"

ادریس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ اس نے آنکھیں اُٹھا کر اُس حسین عورت کی طرف دیکھا جو اس سے محبت بھی کرتی تھی اور اس کی عزت بھی کرتی تھی۔ پھر سر جھکا کر سوچنے لگا۔ یہ دونوں آوازیں کہاں سے آئی تھیں! چند ہی منٹ میں باطن کی ایک روشنی نے حقیقت واضح کر دی۔ پہلی آواز بدی کی تھی دوسری نیکی کی، پہلی شر کی تھی، دوسری خیر کی، پہلی شیطان کی تھی، دوسری ضمیر کی، اس نے فوری فیصلہ کیا اور کہا:- "پیاری پروین! آہ۔ میں اس بٹوے کو جلا نہیں سکتا۔"

پروین عالمِ بیخودی میں آگے بڑھی اور ادریس کو گلے سے لگا کر بولی "پیارے، میں جانتی تھی کہ تمہارا اخلاق ایسی حرکتوں سے بالا تر

ہے - حرص اور طمع تمہارے سچے ضمیر پر غالب نہیں آسکتی - خدا نے بڑا رحم کیا - میں محسوس کر رہی تھی کہ اگر آج تم اس بٹوے کو جلا دیتے تو اس کے ساتھ میری محبت کو بھی سپردِ آتش کر دیتے ۔"

(۴)

دوسرے دن ادریس نے ہیرا لال بنا لال جوہری سے پھر ملاقات کی - جوہری نے ادریس کا نہایت پُر تپاک خیر مقدم کیا اور کہا ۔" میرے گاہک کروڑ پتی نے مجھے تار دیا ہے کہ اگر قیمت طے ہو جائے تو میں آپ سے وہ سب کے سب موتی خرید لوں "۔

" لیکن وہ موتی فروخت نہیں ہونگے "۔ ادریس نے جواب دیا۔

" وہ کسی اور کی ملکیت ہیں "۔

زندگی بھر کے بے شمار تجربات رکھنے والے جوہری نے اس کا جواب شانوں کی صرف ایک ہلکی سی جنبش سے دیا - ادریس نے بٹوے کی تحریر اور موتیوں کا سارا حال کہہ سنایا اور اپنا بیان اس جملہ پر ختم کیا - " چونکہ اب یہ مالا راجہ رتن سنگھ کے موجودہ وارث راجہ رنبیر سنگھ کی ملکیت ہے ، اس لئے میں انہیں واپس کر دونگا "۔

ہیرا لال جوہری کا مزاج ایسا تھا کہ کسی بات پر اس کے توازن میں خلل نہیں آتا تھا ، پھر بھی اسے ادریس کی دیانتداری پر سخت حیرت تھی۔

" میں خوش ہوں کہ مجھے آپ جیسے ایماندار نوجوان سے ملنے کا فخر حاصل ہوا۔" یہ جملہ سنکر ادریس کے چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی - پھر ہیرا لال نے کہا۔" لیکن کیا میں یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ اس کی واپسی کی گفت و شنید بھی آپ میرے ہی ذریعہ سے کریں - یقیناً آپ ایک معقول انعام کے حقدار ہیں - اور رنبیر سنگھ ایک مشہور بخیل اور کنجوس آدمی ہے - لیکن کم از کم اس مالا کی قیمت کا دسواں حصہ آپ کو ملنا چاہیئے "۔

" میں..... میں چند منٹ کے لئے لالچ کا شکار ہو گیا تھا " ادریس نے کہا " لیکن جب میں نے اس کی واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے تو بلا کسی شرط کے واپس کر دونگا - اب یہ اُن کی خوشی اور ہمت ہے کہ جو کچھ مجھے چاہیں بخشدیں -

" ہمت اور بخشش سے انہیں کوئی سروکار نہیں " جوہری نے جواب دیا " لیکن بہر حال آپ قسمت آزمائی کریں ممکن ہے زندگی میں ایک بار وہ بڈھا فیاض ہو جائے ۔"

ادریس نے دو دن بعد دہلی سے کلکتہ کا سفر کیا جہاں راجہ رنبیر سنگھ ایک عالیشان کوٹھی " مہاراجہ بھون " میں رہتا تھا - جب ادریس " مہاراجہ بھون " میں پہنچکر راجہ رنبیر سنگھ کے روبرو بلایا گیا تو اُس کا چہرہ دیکھتے ہی اسے شیکسپیئر کے ڈراما کا مشہور دولتمند ، بخیل اور بد طینت یہودی شائلاک یاد آ گیا ، ایک بڑی آرام کرسی میں اس کی خمیدہ نشست اور اس کے چہرے کی جھریوں ، اس کی پیشانی کی شکنوں ، اس کی جھکی ہوئی ابروؤں ، اس کی چھوٹی آنکھوں اور چالاک نگاہوں نے ہیرا لال جوہری کی رائے کی تصدیق کر دی کہ یہ راجہ صاحب جو صرف تملقاً اور رسماً راجہ صاحب کہے جاتے تھے اوّل نمبر کے بخیل ہیں - اور اگرچہ بنک کی کثیر رقموں کے علاوہ ان کا خانگی خزانہ بھی جواہرات سے بھرا ہوا تھا ، لیکن ان کی قسمت میں صرف دولت جمع کرنے کا کام تھا - خرچ کرنے کے لئے کسی دوسرے ہاتھ اور دوسری طبیعت کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

ادریس ایک طرف کرسی پر بٹھایا گیا - اُس نے اپنی داستان شروع بھی کی اور ختم بھی کی - راجہ رنبیر سنگھ نے سُن لیا اور موتی ہاتھ میں لے کر گن ڈالے - ادریس کو اُس کا چہرہ دیکھکر یہ توقع تو باقی نہ رہی تھی کہ کسی بڑے انعام کا اعلان کیا جائیگا لیکن کم از کم چند دل خوش کن باتوں اور شکر گزاری کی جو امید لگی تھی وہ بھی جاتی رہی - کیونکہ پہلا سوال جو اس سے کیا گیا وہ یہ تھا۔

" کیا وہ کرسی بھی لائے ہو ؟ "

" وہ کرسی تو میری ملکیت ہے " ادریس نے جواب دیا۔" میں نے اسے قیمت دیکر دو سو روپیہ میں خریدا ہے ۔"

" میں تین سو دینے کو تیار ہوں " رنبیر سنگھ نے جواب دیا -

" لیکن میں اسے فروخت نہیں کرونگا " ادریس نے تلخ لہجہ میں کہا -

" نوجوان لڑکے ! " رنبیر سنگھ نے کہا ۔ معلوم ہوتا ہے تم کوئی خوشحال آدمی ہو جو اتنی قیمت کی کرسی رکھنا چاہتے ہو "۔

" جناب عالی میں ایک گمنام مصوّر ہوں " ادریس نے بددلی سے کہا " لیکن وہ کرسی مجھے بہت عزیز ہے ۔"

" تم مصوّر ہو ؟ رنبیر سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔

" ادریس نے گردن کی جنبش سے اثبات کا اظہار کیا -

" اگر میں اپنی قد آدم تصویر تم سے بنواؤں تو تم کم از کم کیا اُجرت لوگے ؟ " رنبیر سنگھ نے شوق سے پوچھا -

" کم از کم " کا فقرہ سنکر ادریس کا جلا ہوا دل اور بھی جل گیا - اس کا جی چاہتا تھا کہ جھنجھلا کر صاف انکار کر دے لیکن اس نے اپنے انتقامی جذبات کو آئندہ کے لئے محفوظ رکھا اور جواب دیا " یہ آپ کی قدردانی

پہ موقوف ہے۔ نواب صاحب دلاور پور نے مجھے اپنی تصویر کے پانچ سو روپے دئے تھے۔"

"کیا انہوں نے تمہارا کام پسند کیا تھا؟" رنبیر سنگھ نے پوچھا۔

"یہ اسی سے ظاہر ہے کہ اپنی تصویر کے بعد انہوں نے مجھ سے اپنی بیگم صاحبہ اور دو لڑکیوں کی تصویر بنوائی، اور اس کا معاوضہ میں مجھے ایک ہزار روپیہ دیا۔"

"اچھا تو کیا تم میری تصویر کھینچ دو گے؟"

"مجھے کوئی عذر نہیں"

"لیکن میرے ہاتھ میں یہ موتیوں کی مالا بھی ہوگی۔"

"بہتر یہ بھی ہوگی۔"

یہ سنتے ہی بوڑھے نے مسرت سے ایک قہقہہ لگایا اور پانچ منٹ میں یہ معاملہ طے ہوگیا کہ ادریس اسی کوٹھی میں قیام کر کے دوسرے دن راجہ رنبیر سنگھ کی تصویر کشی میں مشغول ہو جائیگا۔

(۵)

اسی دن رات کو ادریس نے اپنی محبوبہ پروین کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

"میں اس کنجوس دولتمند رئیس کے جھریوں والے بدنما چہرے پر طمانچہ مارنا زیادہ پسند کرتا، لیکن اس کی بجائے اب میں اس کی تصویر بناؤنگا، اور اس کی دلی خباثت کو اسی تصویر کے ذریعہ اس کے روبرو پیش کرونگا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس صورت سے اس کی اصلیت اس پر ظاہر ہو جائے۔"

"فیصلہ کو چوبیس گھنٹے بھی بمشکل گذرے تھے کہ ادریس نے رنبیر سنگھ کی تصویر کشی کا کام شروع کر دیا اور اس کے مکمل ہو جانے تک مجنونانہ سرگرمی کے ساتھ اس میں منہمک رہا۔ اس سے پہلے کبھی ادریس نے اتنی رغبت اور ایسی محنت کے ساتھ کام نہیں کیا تھا، کبھی اس نے اپنے آپ میں ایسی قابلیت محسوس نہ کی تھی کہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھے اسے ہوبہو کانوس پہ ظاہر کر دے۔ انتقام اس کا محرک تھا اور نفرت الہام کا کام کر رہی تھی۔ وہ اس تصویر کے موضوع یعنی بوڑھے رنبیر کو جب دیکھتا تھا، تو اس کا موقلم اور رنگ سحر طرازی کرنے لگتا تھا، اور اسکی باتیں جب سنتا تھا تو اس کے قلم کی ایک ہی جنبش تصویر کی جبین جبیں پہ موضوع کی انتہائی تنگ دلی اور بد باطنی ظاہر کر دیتی تھی۔

"ادریس کے لئے سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ راجہ رنبیر سنگھ اپنی اس تصویر کو دیکھ دیکھ کر بیحد خوش ہوتا تھا۔ ادریس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس بوڑھے کو طعن و تشنیع کی باتوں سے خاص دلچسپی تھی۔ لیکن اگر کوئی تلخ جواب ملتا تھا تو صرف قہقہہ لگا کر یا دانت لبسور کر رہ جاتا تھا۔ ایک دن اس نے ادریس سے کہا "تم اور تمہاری بیوی۔ دونوں نادار مگر خوبصورت اور نوجوان بیوقوف کہے جا سکتے ہیں" ادریس نے بھی دندان شکن جواب دیا۔ "اگر غریب اور خوبصورت ہونا حماقت ہے تو آپ کسقدر عقلمند ہونگے!"

جب تصویر مکمل ہوگئی اور ادریس نے اپنا انتہائی کمال اس بوڑھے کی بدصورتی اور بدسیرتی ظاہر کرنے میں صرف کر دیا تو آخری معاملات اور ادریس کی روانگی کا وقت آیا۔

"کہیئے آپ کو اپنی تصویر پسند آئی؟" ادریس نے پوچھا۔

"مجھے بیحد پسند آئی" بڈھے نے جواب دیا "میں اس کی قیمت سے کچھ زیادہ تمہیں دینا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ انعام نقدی کی صورت میں نہیں ہوگا بلکہ شہرت کی صورت میں۔"

"یعنی؟" ادریس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"میں اپنی اس تصویر کو وکٹوریہ میموریل کی آرٹ گیلری کی نذر کر دونگا۔" راجہ رنبیر نے جواب دیا۔ "وہاں سب کی تصویریں نہیں لی جاتیں۔ بڑی سختی سے جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ لیکن۔ م۔ م۔ میں بڑا آدمی ہوں، دولتمند ہوں اس لئے میں اسے وہاں داخل کرنے اور لٹکا دینے کی راہ نکال لونگا۔"

"کیا اس سے اس تصویر کی وقعت بڑھ جائیگی؟" ادریس نے پوچھا "اصل اعزاز تو میرے کمال میں ہے۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا" بوڑھے نے قہقہہ لگایا............

کہا۔ "اے نوجوان مصور۔ تم بہت ہی بھولے ہو۔ دنیا آجکل کمال کی داد نہیں دیتی۔ صرف اشتہار کی طرف دوڑتی ہے اور اسی کی داد دیتی ہے۔ لیکن اگر کمال اور اشتہار دونوں دست و گریباں ہوں تو کیا کہنا۔"

اسی رات کو پھر ادریس نے پروین کو ایک خط میں یہ لکھ بھیجا۔

"اس کا یقین کرنا مشکل ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ بوڑھا کنجوس چاہتا ہے کہ اس کی تصویر کی نمائش ہو اور ساری دنیا اس کے بدنما اور منحوس چہرے کو دیکھے۔ میرا خیال ہے کہ اسے اس تصویر پر فخر ہے۔ حالانکہ فخر مجھے ہونا چاہیئے۔ کیونکہ غالباً یہی تصویر میری زندگی کا شاہکار ہوگی۔"

ایسا ہی ہوا۔ راجہ رنبیر کی تصویر کلکتہ کی آرٹ گیلری میں لٹکائی گئی۔ بڑے بڑے امراء، رؤسا اور اہلِ فن اسے دیکھنے آئے۔ ادریس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ سارا ملک اس کے کمال کے غلغلہ سے گونج اٹھا۔ راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں نے ادریس کو اپنی اپنی تصویریں کھینچنے کے اتنے آڈر دیے اور ایسی ایسی گرانقدر رقمیں اس کے قدموں پر رکھدیں کہ ادریس صرف ایک سال کے اندر مالا مال ہوگیا اور سیاہ موتیوں کی مالا کا کوئی خیال اس کے دل میں باقی نہ رہا۔ البتہ وہ ”نور جہانی کرسی“ اس کی ملکہ حسن پروین کی جائے نشست اور اس کی مصوری کا ذریعہ الہام بنی رہی۔

سیّد ابن الحسن فکر ایم۔ اے

جمہوریۂ ترکیہ کا جدید پایۂ تخت

جس طرح انسانوں اور قوموں کی زندگی میں انقلاب آتے ہیں اسی طرح شہروں کا حال ہے۔ دس برس پہلے کوئی شخص یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ انگورہ ہے کہاں؟ آج کوئی اخبار یا رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن انگورہ کی خبریں نہ شائع ہوتی ہوں۔ بارہ چودہ سال ہوئے انگورہ ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں تھا جس کے ارد گرد میلوں تک دلدل ہی دلدل نظر آتی تھی یہاں کے باشندوں کا ذریعۂ معاش ”شال بافی“ تھا۔ کیونکہ پہاڑ نزدیک ہے اور بھیڑیں بکثرت موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے باشندوں میں کوئی زندگی تھی نہ قابل تذکرہ بات، لیکن آج انگورہ جمہوریہ ترکیہ کا پایہ تخت ہے اور وہ شخص یہاں رہتا ہے جس نے اپنی ہمت اور آہنی ارادے کی بدولت بیسویں صدی میں مردہ ترکی کے جسم میں زندگی کی روح پھونک دی۔ ۱۹۰۵ء تک یہاں کی شہری اور اقتصادی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی شہر میں صرف دو ہوٹل تھے جن کی حالت یہ تھی کہ میزوں پر میز پوش بھی نظر نہ آتے تھے۔ لیکن آج وہاں کے ہوٹل نفاست اور پاکیزگی میں لندن اور پیرس کے ہوٹلوں کو شرماتے ہیں۔

غازی مصطفٰے کمال پاشا نے قسطنطنیہ، ادرنہ، بروصہ سمرنا اور سقوطری قدیم پایہ تختوں کو چھوڑکر، اس گمنام مقام کو محض جنگی مصالح کی بناء پر اپنا یا جمہوریہ ترکیہ کا پایہ تخت بنایا ہے اور ۱۹۲۵ء سے ”نئی دہلی“ کی طرح نیا انگورہ یا ”انقرہ جدید“ نہایت سرعت کے ساتھ عالم وجود میں آرہا ہے۔ سب سے پہلی عمارت ”ایوان مجلس العوام“ ہے۔

انگورہ کے قریب ہی قدیم یونانی زمانہ کا ایک عظیم الشان معبد یا مندر ابھی تک زبان حال سے قدیم یونانیوں کی تہذیب کی داستان سنا رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے جو سیاح اس شہر کے ”دیکھنے“ کے لئے آتے ہیں وہ اس مندر کی زیارت ضرور کرتے ہیں۔

پروفیسر یوسف سلیم

رباعی

یوں زیست نہ اپنی ہمکو بھاری ہوتی
کلفت بھی خوشی بھی، باری باری ہوتی
ہوتے نہ اگر ہم آپ اپنے دشمن
یوں تلخ نہ زندگی ہماری ہوتی

روآں

"رازِ آسائش"

رات آدھی آچکی ہے بیخبر ہے کائنات
مَیں ہوں، تنہائی ہے اور اک پُرسکوں درسِ حیات

سامنے آبادیوں میں ٹمٹماتے ہیں چراغ
کانپتی ہے جن کی دھیمی ضَو میں تنویرِ فراغ

دُور میدانوں میں ساکت ہے درختوں کی قطار
سرنگوں شاخیں، ہوا خوابیدہ، بیخود برگ بار

کیف میں ڈوبا ہوا ہے دہرِ فانی کا نظام
نغمہ زن تارے، فضا شاداب، دورِ بادہ عام

تھک چُکی ہے جنبشِ پیہم سے نبضِ اضطراب
راستے سُونے، چمن خاموش، دریا محوِ خواب

چھا رہا ہے ذرّے ذرّے پر سکوتِ بے خلل
بیخودی کی لذتوں میں غرق ہے رُوحِ عمل

دے رہی ہے دیدۂ بیدار کو درسِ کمال
تیرگی کے دوش پر بکھری ہوئی زلفِ مآل

کانپتی ہے ساغرِ بینش میں عرفاں کی شراب
اُٹھ چکا ہے چہرۂ اسرارِ ہستی سے نقاب

ہو چکا ہے ختم عہدِ کاوشِ صبر آزما
لے رہی ہے سسکیاں آہستہ رَو موجِ صبا

قصرِ آسائش میں ہیں آسودہ اجزائے حیات
آگئی ہے ایک نقطے پر سمٹ کر کائنات

راحت افزا بیخودی طاری ہے میری رُوح پر
خاک کے ذرات میں رقصاں ہے اِک موجِ گہر

اِسقدر کیف آفریں ہے روئے گیتی کا جمال
لغزشِ مستانہ ہے اور جنبشِ پائے خیال

سوچتا ہوں میَں کہ دنیا اور یہ فکرِ جاں گُسل!!
یہ خلش، یہ کاوشِ پیہم، یہ جہدِ مستقل!!

کسقدر انسان ہے بیگانۂ رازِ حیات!!
شادمانی کیلئے ہے لرزشِ سازِ حیات!!

کاش اِسکی رُوح پر کھلتے حقیقت کے مقام
کاش یہ ناداں سمجھتا رات کا شیریں پیام

زندگی دامِ غم و افکار سے آزاد ہے
بیخبر انسان مشق جہد میں برباد ہے

دوڑتا ہے ہر رگ و پے میں طرب افزا لہو　　یہ تخیّل ہے اور اک آزار موجِ رنگ و بُو
دفعتاً تھرا کے ہو جاتی ہے گُل شمعِ دماغ　　بڑھ کے ہوتے ہیں فروزاں سینۂ گیتی کے داغ

بجلیاں لرزاں نظر آتی ہیں تا حدِّ نظر
دل سے اک آواز آتی ہے کہ سُن، او بیخبر!

ڈھونڈتا ہے موت کی وادی میں اسرارِ حیات!!　　چاہتا ہے ساغرِ زہراب میں قند و نبات!!
پوچھتا ہے سوزِ غم سے عشرتِ آسودگی!!　　کھولتا ہے ناخنِ دانش سے رازِ بیخودی!!
لے رہا ہے فطرتِ سیماب سے درسِ سکوں!!　　کر رہا ہے ہوش کے اجزا سے تعمیرِ جنوں!!
مانگتا ہے دیدۂ بے نور سے تابِ نگاہ!!　　خواہشِ حسنِ عمل ہے اور شبستانِ گناہ!!
جوڑتا ہے دل کے ٹکڑے نشترِ بیداد سے!!　　پُرسشِ خوابِ سکوں، خاکسترِ برباد سے!!
جانتا ہے بطنِ گلخن کو حریمِ رنگ و بُو!!　　گل سمجھ کر، کھیلتا ہے آگ کے شعلوں سے تُو!!
جلوہ ساماں ہے ضمیرِ آب و گل تیرے لئے　　اضطرابِ درد ہے تسکینِ دل تیرے لئے

سطح بیں! اک تک نظر، وابستۂ دامِ حجاب　　دہر کا ہر نقش ہے اک مبہم و تاریک خواب
کر رہا ہے صرف، بے پروا مزاجِ روزگار　　برق کی تعمیر میں اجزائے ابرِ نوبہار
بجلیاں ہیں کیفِ شادابی کی رگ رگ میں نہاں　　تجھکو ہے موجِ سکوتِ شب پہ راحت کا گماں
رات کی تسکیں فزا خاموشیوں میں، بیخبر!　　پرورش پاتی ہے اک ہنگامہ در دامنِ سحر

تجھ کو شاید کچھ بتائیں انجمِ شب زندہ دار　　کانپتے ہیں اس فضا میں کتنی آہوں کے شرار
کہہ سکیگی تجھ سے یہ خاموش موجِ تیرگی　　دفن ہے سینے میں اس کے کتنے غنچوں کی ہنسی
تُو ہٹا کر دیکھ تو رخسارِ عشرت سے نقاب　　کتنے دل ہیں، دوڑتی ہے جن میں رُوحِ اضطراب
کتنے محشر ہیں یہاں، منت کشِ جوشِ فغاں　　تجھ کو یہ قصہ سنائے گی خموشی کی زباں!

کتنی آنکھیں آہ! اس دنیا میں ہیں محرومِ خواب
تجھ کو سمجھائے گا یہ موجِ ہوا کا پیچ و تاب

اِس دیارِ بیکسی کی وسعتِ غمناک میں
رُوحِ شادابی کہاں ہندوستاں کی خاک میں

اُٹھ! کہ یوں کب تک اسیرِ قلعہ وہم و قیاس
اے فریبِ آسودۂ راحت، حقیقت ناشناس

دل کے عقدے ناخنِ حسنِ عمل سے کھول لے
فتح کر بڑھتے ہوئے طوفاں، موتی رول لے

تو سمجھتا ہے کہ آسائش ہے رازِ کائنات
بیخبر! اجزائے کاوش سے ہے ترتیبِ حیات

پنکھڑی ہر چند ہے رازِ کمالِ رنگ و بُو!
دیکھ اُس دانے کو بھی جو مِٹ کے پاتا ہے نمو

رازِ ہستی ڈھونڈھ، گر دعم ہو یا نورِ طرب
تجھ پہ کُھل جائے گا خود بابِ طلسمِ روز و شب

کشمکش میں سطح کی بیچین ہے تیری نظر!
موج سو جاتی ہے خود گہرائیوں میں ڈُوب کر

رُوحِ تاریکی میں پیدا حُسن کی تنویر کر
رات کی خاموشیوں میں صبح کی تعمیر کر

علی اختر

غزل

وہی طول ہے، وہی اضطراب، وہی نزدِ دل غذاب کا
مجھے اپنے روزِ سیاہ پہ ہے گمان روزِ حساب کا

دل و جان و صبر و قرار، مطربِ عشق سب تری نذر ہیں
ابھی ایک نغمہ سُنا ہے میں نے ترے طلسمِ رباب کا

ہو محیطِ دہر میں سر بلند کہ ڈُرنا کا فضول ہے
ہے نثار شوکتِ یک دقیقہ پہ سر ہر ایک حباب کا

یہی اعترافِ وفا ہے، دو دستِ احباب سمجھنے لگا ہی تو
کہ مرے سوا نہیں مستحق کوئی تیرے جور و عتاب کا

یہ شرابِ جام فروز، اور یہ ترا جمال زمانہ سوز!
مجھے ہوش کیا ہے کہ امتیاز کروں گناہ و ثواب کا

طرب و نشاط سے کیا غرض؟ مجھے غم سے دائمی ربط ہے
کہ ہے نشۂ عہدِ قدیم سے مجھے اس پرانی شراب کا

جسے ڈھونڈھتا تھا ازل سے تو، وہ ترے ہی خانۂ دل میں تھا
تری کم نگاہی، کلیم بن گئی باعث اس کے حجاب کا

عطاءاللہ کلیم

تاریخ اور وقت

(۳)

وقت کی چھوٹی تقسیمیں

اور

خاص دن

(۱)

وقت کی بعض تقسیموں، مثلاً ہفتہ، گھنٹہ، منٹ، سے ہم اسقدر عادی ہوگئے ہیں، اور وہ ہماری زندگی کے کاروبار میں اسقدر مستعمل ہیں کہ اس کا خیال ہمیں مشکل ہوتا ہے کہ یہ سب تقسیمیں فرضی و اصطلاحی ہیں۔ جو انسان نے اپنی سہولت کے لئے نکال لی ہیں۔

ہفتہ کا خیال کب اور کس طرح پیدا ہوا؟

اس کا مختصر جواب دینا تو مشکل ہے لیکن مشرق میں اس کا رواج ہزارہا برس سے چلا آتا ہے۔

مصریوں نے ایام ہفتہ کے نام اجرام سماوی پر رکھے تھے، اُن کی تقلید میں یہی رسم یونانیوں، رومیوں اور زمانۂ مابعد میں اُن کے اثر سے یورپ کی اقوام نے اختیار کی۔

عربوں کے اثر سے اُس کا رواج شمالی افریقہ میں ہوا۔

قمری مہینہ کم از کم ۲۸ دن کا ہوتا ہے۔ چاند کی بدلتی رہنے والی شکلیں قدیم انسان کے متخیلہ پر بڑا اثر ڈالتی رہی تھیں۔ ممکن ہے کہ اسی سے اس ہفتہ کا خیال پیدا ہوا جو ماہ قمری کا ¼ ہوتا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ سورج، چاند اور پانچ ستاروں کی وجہ سے جن سے قدما واقف تھے، ہفتہ کا تصور قائم ہوا جس کی تائید میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ایام ہفتہ کے نام انہی اجرام سماوی سے منسوب ہیں۔

بہرحال وقت کی یہ تقسیم اسقدر قدیم اور عام ہونے کے باوجود تمام دنیا میں رائج نہیں تھی اور نہ اب ہے۔

قدیم یونانیوں میں مہینے کے تین حصے دس دس دن کے ہوتے تھے اور قدیم رومیوں میں آٹھ دن کا ایک زمانہ شمار ہوتا تھا۔ اور ایرانیوں میں ۵ دن کا۔

افریقہ کی مختلف قوموں میں ۲، ۴، ۵ اور ۶ دن کی مدتیں رائج ہیں۔ جنوبی امریکہ میں تین دن کی، اور ملیشیا، جاوا، سیلیبیس، نیوگنی اور میکسیکو میں ۵ دن کی۔

یہ تعین مقامی بازاروں اور میلوں کے لحاظ سے کیا جاتا ہے، یعنی جہاں جتنے دن بعد بازار یا میلا لگتا رہتا ہے، وہی زمانہ ایک معین میعاد قرار پاجاتا ہے۔ کانگو میں اس مدت کے لئے جو لفظ مستعمل ہے وہ بازار کا ہم معنی ہے۔ اور بعض وحشی قوموں میں دنوں کے نام بھی مقامی بازاروں سے موسوم ہوتے ہیں۔

ہفتہ کی تقسیم نے متمدن دنیا میں رسم و رواج اور قدامت کے باعث ایک طرح کا مذہبی تقدس حاصل کرلیا ہے، اور وقت کی یہ تقسیم اب تک اسقدر ہردلعزیز ہے۔ لیکن وہ کسی صحیح علمی اصول پر مبنی نہیں ہے۔

آنے والے زمانہ میں جب صحیح علمی تقویم کی بنیاد ڈالی جائیگی۔ تو اس سے بہتر تقسیم (مثلاً خمسہ یا عشرہ) اختیار کی جائے گی۔

(۲)

اس میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا کہ ابتداً انسان نے دن کی تقسیمیں اُس کے ظاہری کیفیات کے لحاظ سے صبح، دوپہر، شام، رات وغیرہ میں کی تھیں۔ مدتہائے دراز تک غالباً کوئی اور تقسیم وضع نہیں ہوئی۔

لیکن یہ تقسیم شمار کے لئے بیکار ہے۔ دن رات بڑھتے گھٹتے رہتے ہیں، اور اُن کے ذریعہ سے وقت کی پیمائش نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے انسان کو ضرورت پیش آئی کہ رات دن کی مدت کو بطریق حساب مساوی حصوں میں بانٹا جائے۔

دن کی تقسیم ۲۴ گھنٹوں، اور ساٹھ منٹ کی نہایت قدیم ہے۔ اور اس کی ایجاد قدیم کلدانیوں سے منسوب ہے، جو بارہ کے عدد اور اُس کے ضروب و کسور کو ایک طرح کا تقدس دیتے، اور اُن سے مختلف حسابوں میں کام لیتے تھے۔

وقت کے شمار میں سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ دن رات کی ابتدا کب سے کیجائے۔ مختلف قوموں میں اس کے متعلق بہت کچھ اختلاف رہا ہے۔

اہلِ یورپ قدیم مصریوں کے اقتدا میں دن کا آغاز آدھی رات سے کرتے اور دن کا ایک نصف دوپہر سے پہلے اور دوسرا دوپہر کے بعد سمجھتے ہیں۔

اہلِ ہند، اہلِ کالدیا، اور رومی پانچویں صدی کے وسط تک ایک طلوع سے دوسرے طلوع تک، اور اہلِ اطالیا، اور بوہیمیا غروب سے غروب تک دن کا شمار کرتے ہیں۔

اہلِ عرب کے نزدیک بھی دن کا شمار غروب سے غروب تک تھا جسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ غروب کے بعد ہی رویت ہلال ہوتی ہے جس سے اُنکے مہینے کا آغاز ہوتا ہے۔

جو لوگ طلوع شمس کو ترجیح دیتے ہیں، وہ رویت شمس پر اپنے حساب کو مبنی رکھتے ہیں۔

علمائے فقہ اسلام نے قرآن پاک کی ایک آیت کی بنا پر جس میں روزہ کی مدت بیان کی گئی ہے طلوع فجر سے دن کی ابتدا قرار دی ہے اور اُس کی انتہا غروب شمس پر کر دی جاتی ہے۔

علمائے ہیئات دن کا شمار نصف النہار سے نصف النہار تک کرتے ہیں، یونانی عالم ہیئات ایپرچس (Hipparchus) نے دن کا شمار آدھی رات سے آدھی رات تک رکھا تھا اور الغ بیگ نے لکھا ہے، کہ خطا اور ایغور کے منجم بھی دن کا شمار اسی طریق پر کرتے تھے۔

جہاز رانوں میں بھی دن کا شمار نصف النہار سے نصف النہار تک ہے، لیکن ان کا دن علمائے ہیئات کے دن سے ایک روز پہلے ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۳ اپریل علمائے ہیئات کے یہاں ۱۳ اپریل کی دوپہر سے شروع ہو کر ۱۴ اپریل کے دن کا نصف حصہ ۱۳ اپریل محسوب ہوگا۔ لیکن جہاز رانوں میں ۱۳ اپریل کا آغاز ۱۲ اپریل کی دوپہر سے ۱۳ اپریل کی دوپہر تک ہوگا۔

(۳)

ماہرینِ علوم طبیعی کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض قدرتی اسباب سے کرۂ ارض کی گردش میں ایک خفیف زیادتی ہو رہی ہے، لیکن وہ اتنی خفیف ہے کہ جو ایک صدی میں بقدر ثانیہ کے $\frac{1}{100}$ کے ہوگی، اور بآسانی نظر انداز کی جا سکتی ہے۔

اِس لئے وقت کی پیمائش کے لئے عملاً یہ مان لینا نامناسب نہیں ہے، کہ ایک دن دوسرے دن کے برابر ہوتا ہے، اور اسی مفروضہ کی بنا پر وقت کی تقسیم ہوتی ہے۔

وقت کو کس طرح ناپا جائے؟

قدیم علما نے اُس کے لئے مختلف ایجادیں کی تھیں مثلاً دھوپ گھڑی پانی اور ریت کی گھڑیاں۔ اور بعض دیگر عجیب و غریب صنعتیں، جن کا ذکر تاریخوں میں آیا ہے، لیکن تفصیلات مفقود ہیں۔ معلوم نہیں کہ وقت کی صحت قائم رکھنے کے لئے وہ کس طریقے سے جانچ پرتال کرتے رہتے تھے۔

ایپرچس اور بعض دیگر قدما کے مشاہدات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے وقت کا شمار　　　صحت سے بہت قریب تھا۔ لیکن یونانیوں نے اپنے مشاہدات کو قلمبند کرنے میں صرف گھنٹوں سے کام لیا ہے۔ وہ ان کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں کہ "فلاں مشاہدہ تیسرے گھنٹے کے وسط میں واقع ہوا" یا "رات کے $\frac{1}{2}$ ۸ گھنٹے میں" وہ ثانیہ، ثالثہ، رابعہ، خامسہ، سادسہ وغیرہ کا ذکر نہیں کرتے جن کے تذکرہ سے عرب علمائے ہیئات کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

اہل ہند میں وقت کی نہایت دقیق تقسیمیں مروج تھیں، اور دن بہت سے لطیف اجزا میں تقسیم در تقسیم ہوتا چلا جاتا تھا، دنیا کی کوئی قوم اُن سے اس بارہ میں سبقت نہیں لے گئی۔ لیکن اس کا اندازہ مشکل ہے، کہ یہ تقسیمیں کب سے رائج ہیں اور زیادہ چھوٹی تقسیموں سے کس حد تک کام لیا جاتا تھا۔ یا وہ محض علمائے ہیئت کے کام میں آتی تھیں۔

وقت کے تعین میں ایک بڑی پیش قدمی عرب علمائے ہیئت نے کی جنہوں نے وقت کے شمار کے لئے بہتر طریقے تلاش کئے۔ نویں صدی عیسوی کے آغاز میں بغداد کے فاضل منجم احمد بن عبداللہ حبش نے ارتفاع شمس درجوں میں معلوم کیا، جو خیال کیا جاتا ہے کہ تاریخ میں اس طریق پر تعین وقت کی پہلی مثال ہے۔ بعد میں اسی عمل کو دوسرے عرب علماء نے خامسوں سادسوں کی حد تک کیا ہے۔

اور انہیں کے اتباع میں اس کا رواج یورپ میں بھی پندرہویں صدی عیسوی سے ہوا۔

(۴)

وقت کے مروجہ شمار میں معمول یہ ہے کہ دوپہر کو مرکزی نقطہ مان کر اس سے پہلے اور اس کے بعد بارہ بارہ گھنٹے شمار کئے جاتے ہیں۔ علمائے ہیئات ۲۴ گھنٹے مسلسل گنتے ہیں اور سہولت کے لئے ریلوے وغیرہ میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو ان کے نظام اوقات میں رائج ہے۔

کرۂ ارض کی گردش محوری کے سبب سے رات دن پیدا ہوتے ہیں، لیکن جس وقت اس کا ایک حصہ روشن ہوتا ہے، اس وقت دوسرا حصہ تاریک رہتا ہے۔ تمام کرہ ارض پر صبح شام اور رات کا یکساں وقت نہیں رہتا۔

اس وقت کو دیکھتے ہوئے عرصہ سے یہ خیال درپیش ہے کہ دنیا میں یکساں وقت معین ہو سکتا ہے یا نہیں؟

فی زمانہ علمائے ہیئات رصدخانہ گرینچ Greenwich کا وقت کام میں لاتے ہیں۔

۱۸۸۴ء میں ریاستہائے متحدہ میں ایک بین الاقوامی مجلس کی قرارداد سے تمام کرۂ ارض کو پندرہ پندرہ درجے کے دائروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جن میں سے ہر ایک درجہ میں ایک ایک گھنٹے کا فصل ہے۔ ہر مقام کے لئے یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ وہ قریب ترین درجے کے لحاظ سے اپنا وقت قرار دے۔ چنانچہ متمدن ملکوں میں اس وقت اسی طریق پر وقت کا حساب لگایا جاتا ہے۔

وقت شماری کے مختلف طریقوں کو دیکھ کر ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ ایک معیاری وقت اور اس کے حساب لگانے کا ایک یکساں اصول منضبط ہو کر رائج ہو جائیں، لیکن دوسری اصلاحات کی طرح یہ خیال بھی مجتمعہ و مشترکہ کوششوں کا منتظر ہے۔

(۵)

"یوم الراحت"، تعطیلات، عیدوں، جشنوں، اور سعد و نحس ایام کی بحث بھی دن کے تذکرہ سے وابستہ ہے۔

دنیا کی مختلف قوموں میں ہفتے یا وقت کی دوسری معینہ مدتوں میں سے ایک دن تعطیل اور آرام کا ہوتا ہے۔ مثلاً یہودیوں میں وہ دن شنبہ کا ہے، عیسائیوں میں اتوار کا اور مسلمانوں میں جمعہ کا۔

بعض قوموں میں وہی دن جو بازار یا میلے کا ہوتا ہے کاروباری ضروریات پورا کرنے، اور آرام و تعطیل کے لئے کام میں آتا ہے۔

عیدوں اور جشنوں کا طریقہ انسان نے زندگی کی قیود، اور روزمرہ کے کاموں سے آزادی حاصل کرنے کیلئے اختیار کیا تھا۔

کچھ تیوہار مُردوں کی یاد میں ہوتے تھے، کچھ اجرام سماوی، و دیگر مظاہر قدرت اور دیوتاؤں کے اعزاز میں، کچھ موسموں کے تغیر و تبدل سے تعلق رکھتے تھے، کچھ فصلوں اور پھلوں کی تیاری سے۔ وہ سب خوشیاں منانے، کھانے پینے، ناچنے گانے یا خیرات و عبادت میں صرف ہوتے تھے۔

ان میں سے بعض اب تک زندہ ہیں، اور بعض، جیسا کہ قدیم ایرانیوں کا جشن نوروزی، محض یادگار زمانہ رہ گئے ہیں۔

دوسری قسم کے تیوہار جو جمہوری اور سیاسی تصورات سے پیدا ہوئے۔ مثلاً کسی بڑے قومی و ملکی واقعہ یا کسی نامور کی یاد میں، وہ بیشتر زمانہ مابعد سے تعلق رکھتے ہیں۔

بلاشبہ ہمارے زمانہ میں تیوہاروں میں زیادہ سنجیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ اور ان کو اس جوش و خروش سے نہیں منایا جاتا جس سے وہ پہلے منائے جاتے تھے۔

قدیم انسان ایسے موقعوں پر آزادی پاکر وارفتہ ہو جاتا، اور بچوں کی طرح کھیلنے لگتا تھا، زیادہ شائستگی پاکر بھی وہ ان کا لطف اٹھاتا رہا۔

کیا ہمارے زمانہ کی سنجیدگی بھی ردعمل چاہتی ہے؟ کیا عجب ہے کہ کبھی انسان اپنی تعطیلات کو راحت و نشاط کی دلچسپ ترین ساعتوں میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جائے؟

(۶)

ابتداءً مذہب و توہمات ایک ہی پایہ رکھتے تھے اور بعض توہمات آج تک زندہ ہیں۔

مثلاً سعد و نحس ایام کا خیال لوگوں میں اب تک چلا جاتا ہے۔ پچھلے زمانہ میں اب سے زیادہ تھا، اور قدیم انسان کی تاریخ تو اس قسم کے خیالات سے بھری پڑی ہے۔

ان خیالات نے آدمی کو عجیب و غریب باتوں میں مبتلا رکھا۔ انسان کلائن کی زندگی پر بڑا اثر پڑتا رہا۔

قدیم مصریوں، کلدانیوں اور دوسری قوموں کی تاریخ اُٹھا کر دیکھو تو متحیر ہو کر رہ جاؤ گے کہ اُن کی زندگی کا کتنا حصّہ ان توہمات کی نظر ہو جاتا تھا۔

ہر دن اور ہر گھڑی اُن کی نظر میں سعد یا نحس تھی۔ ہر وقت انسان سعادت کی جستجو اور نحوست سے نبرد آزمائی میں مصروف تھا۔ زندگی کا ایک حصہ مظاہر قدرت، اور بے شمار دیوتاؤں کے سامنے سربسجود رہنے اور دعاؤں، منتروں اور تعویذوں میں صرف ہو جاتا تھا۔

زندگی کے اس نظام کو قائم رکھنے اور مذہبی مراسم کو ادا کرنے کے لئے وقت کا شمار درکار تھا۔

اُن کے پوجاری اُن کے رہبر تھے، جو........ اُن کی اس زندگی کا نظام رکھتے تھے۔

اُس کو منضبط رکھنے کے لئے وقت کی تمام چھوٹی بڑی تقسیمیں وجود میں آئیں۔

یہ سب توہمات کی بدولت پیدا ہوئیں۔

سچ ہے:۔

"مشیت کے کام کرنے کے طریقے پُراسرار پیچیدہ اور حیرت انگیز ہیں!"

سیّد حسن برنی بی۔اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

غزل

فنا کیا ہے؟ بس احساسِ خودی کا دُور ہو جانا
صدائے ہر نفس کا نعرۂ منصُور ہو جانا

بنائیں دیدۂ حیراں کو آئینہ، تماشائی
کمالِ ذوقِ نظّارہ ہے خود منظُور ہو جانا

محبت میں شکستِ اوّلیں کیا حیرت افزا تھی
نگاہوں کا وہ لڑنا، شیشۂ دل چُور ہو جانا

اگر ہے صرف ترکیبِ عناصر پردۂ حائل
تو کیا مشکل ہے اسکا درمیاں سے دُور ہو جانا

اُدھر پیہم کسی کے جلوۂ رنگیں کی ارزانی
اِدھر قیدِ تعیّن سے مرا مجبُور ہو جانا

کہاں تسکینِ خاطر ہو، ہوا جھوٹی تسلی سے
ہنسی ہے! چارۂ دردِ دلِ رنجُور ہو جانا

طلسمِ فکر ہے انساں کی نیرنگیٔ فطرت
کبھی مختار ہو جانا کبھی مجبُور ہو جانا

نہ ہوں لب آشنا جوشِ و خروشِ دل سے اے کوکب
کہ آئینِ وفا میں ننگ ہے منصُور ہو جانا

کوکب شاہجہانپوری

بے سر کی لاش

(سراغ رسانی کے کمالات)

اپنے پیشہ کے طویل تجربات نے مجھے اس بات کا عادی بنا دیا تھا کہ شمالی ہند کے محکمۂ تفتیش جرائم کا حاکم اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے مجھ سے جو شخص بھی ملاقات کرنے کیلئے آئے اُس کی گفتگو بہت صبر و تحمل کے ساتھ سنوں، اگرچہ اکثر اوقات میرا قیمتی وقت انہی ملاقاتوں کی نذر ہو جاتا تھا اور مشورہ کرنے والے لوگ مجھے نہایت معمولی معمولی باتوں کے لئے دق کیا کرتے تھے مگر میں بہت خندہ پیشانی کے ساتھ ان کی باتیں سُنا کرتا تھا۔ اس قسم کے بیانات سننے کے دوران میں میں بعض ضروری یادداشتیں بھی ضبط کرتا جاتا۔ میں نے ان یادداشتوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کرکے ایک علیحدہ فائل میں جمع کر دیا تھا، اور ان میں سے بعض تو بعد میں بہت ہی اہم ثابت ہوتی تھیں، خود مجھے بعض دفعہ تعجب ہوا کرتا تھا کہ ان جمع شدہ یادداشتوں میں مجھے بعض ایسے ایسے اہم واقعات کے حوالے ملے ہیں کہ اگر میں ان کی مدد سے تو گیر معاملات پر روشنی نہ ڈال سکتا تو وہ آج تک یونہی پردۂ خفا میں چھپے رہتے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ گو دنیا کے معاملات بہت پیچیدہ اور گومگو ہوتے ہیں مگر جہاں تک جرائم پیشہ لوگوں کا تعلق ہے ان میں بعض عادات و اطوار مشترک اور عالمگیر نوعیت کے پائے جاتے ہیں۔ پس جرائم کا مطالعہ کرنے کے سلسلے میں ان حقائق کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ واقعات کی کڑیاں ملانے میں یہ بڑے ممد ثابت ہوتے ہیں۔

یہی واقعہ شیر گل کی واردات کے سلسلہ میں پیش آیا تھا۔ ایک دن میں اپنے دفتر واقع چاندنی چوک دہلی میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفتر نگراں نے آکر مجھے اطلاع دی کہ "جناب ایک طالبعلم جو مخمور معلوم ہوتا ہے، آپ سے ملاقات کا طالب ہے اور ———"

میں نے اسے اشارہ کیا کہ اُسے اندر لے آؤ۔ چنانچہ وہ باہر گیا اور تھوڑی دیر بعد اپنے ہمراہ ایک نوجوان کو لایا جو قدم قدم پر لڑکھڑاتا ہوا اس ڈیسک کے قریب آیا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔

یہ نوجوان جسیم تھا، اعضا متناسب تھے۔ لباس گو صاف تھا مگر بہت بے ترتیب۔ میں نے اُسے بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا اور پھر پوچھا "کیا چاہتے ہو۔"

"سب کچھ ——— اور پھر کچھ بھی نہیں۔"

"اگر آپ کچھ سو لیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ آپ کا دماغ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔"

"ہرگز نہیں ——— معاملہ بہت سنجیدہ ہے۔"

"تو پھر جلد بیان فرمائیے۔"

(۲)

اس نے کہانی کریوں بیان کرنا شروع کیا کہ ایک دن میں نے اخبار میں پڑھا کہ ایک شخص کو دو ماہ کے لئے عارضی طور پر ایک طالبعلم کی ضرورت ہے جو کلرک کا کام دے سکے۔ میں نے سوچا کہ ایسے مواقع بہت کم میسر آتے ہیں اس لئے یہاں قسمت آزمائی کرنی چاہیئے چنانچہ میں مذکورہ پتہ پر پہنچا اور مشتہر سے ملاقات کی۔ یہ شخص ایک دولتمند اور خوشحال آدمی معلوم ہوتا تھا اس نے مجھے دیکھکر خوشنودی کا اظہار کیا اور چالیس روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔

تمام کام حسب دلخواہ تھا، اور میں اپنے فرائض منصبی ادا کر رہا تھا۔ لیکن افسوس چند دن کے بعد یہ محسوس ہونا شروع ہوا کہ میرا آقا کچھ عجیب و غریب واقع ہوا تھا اور اس کے حرکات و سکنات بہت غیر معمولی تھے یعنی وہ اکثر میری طرف گھورتا اور بعض اوقات میرے جسم کو چھوا کرتا تھا۔ مجھے اس قسم کی حرکتوں سے کسی قدر تشویش ہونے لگی۔ میرا آقا مجھ سے اکثر پوچھتا تھا کہ تمہارے جسم پر کوئی تل تو نہیں اور میں جواب دیتا تھا نہیں۔

آپ اس جملہ پر ہنسینگے مگر خیر مجھے واقعہ کی تفصیل بیان کرنی ہے۔ اس لئے کوئی بات بغیر بتائے نہ جاؤنگا۔

"ایک دن ہم لاہور روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے، دونوں کے رہنے کے لئے ایک ہی کمرہ کرایہ پر لیا گیا تھا، دوسرے دن ہم شہر میں اپنا کام کاج کرکے رات کو ہوٹل واپس آئے تو میں بہت

تھک گیا تھا اور سونا چاہتا تھا اس لئے کپڑے اتار کر پلنگ پر جا لیٹا۔ میرا آقا خطوط لکھنے بیٹھ گیا مگر یکایک مجھے مخاطب کر کے بولا:۔

" ذرا میرا کوٹ پہنکر دیکھو۔ اگر تمہارے ٹھیک آجائے تو میں تمہیں دیدونگا "

آپ جانتے ہیں طالبعلموں کی آمدنی محدود ہوتی ہے اور وہ اتنے قیمتی کوٹ نہیں بنوا سکتے۔ اس لئے مجھ جیسے غریب طالبعلم کی رال ٹپک پڑی اور سوچنے لگا کہ لاؤ پہنکر تو دیکھو اگر درست نکلا تو ایک کوٹ ہی مفت میں ہاتھ آئیگا۔ چنانچہ میں نے اس کا کوٹ لیا اور پہن کر دیکھا جو میرے جسم پر بہت ہی ٹھیک اور درست تراش کا نکلا گویا میرے ہی جسم کے لئے بنایا گیا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھ سے کہنے لگا " یہ کوٹ تم ہی لیلو "

اس کے بعد میں سو گیا اور نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر تک سوتا رہا کہ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص میری طرف گھور رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے اپنی پلکیں اوپر کو اٹھائیں اور کن انکھیوں سے دیکھا کہ میرا آقا ہی میری طرف گھور رہا تھا میں نے یہ دیکھکر آنکھیں اس طرح بند کر لیں کہ بظاہر معلوم ہو کہ سو رہا ہوں مگر درحقیقت میں اس کی حرکات و سکنات کو دیکھ سکتا تھا۔ اسے اپنی نیند کا یقین دلانے کے لئے میں نے زور زور سے خرّاٹے لینے شروع کر دیئے۔ وہ میری طرف کامل دس منٹ تک گھورتا رہا پھر مجھے نگاہ کے سامنے رکھے ہوئے اپنے سوٹ کیس کے قریب پہنچا اس کا ڈھکنا اٹھایا اور اس میں سے دو چاقو اتنے لمبے لمبے نکالے۔ (طالب علم نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور چاقوؤں کی لمبائی بتائی) یہ تمام کام اس نے بہت آہستہ آہستہ انجام دئیے تاکہ میری نیند اچاٹ نہ ہو جائے۔

میں یہ نظارہ دیکھکر سر سے پاؤں تک لرز گیا اور خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگا اور فوراً پلنگ پر سے کود کر اٹھا، پاجامہ کس کر باندھا اور دوڑ کر کمرہ کا دروازہ کھول کر باہر نکل بھاگا اور سیدھا سٹیشن پہنچا خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس وقت میرے پاس کچھ دام موجود تھے جو اس آڑے وقت میں کام آئے۔"

میں نے پوچھا " تمہیں کس چیز سے خوف آیا۔

" قتل سے، ورنہ چاقو کا کیا مطلب ہو سکتا ہے ؟ "

" مگر تمہیں قتل کر کے اسے کیا نفع ہوتا ؟ "

" نہیں جناب اُسے ضرور کسی نہ کسی نفع کی امید ہو گی مجھے اس کا کامل یقین ہے اس کی نگاہیں اس بات کو ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ دو شخصیتوں کو باہم مدغم (گڈمڈ) کرنا چاہتا تھا یعنی یہ کہ میں تو وہ ہو جاؤں اور وہ، میں "

" صاحب زادہ! میرا خیال ہے کہ تم واقعات کو گڑبڑ کر کے ملانا چاہتے ہو، بھلا اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ " میں وہ ہو جاؤں اور وہ، میں " ذرا سوچو عقل استعمال کرو کیا تمہیں اس کا الہام ہو گیا تھا؟ "

" الہام کیا معنی ؟ اور میں اپنا سامان جو وہاں چھوڑ آیا تھا ——— "

" سامان کیا چھوڑ آئے ؟ "

" ایک تو صابن کا بکس تھا ——— "

" اور ؟ "

" ایک ہینڈ بیگ اور وہ کوٹ جو اس نے دیا تھا "

میں نے اس مسئلہ پر کچھ غور کیا اور پھر اس سے سوال کیا کہ جب تم کلرک کی اسامی پر کرنے کے لئے آمادہ ہوئے تھے تو کس پتہ پر گئے تھے یعنی تمہارے مشتہر کا کیا پتہ تھا ؟ "

" اس وقت تو یاد نہیں رہا کہ وہ پتہ کیا تھا ——— مگر تھوڑا سو لوں تو، شاید دماغ صحیح ہو جائے اور حافظہ کام کرنے لگے، مگر کل سوچ کر بتاؤنگا "

میں نے یہ دیکھ کر کہ اب طالبعلم سے کچھ مزید معلومات دستیاب نہ ہو سکتی تھیں، میں نے اُسے خدا حافظ کہا اور وہ دفتر سے چلدیا۔

(۳)

لاہور کے محکمۂ تفتیش جرائم کے انسپکٹر اعلیٰ مسٹر دلاور نے مجھے ٹیلیفون کیا اور میں پیغام سننے کے لئے مصروف ہو گیا " جناب معاملہ بہت پیچیدہ ہے " (وہ بیان کر رہے تھے) " یعنی یہ کہ لاہور کے ایک ہوٹل کے تنور میں سے ایک لاش دستیاب ہوئی ہے۔ یہ ایک بہت عمدہ کپڑے کا کوٹ پہنے ہوئے ہے۔ جس کی تراش بھی فیشن ایبل ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ لاش کو جلانے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ نیز اس کی صورت کو بھی بگاڑا گیا ہے تاکہ شناخت نہ ہو سکے مثلاً یہ کہ دونوں رخساروں کو خنجر سے چیر ڈالا ہے۔ کان کتر لئے ہیں اور پیشانی کی کھال بھی اکھاڑی گئی ہے۔ کوٹ کی دیکھ بھال سے معلوم ہوا ہے کہ وہ دہلی میں کسی درزی کی دوکان (جس کا نام " کریم اینڈ کو " ہے) میں سلوایا گیا تھا۔ آپ فوراً اس دوکان پر تحقیقات شروع کر دیجئے میں آج رات کے ایکسپریس سے اپنا سرجنٹ بھیج رہا ہوں وہ کوٹ کے کپڑے کا نمونہ دکھا بیگا نیز جس اور مدد کی ضرورت ہوگی وہ بھیجیگا۔

آپ ذرا توقف کیجئے میں کوٹ کا ناپ بتاتا ہوں "۔

میں نے تھوڑی دیر تک انتظار کیا جس کے بعد ولاور نے کوٹ کا ناپ بیان کرنا شروع کر دیا۔ اور میں نے انہیں نوٹ کر لیا۔ میں نے تمام واقعہ سننے کے بعد ولاور سے کہا کہ میں ہر مدد کے تیار ہوں نیز اگر کسی اور بات کے معلوم کرنے کی ضرورت ہوئی تو میں ٹیلیفون کر دونگا۔

یہ کہکر ٹیلیفون کا ریسیور رکھ دیا۔ اور فوراً کریم اینڈ کمپنی کے مالک کریم بخش صاحب کو بلوایا جن سے میں پہلے ہی سے واقف تھا جب انہیں اس کوٹ کا ناپ، شکل وغیرہ تمام شناختیں بتائی گئیں تو انہوں نے کہدیا کہ اس قسم کا کوٹ حال ہی میں ان کی دوکان پر ایک سول انجنیر جناب شیر گل صاحب کے لئے بنایا گیا تھا جس کی اُجرت پندرہ روپے وصول ہوئی تھی۔

شیر گل کا نام میرے لئے دلچسپی کا باعث ہوا کیونکہ میرے کان اس نام سے پہلے ہی آشنا ہو چکے تھے۔ مجھے اور پبلک کو شیر گل کا نام اس وجہ سے معلوم ہوا تھا کہ اس شخص نے صابن سازی کی ایک مصنوعی فرم قائم کر کے بہت سے متمول اور سادہ لوح، افراد سے روپیہ اینٹھا تھا اور بعد میں روپوش ہو گیا تھا اور وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے تھے۔

میں اس شخص کو بھول نہ سکتا تھا کیونکہ اس کی اس حرکت نے میرے دل و دماغ پر ایک ناگوار اثر چھوڑا تھا اور میں نے اول روز سے اُسے "سپید پوش مجرموں" کے زمرہ کا ایک فرد سمجھ لیا تھا۔ ہمارے دفتر میں اس شخص کا فوٹو اور اس کے ہاتھ کی تحریر کا نمونہ بھی موجود تھا اور ہم کئی مہینے سے اس کی تلاش میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ میں نے یہ معلومات حاصل کر کے فوراً ولاور کو ٹیلیفون کیا اور اسے سب حالات سے مطلع کر دیا نیز یہ بھی بیان کر دیا کہ میں ذاتی رجحان اور چند دلائل کی بنا پر مقتول کو شیر گل تصور نہیں کرتا یعنی تنور میں مسخ شدہ چہرہ کا جو شخص برآمد ہوا وہ اصل میں شیر گل نہیں بلکہ کوئی اور تھا کیونکہ اُسے شیر گل کا کوٹ پہنا کر اور چہرہ کو بگاڑ کر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مقتول کی شناخت نہ ہو سکے اور قاتل کے متعلق کوئی علم نہ ہو اور یوں پولیس کو اُلّو بنایا جائے۔ میرا اشتباہ اس وجہ سے اور بھی بڑھ گیا کہ شیر گل کے دائیں رخسار پر ایک تل تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ لاش کے دونوں رخسارے چیر دیئے گئے تھے۔

(۴)

لاہور سے بھیجا ہوا سارجنٹ کوٹ کے کپڑے کا نمونہ لیکر دفتر میں آ پہنچا اور واقعہ کی تفصیل بیان کرنی شروع کر دی۔ دورانِ گفتگو میں ایک نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ تحقیقات کرنے پر مقتول کے کمرہ میں سے دو چاقو اور ایک صابن کا بکس بھی دستیاب ہوا تھا جو چاندی کا بنا ہوا تھا جس کے ڈھکنے پر "ق" کھدا ہوا تھا۔

چاقو اور صابن کے نقرئی ڈبے نے میرے تمام خیالات شرابی طالبعلم کی طرف منعطف کر دیئے اور ایک ایک کر کے تمام واقعات یاد آتے چلے گئے، اس نے بھی یہی بیان کیا تھا کہ وہ چاقو اور صابن کا ڈبہ چھوڑ کر بھاگا تھا۔

یہ طالبعلم میرے پاس اپنا نام و پتہ درج کرا گیا تھا۔ میں نے فوراً اُسے ایک رقعہ لکھا اور دفتر میں طلب کیا، اس سے پہلے کہ وہ آتا میں نے ایک دفعہ ان یادداشتوں کو پڑھا جو اس سے ملاقات کرنے کے دوران میں حسب عادت نوٹ کر لی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد طالبعلم ایک سادہ لباس کے کانسٹیبل کے ہمراہ کمرہ میں داخل ہوا۔ اس کی حالت اس وقت بھی پریشان تھی، بال بکھرے ہوئے تھے۔ صورت سے بوکھلاہٹ کا اظہار ہوتا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھ سے بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا اور وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ •

"اس صابن کے ڈبہ کی وضع قطع بتاؤ جو تم لاہور کے کسی ہوٹل میں واردات کی رات کو چھوڑ کر بھاگے تھے"؟

"جناب اس وقت تو اس شخص کا پتہ یاد نہیں آتا، بھول گیا"۔

"تم بھی عجیب احمق آدمی ہو، میں پوچھ رہا ہوں کہ ڈبہ کیسا تھا۔ تم کہہ رہے ہو کہ اس کا پتہ یاد نہیں!؟"

"معمولی قسم کا صابن رکھنے کا ڈبہ تھا، ڈھکن لگا ہوا تھا"۔

"ڈبہ پر کچھ لکھا ہوا تھا؟"

"لکھا ہوا تو کچھ نہ تھا مگر ہاں ایک حرف کھدا ہوا تھا"۔

"کونسا حرف تھا؟"

"ق!"

"صرف ق ہی کیوں تھا؟ کوئی اور حرف کیوں نہ تھا؟"

"اصل میں وہ بکس میرا نہ تھا بلکہ ایک دوست قربان علی کا تھا — میں عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ اس کا ڈبہ واپس کر دوں مگر فرصت نہیں ملتی تھی"۔

"یاد کر کے اس پتہ کو معلوم کرو جس پر تم کلرک بننے کے لئے گئے تھے"۔

"کاش اس وقت یاد آجاتا مگر افسوس حافظہ بہت کمزور ہو گیا ہے!"

طالبعلم نے اپنا سر کھجایا۔ آنکھیں جھپکائیں، پیشانی بھینچی اور پھر دفعتاً

بولا۔ "ہاں! ہاں! یاد آگیا! دیکھو کچھ کچھ سمجھ میں آتا ہے!"

"کیا ہے؟"

"سڑک فیض بازار پر تیسرا مکان! نمبر مطلق یاد نہیں رہا مگر میں آپ کو اس جگہ بخوبی لیجا سکتا ہوں"

"اچھا، چلو"

ہم سائیکلوں پر روانہ ہوئے اور فیض بازار پہنچے، طالبعلم ایک مکان کے سامنے پہنچکر رُک گیا۔ یہ مکان کیا تھا ایک مختصر سرائے تھی۔ مختلف لوگ کوٹھریوں اور کمروں میں کرایہ پر رہا کرتے تھے۔ گویا ایک مختصر بورڈنگ ہاؤس تھا، جس کا انتظام ایک عیسائی بیوہ مسز ہوور کے ہاتھوں میں تھا۔

مسز ہوور نے طالبعلم کو دیکھ کر فوراً پہچان لیا اور اس سے پوچھا کہ بہادر (یعنی جس نے کلرک کے لئے اشتہار دیا تھا) کا کیا حال ہے؟

عورت نے بتایا کہ بہادر نامی ایک شخص اس کے احاطہ میں رہا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اسے کلرک کی ضرورت ہوئی تھی تو اخباروں میں اشتہار دیا تھا جس کے جواب میں بہت سی درخواستیں آگئی تھیں مگر انتخاب اس ہی طالبعلم کا ہوا تھا ——— (کیوں؟ عورت اس کا جواب نہ جانتی تھی)

ایک ہفتہ بعد (عورت کا بیان تھا) وہ مع اس طالبعلم کے لاہور روانہ ہوگئے مگر...... کوئی ایک ہفتہ بعد وہ واپس آگیا اور ایک کلرک کے لئے دوبارہ اشتہار دیا، چنانچہ اب کی دفعہ پھر بہت سی درخواستیں آئیں اور بالآخر اُن میں سے ایک طالبعلم کو منتخب کرلیا گیا اور وہ حسب معمول پھر لاہور روانہ ہوگیا۔

میں نے جیب میں سے ایک فوٹو نکالا اور عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "دیکھنا کیا یہ شخص بہادر ہے؟"

"ہاں! یہی تو ہے!" عورت کا بے ساختہ جواب تھا۔

(۵)

اب مجھے کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا کہ انارکلی کے ہوٹل کا قتل شیر گل کا فعل تھا ——— مگر سوال یہ ہوتا تھا کہ اس خوفناک قتل کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ انتقام تو تھا نہیں کیونکہ وہ طالبعلم سے پہلے سے واقف نہ تھا۔ اسی طرح چوری کی دلیل بھی غیر معقول بات ہے، مگر پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ قاتل نے اپنا کوٹ مقتول کو کس غرض سے پہنایا تھا پھر اس کا چہرہ کیوں بگاڑ دیا؟

یہ باتیں تھیں جن پر غور کر رہا تھا کہ یکایک لاہور سے ٹیلیفون ہوا اور میں پیغام سننے میں مصروف ہوگیا۔ دلاور صاحب کہہ رہے تھے :—

"آپ کو اپنا خیال بدلنا پڑیگا، لاش کو مقتول کے وارثوں نے دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ لاش محمد شیر گل خاں ہی کی ہے ——— میرا اندازہ تو یہ ہے کہ آپ کو قاتل کی تلاش کے لئے کسی اور جگہ مرکز بنانا پڑیگا۔"

میں نے دلاور کو یقین دلایا کہ شیر گل کے رشتہ داروں کی شناخت اور ان کے رنج و غم پر مطلق بھروسہ نہ کیا جائے ——— یہ بھی ایک چال معلوم ہوتی ہے میں اپنے خیال پر قائم ہوں۔

میں نے دہلی کے تمام سکولوں اور کالجوں کے پرنسپلوں اور ہیڈ ماسٹروں کے نام سرکلر جاری کردیئے کہ وہ جلد سے جلد ان طالبعلموں کی فہرستیں مہیا کریں جنہوں نے واردات سے پندرہ دن پہلے تک رخصت کے لئے درخواستیں بھیجی ہوں۔ چنانچہ درخواستوں کے متعلق تفصیلات آگئیں اور مجھے معلوم ہوا کہ تیس طالبعلموں نے درخواستیں دی تھیں۔ میں نے آئندہ کارروائی کرنے کے لئے صرف دو طالبعلموں کو منتخب کرلیا کیونکہ صرف وہی دو تھے جنھوں نے لاہور جانے کے لئے چھٹی مانگی تھی۔

تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ ان دونوں طالبعلموں میں سے ایک شخص واپس آچکا تھا مگر دوسرا واپس نہ آیا تھا کیونکہ اُسے ایک عارضی کلرک کی جگہ پر دو ماہ کے لئے اسامی مل گئی تھی اور وہ لاہور ہی رہنا چاہتا تھا، جس وجہ سے اسے دو ماہ کی رعایتی رخصت دیدی گئی تھی۔

میں اس بورڈنگ ہاؤس کے نگران سے ملا جس میں یہ غائب شدہ طالبعلم رہا کرتا تھا، انھوں نے مجھے اس کا کمرہ دیکھنے کی اجازت دیدی اور میں نے اس کے کمرہ میں پہنچکر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس کی خط و کتابت کا فائیل دیکھنا شروع کیا۔

خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ وہ شخص ایک یتیم تھا جس کا کوئی قریبی رشتہ دار زندہ نہ تھا۔ صرف ایک چچی تھی جو گوداسپور میں ایک مختصر جائیداد پر گزر اوقات کررہی تھی۔ میں نے اتنی معلومات حاصل کرکے فوراً ایک ہوشیار سراغرساں بھیج دیا تاکہ اس سے مل کر مزید حالات دریافت کرسکے۔

سراغرساں واپس آیا اور بیان کیا کہ عورت یعنی طالبعلم کی چچی نے دہلی سے چلا ہوا ایک خط وصول کیا تھا جو اس کے بھتیجے نے بھیجا تھا۔ اس واقعہ کو پندرہ دن ہوگئے ہیں۔

اس خط میں مذکور تھا کہ چونکہ اسے عارضی کلرک کی ایک جگہ مل گئی ہے اس وجہ سے وہ لاہور جارہا ہے۔ خاتون نے سراغرساں کو بتایا تھا کہ اس کی تعلیم اس وقت تک ہرگز مکمل نہ ہوئی تھی نیز یہ کہ چونکہ اس کا باپ اپنے بیٹے کو عمدہ تعلیم دلوانے کا متمنی تھا اس وجہ سے اس نے

لندن کے بنک میں پچھتر ہزار روپیہ اس غرض سے جمع کرا دیا تھا کہ ہندوستان میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد برطانیہ کے دارالحکومت لندن جائے اور وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے۔

(۶)

میرے دماغ میں اب دو حقیقتیں راسخ ہوگئی تھیں یعنی یہ کہ علی خاں نام طالبعلم اصل مقتول تھا اور شیر گل قاتل مگر "پہلے شخص کے قتل سے دوسرے کو کیا نفع پہنچ سکتا تھا؟" یہ ایک ایسا سوال تھا جو مجھے ہر مرتبہ پریشان کر رہا تھا اور جس کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

پچھتر ہزار روپے کی رقم بھی قابل لحاظ تھی کیونکہ جبتک اس نے علی خاں کو نوکر نہ رکھا ہوگا اس سے پیشتر اسے کیسے معلوم ہوا ہوگا کہ اس کا روپیہ جمع ہے۔ یہ بات بیشک قابل لحاظ تھی کہ اس کا تقرر جسمانی ساخت کی وجہ سے کیوں ہوا؟ یعنی جب اسے کلرک کی جگہ پر متعین کیا گیا تھا تو اس بات کا کیوں لحاظ رکھا گیا کہ اس کا جسم ایسا ہی ہو جیسا کہ ملازم رکھنے والے کا تھا پس ظاہر ہے کہ طالبعلم کی موت سے شیر گل کو یقیناً کسی قسم کے فائدہ کی امید تھی اور وہی قتل کی محرک تھی۔

میں نے اس سے منطقی نتائج اخذ کئے اور اپنا کام شروع کر دیا یعنی دہلی اور لاہور کی اُن تمام بیمہ کمپنیوں کے نام سرکلر جاری کر دیئے جو زندگی کا بیمہ کرتی تھیں۔ چنانچہ نتیجہ وہی ہوا جس کی توقع تھی یعنی "گریٹ لائف انشورنس کمپنی آف پنجاب لاہور" کے مینیجر نے جواب دیا کہ شیر گل نام ایک شخص نے اپنی جان کا پچیس ہزار کا بیمہ کرا رکھا تھا۔

اب معاملہ بالکل صاف ہوگیا یعنی شیر گل نے ایک شخص کو قتل کیا جس کا جسم اس کے جسم سے مشابہ تھا، اسے اپنا کوٹ پہنایا۔ چہرہ مسخ کر دیا تاکہ صحیح شناخت نہ ہو سکے۔ غرض ہر حیثیت سے اپنے آپ کو مردہ ثابت کرنے کی کوشش کی تاکہ بیمہ کمپنی سے اس کے ورثہ روپیہ وصول کر سکیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اس کی ماں نے بیمہ کمپنی سے روپیہ وصول کرنے کے لئے "پالیسی" پیش کر دی۔

اب کوئی بات تاریکی میں نہ تھی سوائے قاتل کی گرفتاری کے چنانچہ مسٹر ڈلاورنے لاہور میں شیر گل کی ماں اور بھائی کو گرفتار کر لیا مگر بھائی نے توحوالات ہی میں پھندا ڈالکر خودکشی کر لی اور ماں برابر یہی کہتی رہی کہ وہ لاش اس کے لڑکے کی ہے۔

قاتل کو گرفتار کرنے کی انتہائی کوشش کی گئی، سراغرساں اپنی تمام قوتیں صرف کر رہے تھے مگر قاتل کا کہیں سراغ نہ ملتا تھا۔ کوئی جگہ نہ تھی جہاں تلاش نہ کر لی گئی ہو مگر قاتل نہ ملنا تھا نہ ملا میں اس کی گرفتاری کی طرف سے بالکل مایوس ہوگیا تھا کہ یکایک مجھے گوردا سپور سے علی خاں کی چچی کا لکھا ہوا ذیل کا خط پہنچا:۔

جناب!

میں اپنے بھتیجے کی پُراسرار گمشدگی کے سلسلہ میں اس بات کو ظاہر کر دینا مناسب سمجھتی ہوں کہ لندن سے چلا ہوا میرے نام ایک خط آیا ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ گویا میرے بھتیجے علی خاں کا بھیجا ہوا ہے مگر مجھے اس کے اصلی ہونے میں شبہ ہے، اس لئے اس کا ملاحظہ کرنے کی غرض سے اِسے مکتوب کے ساتھ منسلک کرتی ہوں۔ اس تحریر کو کسی ماہر کو دکھایئے۔ جواب کی منتظر ہوں۔"

یہ خط لندن سے لکھا گیا تھا اور اس کے نیچے دستخط کرنے والے نے اپنا نام "علی خاں" لکھا تھا۔ خط میں مذکور تھا کہ چونکہ وہ بنک سے اپنے باپ کا جمع شدہ روپیہ نکلوانا چاہتا ہے اس لئے چند متعلقہ ضروری کاغذات و دستاویزات اسے بھیج دی جائیں۔ تاکہ روپیہ فوراً مل سکے۔"

میں نے اس خط کو اور شیر گل کی اس تحریر کو جو ہمارے دفتر میں موجود تھی ایک "ماہر تحریر" کے پاس بھیجا جس نے بیان کیا کہ دونوں تحریریں ایک ہی قلم سے نکلی ہوئی تھیں اور کوئی فرق نہ تھا پس معلوم ہوگیا کہ شیر گل لندن میں غریب طالبعلم کا روپیہ اینٹھنے کی غرض سے پہنچ چکا تھا۔

(۷)

میں نے علی خاں کی چچی کو لکھ دیا کہ وہ تمام متعلقہ کاغذات لندن بھیج دیں اور کچھ پس و پیش نہ کریں کیونکہ تمام کام حسب دلخواہ ہونے والا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے عملہ کے سب سے زبردست چالاک و مستعد سراغرساں مسٹر سروپ کو منتخب کیا اور لندن میں مطلوبہ شخص کی گرفتاری کے لئے بھیج دیا۔

سراغرساں نے لندن پہنچکر وہاں کی پولیس سے مل کر تمام انتظامات مکمل کر لئے، جنرل پوسٹ آفس سے معلوم کر لیا کہ شیر گل کو ہندوستان سے مطلوبہ کاغذات موصول ہو گئے ہیں۔ اور یہ کہ وہ عنقریب بنک سے روپیہ لینے والا ہے۔

سراغرساں بنک کے مینیجر سے ملا اور معلوم کر لیا کہ آیا ابھی روپیہ تو نہیں دیا گیا، معلوم ہوا کہ ابھی تک روپیہ یہیں موجود ہے۔ پھر سراغرساں نے اسے تمام حالات سنا کر کہدیا کہ جب وہ کاغذات پیش کرنے آئے تو اسے روپیہ

فوراً دیا جائے، گرفتاری بعد میں کر لی جائے گی۔

چنانچہ یہی ہوا، ایک دن سراغرساں کو اطلاع پہنچی کہ شیر گل نے کھڑکی میں کاغذات پیش کر دیے ہیں اور وہ عنقریب روپیہ وصول کرنیوالا ہے تم جلد آ جاؤ۔ سراغرساں نے لندن پولیس کو پہلے ہی سے بنک کی عمارت کے باہر متعین کر رکھا تھا۔ اس لئے خود اندر داخل ہوا مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ روپیہ وصول کرنیوالا شخص شیر گل سے مطلق مشابہت نہ رکھتا تھا بلکہ کوئی اور معلوم ہوتا تھا۔

بہر حال وہ شخص روپیہ لیکر باہر نکلا اور اسے فوراً زیر حراست کر لیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نقلی ڈاڑھی اور مصنوعی بال لگائے ہوئے تھا نیز چہرہ پر رنگ و روغن مل رکھا تھا تاکہ چہرہ کی صحیح شناخت نہ ہو سکے مگر جب اس کی مصنوعی زیبائش علیحدہ کر دی گئی تو جو شکل نظر آئی وہ یقیناً شیر گل ہی کی تھی!

اس سے پہلے کہ وہ پولیس کے سامنے بیان دیتا اس نے درخواست کی کہ اس رنگ کو دور کرنے کی غرض سے جو ابھی تک اس کے چہرے پر لگا رہ گیا تھا اسے اپنا منہ دھونے کی اجازت دی جائے۔ اسے اس کی اجازت دیدی گئی اور اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے جو اس کے ہمراہ تھا ایک تولیہ اور صابن کا ٹکڑا نکالا اور منہ دھونے بیٹھ گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ سپاہی جو اس کے قریب کھڑا تھا اس کا ہاتھ گھسیٹ سکتا اس نے سب کی آنکھیں بچا کر صابن کا ٹکڑا منہ میں ڈال لیا اور پانی کا ایک چلو پی گیا جس کے پیتے ہی وہ غش کھا کر گرا اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ کیونکہ صابن میں ایک سخت مہلک زہر ملا ہوا تھا۔

اس کی ماں پر اعانتِ مجرمانہ اور پولیس کو دھوکہ میں ڈالنے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ اگرچہ وہ ایک چالاک وکیل کی مدد سے رہا ہو گئی مگر اپنے اکلوتے بیٹے کی خودکشی اس کے لئے کچھ کم سزا نہ تھی!

(ماخوذ) ظفر قریشی دہلوی

غزل

(۱) شکوۂ یار ہوا جاتا ہے
دل گنہگار ہوا جاتا ہے

(۲) دیکھ لے فرطِ جبیں فرسائی
کوئی بیزار ہوا جاتا ہے

(۳) میری ناکام نگاہوں کیلئے
پھول بھی خار ہوا جاتا ہے

(۴) کام جو سہل نظر آتا تھا
اب وہ دشوار ہوا جاتا ہے

(۵) جب سے منشائے جنوں سمجھا ہوں
در بھی دیوار ہوا جاتا ہے

(۶) کیف تعزیہ گھٹا دو ھد نہ
دل خطاکار ہوا جاتا ہے

(۷) وقفِ در ہو نہ سکا سر میرا
زینتِ دار ہوا جاتا ہے

(۸) موت آسان نظر آتی ہے
جینا دشوار ہوا جاتا ہے

(۹) کس سے امیدِ کرم ہو اے راز
کیوں گنہگار ہوا جاتا ہے

راز رامپوری

دیوان غالب

آہ آتشیں

(یعنی غالب کی چوتھی غزل پر شرح)

ہمہ بوئے عود نبود کہ بہ رغبتش بسوزی
دل سوختہ است رغبت قدمے بسوے من کن (خسرو)

۱۔ دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا (شاعری)

۲۔ دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا (شاعری)

۳۔ میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا (بیان)

۴۔ عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا (بیان)

۵۔ دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا (شاعری)

۶۔ میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا (بیان)

تمہید:۔ اِس غزل میں مرزا صاحب نے آتشکدۂ دل میں آہِ آتشیں کی تباہ کن کرشمہ سازیوں پر اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ یعنی منتہائے محویتِ عشق میں دنیا اور خواہشات دنیا سے بے اعتنائی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ البتہ آخری شعر سوسائٹی کی تنقید ہے۔

عشق کی عموماً تین منزلیں ہیں۔ (۱) دل کا لگنا۔ (۲) دل کا جانا اور (۳) بے خودی۔ پہلی منزل تو ابتدا میں پُرلطف ہے اور دوسری پُراز لطف کیونکہ محبت اپنی طرف کھینچتی ہے اور دنیا اپنی طرف۔ لیکن تیسری منزل بمصداق "آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد" خیال سے بھی پرے ہے۔ اِس غزل میں عشق کی تیسری منزل کا وہ پہلو دکھایا گیا ہے جو انسان کو دنیا سے برگشتہ کر دے۔ مفہوم مسلسل ہے۔

مفہوم:۔ (۱) عشق کی سوزش سے میری تمام خواہشات آہستہ آہستہ جل کر خاک ہوگئیں۔ یعنی اُن کی کچھ وقعت ہی نہیں رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ۔

(۲) آرزوئے وصل اور یادِ یار تک دل میں باقی نہیں بمصداق:۔ "ترک دنیا، ترک عقبیٰ، ترک مولا، ترک ترک۔" یہی وجہ ہے کہ میں (۳) عدم سے بھی پرے ہوں اور اُس عالم میں ہوں جہاں:۔

نہ اثر میں بے اثری رہی نہ ثمر میں بے ثمری رہی

(۴) عام لوگوں کو تخئیل کے اِن منازل تک رسائی ہی نہیں اس لئے یہ باتیں ان کی سمجھ سے باہر ہیں۔

(۵) مردہ حسرتیں اور آرزوئیں اور خون شدہ تمنائیں جو میرے سینے میں ہیں اس عالمِ بے خودی میں بیکار ہیں۔

(۶) اہلِ دنیا کا برتاؤ دیکھ کر اپنی طبیعت اور بھی روکھی ہوگئی۔

تشریح:۔ (۱) بے محابا بمعنی بے خوف۔ آتشِ خاموش یعنی چپکے چپکے سلگنے والی آگ۔ مطلب یہ ہے کہ سوزِ عشق نے دل کی تمام خواہشوں کو جلاکر خاک کر دیا۔ مرزا صاحب کے اس شعر میں لفظی رعائتیں حکیم مومن کے اس مصرعہ سے ملتی جلتی ہیں۔ ع

"یونہی نکل گیا دم آئینہ ہچکیاں تک"

(۲) مطلب یہ ہے کہ انتہائے یاس و حرماں کی وجہ سے ہر قسم کی توقع خود بخود مٹ گئی۔

(۳) غافل۔ یعنی انسان کے مرتبوں پر آگاہی نہ رکھنے والے۔ عنقا ایک معدوم پرند مانا گیا ہے جس تک رسائی ناممکن سمجھی جاتی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ عنقا کیا میں تو عدم سے بھی پرے ہوں یعنی وجودِ مطلق میں مل گیا ہوں۔ البتہ جب درمیانی منزلوں میں تھا تو میری آتشناک آہوں نے اکثر عنقا کے پروں کو بھی جلا دیا یعنی عدم کو بھی معدوم کر دیا۔

(۴) جوہرِ اندیشہ یعنی فکر و تخئیل۔ گرمی یعنی سوز و ساز اور تیزی یعنی

اپنے سوزش بھرے ہوئے افکار کی تیزی کس جگہ بیان کروں۔ وحشت کا خیال آتے ہی جنگل میں آگ لگ گئی۔ اگر جنگل سے مراد "بزمِ مشاعرہ" ہے۔ "وحشت کے خیال" سے مراد "شرکتِ مشاعرہ ہے تو "جل جانے" سے مطلب سوا حرلیفوں کی نافہمی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

(۵) داغ اور چراغان یعنی خون شدہ آرزوئیں اور تمنائیں۔ دل یعنی احساسِ خودی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مجھ میں احساسِ خودی ہوتا تو خون شدہ آرزوؤں اور تمناؤں کی تر و تازگی دکھاتا۔ اب چونکہ احساسِ خودی نہیں تو نہ مرادیں ہیں نہ امیدیں:۔ "محبت ایک ایسی آگ ہے جو..... تمام دنیا کو جلا سکتی ہے۔" (امرسن)

(۶) افسردگی یعنی مایوسی۔ طرزِ تپاک یعنی برتاؤ۔ یہ شعر سوسائٹی کی تنقید ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اہلِ دنیا کے برتاؤ کو دیکھ کر بجائے شگفتہ خاطر ہونے کے رو کھے پن اور مایوسی کی طرف طبیعت مائل ہے۔ کیونکہ اہلِ دنیا کا برتاؤ دوستانہ نہیں بلکہ منافقانہ ہے ؎

اہلِ جہاں کا حال ہے کیا، ہم سے ؟ کیا کہیں ؟
بدگوئیاں ہیں پیچھے تو منہ پر اشارتیں (آتش)

خلاصہ:۔ یہیں کے سارے کرشمے تھے جو یہاں سے آگے پہنچ گئے۔

نہ اثر میں بے اثری نہ ثمر میں بے ثمری رہی

ماخذ:۔ احساسِ خودی باعث راحت و تکلیف ہے۔

بیان:۔ اندازِ بیان کے اعتبار سے یہ دو اشعار قابلِ غور ہیں۔

۱۔ میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

اس شعر میں مرتبۂ انسانی کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

یہ شعر اخلاق و سوسائٹی کی تنقید ہے۔

پختگیِ عشق

(یعنی غالبؔ کی پانچویں غزل کی شرح)

اور تو پاس مرے ہجر میں کیا رکھا ہے
اِک ترے درد کو پہلو میں چھپا رکھا ہے (حسرت)

۱۔ شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا (آرٹ)

۲۔ زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا (مبالغہ)

۳۔ بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا (شاعری)

۴۔ دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا (بیان)

۵۔ ہے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا (شاعری)

۶۔ دل میں پھر گریہ نے اِک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا (بیان)

تمہید:۔ اس غزل میں مرزا صاحب نے رنگِ عشق کی پختگی پر اپنے خاص انداز یعنی "اجتماعِ اضداد" کا پہلو لیکر اظہارِ خیال کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ پختگیِ عشق میں "فنا" بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی بقول اصغرؔ ؎

یہ دین وہ دنیا ہے، یہ کعبہ وہ بتخانہ
ایک اور قدم بڑھکر اے ہمتِ مردانہ

مفہوم:۔ (۱) عشق دنیا کے ساز و سامان کا دشمن ہے۔

(۲) ہماری تنگیِ دل یعنی بے اعتنائی اور بیخودی سے ذوقِ محبت بھی عاجز ہے۔

(۳) عشق و محبت کی محفل سے جو نکلا پریشان ہی نکلا۔

(۴) ہمارے کاشانۂ محبت یعنی حسرت زدہ دل سے اہلِ دل ہی اپنے ذوق کے موافق لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

(۵) ہمت والوں کو فنا یعنی "مُوتُوا قَبلَ اَن تَمُوتُوا" کی تعلیم دینا کسی فارغ التحصیل کو "الف۔ ب" پڑھانا ہے۔

(۶) ضبط کے بعد جو جذبات اُبھرتے ہیں اُن میں زیادہ جوش ہوتا ہے۔

تشریح:۔ ۱۔ مرزا صاحب نے خود اپنے ایک خط میں جو "مولوی عبدالرزاق صاحب شاکر" کے نام ہے اس مشکل غزل کے پہلے شعر کی تشریح اس طرح کی ہے:۔

"رقیب بمعنی مخالف۔ یعنی شوق سر و سامان کا دشمن ہے۔ دلیل یہ

ہے کہ قیس جو زندگی میں ننگا پڑا پھرتا تھا تصویر کے پردہ میں بھی ننگا ہی رہا۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر باتنِ عریاں ہی کھنچتی ہے۔"

اس شعر میں شوق کے معنی عشق ہیں، رقیب بمعنی مخالف، اور قیس کو مجسّم عشق تصور کرنا چاہیئے۔

(۲) اس شعر کی تشریح بھی مذکورۂ بالا خط میں اس طرح کی گئی ہے۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نئی نکالی ہے۔ جیسا کہ اس شعر میں ؎

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جسکو کہ دلکشا کہیئے

یعنی زخمِ تیر کی توہین بسبب ایک رخنہ ہونے کے۔ اور تلوار کے زخم کی تحسین بسبب ایک طاق کے کھل جانے کے۔ زخم نے داد نہ دی۔ تنگیٔ دل کی کیا داد دیتا؟ وہ تو خود ضیق مقام سے گھبرا کر پرَ افشاں اور سراسیمہ نکل گیا۔

پرَ افشاں یعنی پھڑپھڑاتا ہوا۔ پُر افشاں نہیں ہے۔ اس شعر کا مفہوم اصغرؔ کے اس شعر سے بھی ظاہر ہے ؎

تو وہ قاتل ہے کہ ہر وار ترا رحمت ہے
میں وہ زخمی ہوں کہ ہر زخم ہو اک تازہ علاج

(۳) پھول کی خوشبو، دل کی فریاد اور شمعِ محفل کا دُھواں وغیرہ ہوا سے پریشان نہیں ہوئے بلکہ تیرے عشق میں سرگرداں ہیں۔ شعر میں صنعتِ حسنِ تعلیل ہے۔

(۴) مائدہ بمعنی دسترخوان۔ لذّتِ درد یعنی لطفِ عشق بقول حضرت

دردِ دل میں جو مزا ہے وہ ہمیں جانتے ہیں
کچھ رہے یا نہ رہے کاش رہے دل باقی

مطلب یہ ہے کہ میرے دردِ دل کے دسترخوان یعنی میری شاعری سے بقدرِ ذوق و فہم احباب کو لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ مرزا صاحب کے نزدیک "شاعری" دل کو خون کرنے کی فرصت ہے: اس لئے جسکا دل چاہے اپنے ظرف کے موافق ان کے کلام سے لطف حاصل کرے

ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

(۵) مشربِ عشق میں "فنا" کی تعلیم ضروری ہے بمصداق ؎

ترک جان و ترک مال و ترک سر
در طریقِ عشق اوّل منزل است

لیکن اس تعلیم کی وقعت دشوار پسند لوگوں کے نزدیک کچھ نہیں۔

(۶) ہم نے آہ و نالہ کو ضبط کیا تھا مگر آنسو ضبط کر کے پی گئے تھے۔ وہی اب سیلاب کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

خلاصہ:- "تن، من، دھن" غرض دنیا کی ہر چیز کو محبّت پر قربان کرنا پڑتا ہے۔ سچے عاشق کے سامنے ان کی کچھ حقیقت ہی نہیں۔ بقول مولانا حسرتؔ موہانی ؎

عاشقِ دلفگار کو، بیخود و بیقرار کو
محوِ لقائے یار کو شوقِ لقا سے کیا غرض

مأخذ:- کبیر داس جی کا یہ مصرعہ اس غزل کا ماخذ ہے۔ ع

"سادھو ایسا ہو جیسا کچھ نہ ہوئے"

آرٹ:- مطلع یعنی پہلے شعر پر ایک نہایت دلچسپ تصویر بن سکتی ہے یعنی قیس کو تصویر کے پردے میں بخوبی عریاں دکھلایا جا سکتا ہے۔ اور ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ؎

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

ظرفِ عشق

(یعنی غالبؔ کی چھٹی غزل پر شرح)

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ (اقبالؔ)

۱۔ دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا (علم النفس)

۲۔ تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا (تصوف)

۳۔ تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا (علم النفس)

۴۔ دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے
اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا (شاعری)

(۵) جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا (زبان)

۶۔ احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا (شاعری)

۷۔ یہ نعش بے کفن اسدِ خستہ جان کی ہے

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا (زبان)

تمہید۔ اس غزل میں مرزا صاحب نے عشق و محبت والوں کے ظرف پر اظہارِ خیال کیا ہے اور دکھلایا ہے کہ عشق میں کامل وہی شخص کہا جا سکتا ہے جسمیں احساسِ خودی بالکل نہ رہا ہو۔

مفہوم:۔ (۱) فرہاد کی طرح دھمکی میں مرجانا خامی کی دلیل ہے۔ عشق تو ایسے مردِ میدان کا متلاشی ہے جو مصائبِ عشق برداشت کر سکے۔

(۲) فنا ہونے سے بیشتر بھی میں اپنی ذات سے فنا ہو گیا تھا۔ یعنی مجھ میں خودی کا شائبہ تک نہ تھا۔

(۳) (ابتدائے عشق میں) وفا کی خوبیوں پر غور کر رہا تھا۔ ابھی خیالات نے مجموعی حیثیت اختیار نہ کی تھی۔ (کہ میں آپ میں نہ رہا)

(۴) ایک زمانہ تھا کہ ہماری طبیعت میں رنگینی اور رعنائی تھی۔ اب پریشانی اور مایوسی کے سوا کچھ نہیں۔

(۵) غمِ عشق سے نجات حاصل نہیں ہوتی۔ خودی میں اندوہِ عشق تھا اور بیخودی میں خودی کا غم ہے۔

"وہ محبت نہیں جس میں دکھ نہیں" (ہارڈی)

(۶) دیوانہ کو مقید رکھنے سے علاجِ خبط مقصود ہے مگر دیوانۂ عشق کا خیال زنداں میں بھی بادیہ پیما رہتا ہے۔

(۷) نعش کا کفن تک سے مبرا ہونا کامل آزادی کی دلیل سمجھنا چاہیئے۔

تشریح:۔ (۱) بابِ نبرد۔ لڑائی اور نبرد آزمائی کی اہلیت رکھنے والا۔ فرہاد میں اہلیت نہ تھی۔ پہلا شعر فرہاد پر طنز ہے۔ ایک جگہ عشقِ فرہاد کی خامی پر مرزا صاحب نے اور بھی اظہارِ خیال کیا ہے ؎

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

عشق نبرد پیشہ۔ یعنی جنگجو عشق۔ طلبگار مرد تھا یعنی کسی بہادر کا خواہاں تھا۔ یعنی عشق میں مصائب کا مقابلہ ضروری ہے۔ فرہاد کی طرح دھمکی میں آکر جان دینا خامی کی دلیل ہے۔

(۲) مقابلہ ہو "مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا"۔

(۳) نسخہائے وفا یعنی وفاداری کی تدبیریں۔ ظاہر ہے کہ ابتدائے عشق میں عاشق اپنے معشوق کے ساتھ وفاداری کرنے کی مختلف تدبیریں سوچا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ:۔

کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ ابھی خیال نے متحدہ شکل اختیار نہ کی تھی کہ ہم بیخود ہو گئے۔

(۴) ساحل دریائے خون یعنی پریشان خاطری۔ گرد تھا یعنی بے حقیقت تھا۔

(۵) پہلا مصرعہ صاف ہے۔ دوسرے مصرعہ کے معنی یہ ہیں کہ جب تک دل پہلو میں رہا اُس وقت تک اندوہِ عشق گھیرے رہا۔ جب دل جاتا رہا تو دل جانے کا غم آموجود ہوا۔

(۶) بیابان نورد بمعنی بادیہ پیما۔ یعنی جس طرح میں پیشتر وحشت سے مارا مارا پھرتا تھا اسی طرح اب بھی جسم تو زندان میں ہے مگر خیال صحرا میں

(۷) نعش کا بے کفن ہونا کامل آزادی کی دلیل ہے۔ شعر میں صنعتِ حسنِ تعلیل ہے۔

خلاصہ:۔ عشق میں قوّتِ برداشت لازمی ہے۔ اور بیخودی کمالِ عشق ہے۔

ماخذ:۔ ترک جان و ترک مال و ترک سر
در طریقِ عشق اول منزل است

آرٹ۔ کے نقطۂ نظر سے یہ شعر قابلِ غور ہے ؎

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

ارمغانِ غم

(یعنی غالبؔ کی ساتویں غزل پر شرح)

کشتگاں افتادہ در اطرافِ آں صحرائے سبز
ہمچو صورتہا کہ در دیبائے اخضر یافتند (خسرو)

۱۔ شمار سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا (حسنِ تعلیل)

۲۔ بہ فیض بیدلی نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشاکش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا (علم النفس)

۳۔ ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ صد دل پسند آیا (شاعری اور آرٹ)

۴۔ جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا (ایہام)

ترجمہ :- (۱) مشکل پسند معشوق کو تسبیح کے دانے شمار کرنے سے رغبت ہوئی یعنی ایک ہی گرفت میں سو دلوں کو لیجانا اچھا معلوم ہوا۔

(۲) بے دلی کے فیض سے ہمیشہ کے لئے نا امیدی آسان ہے، (کیونکہ) کوشش و تدبیر کو ہماری نہ کھلنے والی گرہ پسند آئی۔

(۳) سیر گل کی خواہش معشوق کی بے مہری کا آئینہ ہے۔ (کیونکہ) بسمل کو خون میں لوٹتے ہوئے دیکھ کر خوش ہونا مقصود ہے۔

(۴) زخم تحفہ ہے، ہیرے کی کنی پیشکش اور داغ جگر ہدیہ ہیں لے اسد مبارک ہو کہ درد مند جان کا غمخوار اس ساز و سامان کے ساتھ آیا۔

تمہید :- اس غزل میں حسن کی "پُرکاری" اور بے اعتنائی پر اظہار خیال کیا ہے۔ مضمون مسلسل ہے۔

مفہوم :- (۱) دنیا میں حسن کی غرض و غایت یہی ہے کہ دلوں کو جلد سے جلد دام میں پھنسا لے۔

(۲) کسی کام سے بے دل ہو جانا نا امیدی کی دلیل ہے۔ تدبیر و کوشش کا انحصار محض امید پر ہے۔ مایوسی کی حالت میں کوشش کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لئے وہ عقدۂ مشکل جس کے حل ہونے کی امید قطع ہو گئی ہو کشاکشِ تدبیر کو صرف اس لئے مشکل ہے کہ اس کو حل کرنا پڑے گا اور مرغوب اس لئے ہے کہ حل کرنے سے نجات مل جائے گی کیونکہ سعی لاحاصل میں لگا رہنا فضول ہے اور بے فائدہ دوڑ دھوپ کرنے میں ہاتھ پیر کو تکلیف دینا بھی حماقت ہے۔ یعنی کوشش صرف مقصد کے لئے ہے نہ کہ اس کے خلاف :-

"میں نے زندگی کی کبھی پروا نہ کی، البتہ زندگی میری خدمت میں مشغول رہی۔" (ٹامس ہارڈی کے لوحِ مزار کی تحریر)

(۳) حسن کو عشق کی رسوائی میں لطف ہے ؎

کجائی اے کہ دلت بر ہلاک ما خوش بود
بیا و مژدہ بآں لعلِ دلنواز رساں (خسرو)

(۴) عشق کی تکلیفیں دنیا کی تمام راحتوں سے افضل و احسن ہیں۔ (انگریزی مثل)

تشریح :- (۱) شمارِ سبحہ یعنی تسبیح کا پڑھنا۔ بہت مشکل پسند یعنی دشوار پسند معشوق۔ مرغوب آیا یعنی مرغوب ہوا۔ فارسی ترکیب "مرغوب آمد" کا ترجمہ ہے۔ بیک کف بردن صد دل یعنی ایک ہی جھپٹے میں سو دلوں کو لے جانا۔ یہ شعر حسنِ تعلیل کی بالکل اچھوتی مثال ہے۔ تسبیح کے دانوں سے دل کا استعارہ قابلِ غور ہے۔ اللہ والوں یعنی زاہدوں کے دل سے اللہ اللہ کی آوازیں آتی ہیں اور بہ اعتبارِ شمار تسبیح کا دانہ اللہ اللہ پڑھنے ہی کے لئے ذریعۂ امتیاز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح زاہد لوگ تسبیح کے سَو دانوں کو سمیٹ کر مٹھی میں لے لیتے ہیں اسی طرح معشوق ایک ہی مرتبہ سو دلوں پر قبضہ حاصل کر لیتا ہے۔ زاہد اور معشوق، اللہ اور بت وغیرہ الفاظ کے مفہوم میں حضرتِ واعظ پر ایک پوشیدہ چشمک بھی ہے۔

(۲) بیدلی یعنی مایوسی، کشاکش یعنی کوشش۔ مطلب یہ ہے کہ مایوسی کی وجہ سے اب ہمیشہ کے لئے ہمکو پوری ناامیدی ہو گئی۔ ہمارا عقدۂ مشکل کشاکش کو اس لئے پسند آگیا کہ اب مزید کوشش نہ کرنا پڑے گی یعنی بجائے امیدِ عقدہ کشائی کے ناامیدی ہمیشہ کے لئے تسکین خاطر ہو گئی۔ مصداق

نہ وہ یاد آئیں گے اب نہ میں بیقرار ہونگا ؎
نہ خلش ہی دل میں ہوگی نہ میں اشکبار ہونگا

(۳) ہوا بمعنی خواہش "بخون وغلطیدن" بسمل یعنی بسمل کا خون میں تڑپنا لوٹنا۔ مطلب یہ ہے کہ قاتل کو پھولوں کا حسن دیکھنا مقصود نہیں ہے بلکہ ان کی تباہی و بربادی دیکھنے کی خواہش ہے کہ ہوا کے جھونکوں سے وہ زمین پر کس طرح اڑتے پھرتے ہیں۔ بقول شاعر ؎

مہندی ملتے ہیں نہ زینت نہ پھبلنے کے لئے
مشق کرتے ہیں کلیجہ مرا ملنے کے لئے

(۴) جراحت بمعنی زخم۔ الماس یعنی ہیرے کی کنی۔ ارمغان بمعنی تحفہ یا نذرانہ۔ بعض شارح اس شعر کا مطلب دو طرح لکھتے ہیں :-

(۱) میرا ہمدم جو دوست کو سمجھانے گیا تھا خود زخمی ہو کر یعنی عاشق ہو کر آیا۔ اور درد، دکھ، داغ و زخم لایا۔

(۲) عشق عاشق کا ہمدم ہے مگر عشق کے ساتھ درد، دکھ اور تکالیف کا ہونا بھی ضروری ہے۔

خلاصہ :- عشق حسن کا کھیل ہے۔ مایوسی ناامیدی کی دلیل ہے، اور عشق کی تکلیف آرام ہے۔

ماخذ :- (۱) ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں لے ذوق
اُس نے دیکھے ہی نہیں نازو نزاکت والے (ذوق)

(۲) دام میں یار کے میں دیدہ و دانستہ پھنسا
مجھکو ناداں نہ سمجھیں دلِ دانا والے (محسن)

آرٹ :- ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ صد دل پسند آیا

اِس شعر کے مفہوم کو لیکر ایک خزاں دیدہ باغ کی تصویر بنائی جا سکتی ہے جسمیں پژمردہ، گرے ہوئے اور اُڑتے ہوئے پھول

دکھانے گئے ہوں اور کمال حسن ادا ان کی کوکھ سے ظاہر ہوتا ہو۔ + بیان :- فیض بیتی ہے دیکھنا چاہتے دیوناسب آحال کا کشاکش کی مارا عقدۂ مشکل پسند آیا۔

جاپان میں اُردو کی تعلیم

پروفیسر گاموکا مکتوبِ گرامی

ذیل میں ہم جاپانی پروفیسر ریچی گاموصاحب کا مکتوبِ گرامی درج کرتے ہوئے ناظرین ادبی دنیا سے ان کا تعارف کرانے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔ آپ ٹوکیو میں مدرسۂ تعلیم السنۂ خارجیہ (Tokyo School of Foreign Languages) کے اولڈ بائے یا پرانے طالب علم ہیں۔ بعد تکمیل علوم اسی درسگاہ میں اردو زبان کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ آپ دس بارہ سال سے اردو زبان کی بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حال میں آپ نے انتہائی تحقیق وتدقیق کے ساتھ جاپانی زبان میں اردو صرف ونحو مرتب فرمائی ہے جس سے استفادہ کرتے ہوئے جاپانی طلباء کو اردو زبان کی تحصیل میں بہت کچھ سہولت ہوگئی ہے۔ آپ جاپانی رسالوں میں اردو زبان کے ادیبوں اور شاعروں کے حالات شائع کرکے اہل جاپان کو ان سے ہمیشہ متعارف کرتے رہتے ہیں۔ آجکل آپ مولنا عبدالحلیم شرر مرحوم کی تالیفات پر ایک مبسوط تبصرہ لکھ رہے ہیں۔ اردو کے علاوہ آپ کو فارسی سے بھی بہت شغف ہے۔ خصوصاً اسلامی ادبیات سے آپ کو گہری دلچسپی ہے چنانچہ قرآن حکیم کے تراجم بھی جو ان کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہیں آپ کے زیر مطالعہ رہتے ہیں۔ پروفیسر ممدوح نے ایڈیٹر ادبی دنیا کے نام جو چٹھی روانہ فرمائی ہے وہ بغیر کسی ادنیٰ تصرف کے لفظ بہ لفظ درج کی جاتی ہے۔ ناظرین اس مکتوب کا مطالعہ کرکے حیرت زدہ ہونگے کہ ایک غیر ملکی باشندہ کو جس نے نہ کبھی ہندوستان دیکھا اور نہ براہِ راست یہاں کی زبان حاصل کی۔ اردو زبان پر کس درجہ عبور حاصل ہے۔ پروفیسر صاحب کی پختگی تحریر اُن اخبار نویسوں کیلئے خاص طور پر سبق آموز ہے جو زبان دانی اور انشا پردازی کے لمبے چوڑے دعووں کے باوجود صحیح اردو کی چار سطریں بھی نہیں لکھ سکتے۔

پروفیسر صاحب نے اردو کتابوں کے ترجمہ واشاعت کا جو بیڑا اٹھایا ہے وہ نہایت مبارک اقدام ہے لیکن ہم ان کی خدمت میں اتنا ضرور عرض کریں گے کہ اِس غرض کے لئے انہوں نے جو انتخاب فرمایا ہے وہ کسی طرح پسندیدہ نہیں ہے۔ ان کی انتخاب کردہ کتابیں محض عامیانہ مؤلفات ہیں جن سے تہذیب اخلاق کے بجائے اُلٹا پڑھنے والے کا علمی اور اخلاقی ذوق تباہ ہوتا ہے۔ (ادارہ)

ٹوکیو - ۲۰ اپریل ۱۹۳۱ء

مخدومی ومحترمی جناب مینجر صاحب۔ تسلیم۔ آپ کا عنایت کردہ نوازش نامہ مؤرخہ ۵ مارچ ۱۹۳۱ء ۱۱ اپریل کو مدرسہ میں ملا جس کا میں نہایت ممنون ہوں اور اس کے ساتھ ہی "ادبی دنیا" کے جنوری اور فروری نمبر بھی میرے پاس پہنچے جن کا میں تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے اس کا جواب فوراً روانہ کرنا چاہیئے تھا لیکن تصویر بنوانے میں کچھ دیر ہوئی۔ کوئی ایک ہفتہ ٹھہرنا پڑا۔ پس معافی کا خواستگار ہوں۔

بہرحال آپ ازراہِ عنایت فرماتے ہیں کہ اِس عاجز کی تصویر اور مختصر سوانح عمری بھیجی جائے سو اگر گستاخی معاف ہو تو میں کچھ عرض کردوں اور اپنی تصویر کے ساتھ روانہ کردوں۔ اگر آپ مہربانی سے مطلع فرمادیں کہ میرا پوسٹل آرڈر دفتر میں پہنچا یا نہیں تو میں بہت ممنون ہونگا۔

ہمارا مدرسہ جس کا نام جاپانی میں "توکیو گائکوکو گو گکّو" یعنی مدرسہ لسان خارجیہ توکیو" ہے، جاپانی سرکار نے اپریل ۱۸۹۶ء میں قائم کیا تھا۔ اس میں دنیا بھر کی بارہ مختلف غیر ملکی زبانیں سکھلائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک ہماری ہندوستانی زبان ہے۔ علوم مروجہ کی تکمیل کے بعد ۱۹۲۰ء میں میں اس مدرسہ کے ہندوستانی درجہ میں داخل ہوا اور یہاں تین برس تک ہندوستانی زبان انگریزی زبان وغیرہ وغیرہ پڑھکر ۱۹۲۴ء میں تکمیل نصاب کے بعد مدرسہ چھوڑا۔

اِس کے بعد نومبر ۱۹۲۵ء میں میں اسی مدرسے میں ہندوستانی لیکچرر اور مارچ ۱۹۲۸ء میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوا۔

پہلے تو مدرسے کی مدت نصاب تین سال تھی ۔ لیکن اب اپریل ۱۹۲۶ء سے یہ چار برس ہو گئی ۔ جب میں مدرسہ میں ہندوستانی زبان پڑھ رہا تھا اُسی وقت پنڈت ہری ہرناتھ ٹل صاحب پروفیسر تھے ۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ان کا ٹوکیو میں انتقال ہو گیا ۔ وہ خوش مزاج نیک دل بہت محنت کرنے والے تھے ۔ اُن کی جگہ ہنری ڈرامنڈ صاحب ہندوستانی پروفیسر مقرر ہوئے ۔ مَیں اکثر اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا اور وہ ہمیشہ بڑی مہربانی سے پیش آتے ۔ واقعی وہ ہم طالب علموں کے لئے بڑی تکلیفیں اٹھاتے اور ہمیشہ بیش بہا نصائح فرماتے رہتے ۔ شیخ فضلی صاحب سے یہ سُن کر مَیں بہت خوش ہوا کہ وہ بخیر و عافیت اب الہ آباد کے ٹائر ٹریننگ سکول میں پروفیسر ہیں ۔

جب میں مدرسہ میں لیکچرر مقرر ہوا اُس وقت کوئی ہندوستانی پروفیسر نہیں تھے اور ڈرامنڈ صاحب بھی ہندوستان واپس جا چکے تھے ۔ لیکن اپریل ۱۹۲۶ء میں عطر سین صاحب ہندوستان سے تشریف لائے اور ہندوستانی پروفیسر مقرر ہوئے ۔ اُن کے اوسا کا تشریف لیجانے کے بعد دسمبر ۱۹۳۰ء کو شیخ بدر الاسلام فضلی صاحب بی ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی دہلی سے تشریف لائے اور ہمارے مدرسہ میں پروفیسر مقرر ہوئے ۔ آپ نہایت نیک دل صاحب کمال صاحب حال و قال اردو اور فارسی ادب میں گہری علمی لیاقت اور ذوق رکھتے ہیں ۔ میں آپ سے ہر قسم کا مشورہ لیتا ہوں اور آپ ہمیشہ از راہ عنایت نصیحتیں فرماتے اور مدد دیتے رہتے ہیں ۔ آپ "ادبی دنیا" کی ہمیشہ تعریف فرماتے ہیں ۔ اور مَیں یوں خیال کرتا ہوں کہ خود آپ ہی کی عنایت سے یہ جوہر نایاب ہاتھ لگا ۔

مندرجہ بالا صاحبان کے علاوہ شمس الدین خاں صاحب میلسور سے سیر یکلچر پڑھنے کو جاپان تشریف لائے تھے ۔ وہ تین سال تک ٹوکیو میں قیام پذیر رہے ۔ جو دوستانہ تعلقات ہم دونوں کے درمیان قائم تھے وہ میں کبھی بھول نہیں سکتا ۔ جب مَیں اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اکثر اردو ادب ہی پر گفتگو رہتی ۔ اُن کو ٹوکیو چھوڑے ہوئے اب قریب دو سال گزر گئے ۔ اب آپ اپنے ملک میں کام میں مشغول ہونگے ۔

کیشو رام صبروال صاحب مدت سے ٹوکیو میں قیام رکھتے ہیں آپ بھی ہمارے مدرسے میں تھوڑے عرصے تک ہندوستانی لیکچرر مقرر ہوئے تھے ۔ آپ بہت کشادہ دل صاحب حال و قال ہیں ہمیشہ مجھے مشفقانہ نصیحتیں فرماتے رہتے ہیں ۔ واقعی اِن صاحبان کی عنایت سے ہندوستانی زبان اور ادب کا بہت کچھ مجھے معلوم ہوا اس لئے ان اصحاب کی شکر گذاری کیونکر ظاہر نہ کروں ۔

اچھا ۔ اب جاپان کے عام لوگوں کی طرف نگاہ کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو حال ہی کے ہندوستان کی حالت زیادہ معلوم نہیں ۔ اُن کے نزدیک ہندوستان ایک گرم ملک ہے جہاں پُرانے زمانے میں بودھ مذہب کے بانی شاکی مُنی پیدا ہوئے ۔ اور کوہ ہمالیہ دنیا بھر میں مشہور ہے اور موجودہ زمانے میں مہاتما گاندھی بہت بڑے شخص ہیں ۔ بس صرف اتنا ہی جانتے ہیں اور معمولی لوگوں کو اتنا بھی معلوم نہیں ۔

دراصل جو دوستانہ تعلقات دو قوموں کے درمیان قائم ہیں اُن کی ترقی کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ قومیں آپس میں پورے طور پر ایک دوسرے کو سمجھیں اور ایک دوسرے کی قدر بخوبی پہچانیں ۔

اس واسطے مَیں یہ اپنا فرض خیال کرتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے ہندوستان کی حالت جاپانیوں پر ظاہر کروں اور جاپان کی حالت ہندوستانی دوستوں کی خدمت میں پیش کروں ۔ اور مندرجہ بالا اصحاب کی تحریر و تقریر سے اور بذریعہ "ادبی دنیا" جیسے بڑے رسالے کے جاپان کی حالت ہندوستانی اصحاب کو معلوم ہو جائے تو مَیں نہایت خوش ہونگا ۔

اِس غرض سے مَیں شیخ فضلی صاحب کی مدد سے اب میر امن دہلوی کے "باغ و بہار" کا جاپانی میں ترجمہ کر رہا ہوں کہ چھپوا کر شائع کرنا چاہتا ہوں ۔ اگر یہ شائع ہو گا تو یہ پہلا جاپانی ترجمہ ہو گا ۔ اگر ہو سکا تو اس کے بعد آرائش محفل کا بھی ترجمہ کرونگا ۔

واقعی ہمارے کام کا کوئی حد نہیں ۔ جہاں تک نگاہ پہنچ سکے دشوار گذار دور و دراز راستہ نظر آتا ہے اور منزل مقصود نظر نہیں آتی ۔

والسلام

نیازمند

آر ۔ گامو

دیہاتی گیت

جناب فاخرؔ کی اس نظم کا مرکزی خیال ایک پنجابی گیت کا یہ مصرعہ ہے ع جتھے تیرے ہل وگدے اُتھے لے چل چرکھا مرا

وہیں لے چل مرا چرخہ جہاں چلتے ہیں ہل تیرے

مجھے ماں باپ کے گھر میں وہ اطمینان حاصل تھا — کہ دُنیا بھر کی اُمیدوں کا گہوارہ مرا دل تھا
ہوئی حالت مگر بالکل وہی سسرال میں آکر — پھنسے جیسے کوئی آزاد طائر جال میں آکر
محلے بھر کی ساری عورتیں مجھکو بناتی ہیں — میں اُن کا مُنہ چڑاتی ہوں وہ میرا مُنہ چڑاتی ہیں
سہے جاتے نہیں اب مجھ سے طعنے ساس نندوں کے — قیامت ہے رہوں کس طرح دن بھر پاس نندوں کے

وہیں لے چل مرا چرخہ جہاں چلتے ہیں ہل تیرے

تری فرقت کی ماری تجھ کو اکثر یاد کرتی ہے — مجھے لے چل کہ میری آتما فریاد کرتی ہے
نہ آنسو آئیں گے رُخ پر نہ گھبرائے گا دل میرا — کہ تیرے ساتھ رہنے سے بہل جائے گا دل میرا
یہ مانا ہیں بہت دلچسپ صبح و شام کے جلوے — رہے تم آنکھ سے اوجھل تو پھر کس کام کے جلوے
تمہارے ساتھ رہ کر اپنا غم سب بھول جاؤنگی — تمہیں گاتا جو دیکھونگی تو خود بھی ساتھ گاؤنگی
میں اپنے درد سے جنگل کے ویرانے کو بھر دُونگی — میں اپنے گیت سے ساری فضا آباد کر دُونگی
شرابی بن کے ناچے گی گھٹا میرے ترانوں پر — کرے گی رقص مستانہ ہوا میرے ترانوں پر
عجب کیا محو ہو جائیں جو پتھر میرے نغموں میں — کہ آجائے گی میری رُوح کھنچ کر میرے نغموں میں
مری خواب آفریں تانوں میں کھو جائیں گے طائر بھی — درختوں کی طرح مبہوت ہو جائیں گے طائر بھی
وہی رونق وہی سامان آئے گا نظر مجھ کو — میں ہونگی ساتھ تو جنگل بھی ہو جائے گا گھر تجھ کو
پڑی ہوں آہ میں کمبخت پا لے آجکل تیرے — کروں کیا لیکے ترے زیور اور کچے محل تیرے

وہیں لے چل مرا چرخہ جہاں چلتے ہیں ہل تیرے

فاخرؔ ہریانوی

بیگناہ قیدی

(کونٹ لیوٹالسٹائے کا شاہکار)

شادنگر کی بستی میں سعید کی دو دکانیں تھیں۔ بیوپار خاصہ تھا۔ اور وہ ایک خوشحال تاجر سمجھا جاتا تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ اس کی صورت شکل اور وضع قطع سے شرافت ٹپکتی تھی۔ جوا۔ شراب اور دوسری بدکاریوں سے وہ دور رہتا تھا۔ دو سال پہلے اس نے اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی۔ اب وہ ایک ننھے سے لڑکے کا باپ تھا۔

ایک دن وہ میلہ جانے کے لئے بیوی سے رخصت ہو رہا تھا۔

"آج میلہ نہ جاؤ" اس کی بیوی نے کہا۔ "میں نے گذشتہ رات ایک نہایت خوفناک خواب دیکھا ہے"

لیکن سعید نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔ "اے توبہ! خواب سے ڈر گئیں؟ دیکھو تو تمہارے لئے کیا خوبصورت تحفہ لاتا ہوں"

"میں نے دیکھا" بیوی نے خواب بیان کرنا شروع کیا۔ "کہ تم گاؤں سے واپس آرہے ہو لیکن تمہاری ظاہری حالت دگرگوں ہے۔ قریب آئے تو دیکھا کہ سر کے بال سب سفید بھک ہیں"

سعید پھر ہنسا اور کہنے لگا۔ "اونہہ! یہ بھی کوئی ڈرنے کی بات تھی۔ یہ تو شگون نیک ہے۔ کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ میں اس وقت تک زندہ رہونگا جبتک میرے سر کے بال سفید نہ ہوجائیں۔"

اس نے اپنے چہیتے لڑکے کو پیار کیا اور چلدیا۔

سہ پہر کے قریب سعید کو راستہ میں ایک تاجر ملا۔ تھوڑی دور جاکر دونوں نے قریب کی سرا میں شب باشی کا انتظام کیا۔ کچھ کھاپی کر دونوں اپنے اپنے کمروں میں سو رہے۔ سعید چونکا تو آدھی رات گذر چکی تھی۔

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں رات کی خنکی میں سفر کا بڑا حصہ ختم کر لوں؟" اس نے سوچا۔ "مجھے اب زیادہ آرام کی ضرورت نہیں۔ صبح جب دھوپ تیز ہو جائیگی کسی سرا میں آفتاب ڈھلنے تک دم لے لونگا۔"

اس نے اپنا سامان باندھا۔ گھوڑے پر زین کسی اور چلتا ہوا، دن چڑھے وہ ایک سرائے میں پہنچا۔ ابھی آگ روشن ہی کی تھی کہ تین سواروں کو سرا میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ مسافر نہ تھے۔ ایک جو ان میں زیادہ متین تھا۔ سعید کے کمرے میں داخل ہوا۔ "تم نے رات کہاں گذاری؟ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور تاجر بھی سرا میں تھا؟ کیا تم نے نکلنے سے پہلے اس سے ملاقات کی تھی؟" اس نے فوراً ہی اس قسم کے سوالات کی بوچھاڑ شروع کی۔

سعید نے ان کا صاف صاف جواب دیا۔ "آخر آپ اس قسم کے سوالات کیوں کر رہے ہیں؟" اس نے تنگ آکر پوچھا۔ "میں کوئی چور۔ اچکا۔ ڈاکو یا قاتل نہیں ہوں۔ میلہ میں ضروری چیزیں خریدنے جارہا ہوں پھر آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ ایک تاجر سے اس طرح سوالات کریں؟"

"میں پولیس انسپکٹر ہوں" نووارد نے کہا۔ "اور میں سوالات اس لئے کر رہا ہوں کہ وہ تاجر جو کل رات آپ کے ساتھ تھا، آج صبح ہونے سے پہلے مقتول پایا گیا۔" اس نے سپاہیوں کو آواز دی اور حکم دیا، "ان کے سب سامان کی تلاشی لو"

سعید نے اپنا چھوٹا سا ٹرنک اور بستر ان کے آگے رکھدیا۔ ٹرنک میں ادھر ادھر ٹٹولنے کے بعد سپاہی نے ایک خون آلود خنجر برآمد کیا جو کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا۔

"کیا یہ تمہارا نہیں ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

سعید آنکھیں پھاڑے خنجر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ "اے خدا! میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟" اس نے دل میں کہا۔

"اور یہ خون آلود کیسے ہے؟" انسپکٹر نے طنزاً دریافت کیا۔

سعید کے جسم میں کاٹو تو لہو نہ تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان قابو میں نہ تھی۔ "میں —— میں نہیں جانتا۔ خنجر —— خنجر میرا نہیں ہے"۔ اس نے لکنت آمیز لہجے میں کہا۔

"سنو!" انسپکٹر نے کہنا شروع کیا۔ "مقتول کے کمرے میں دو دروازے تھے، ایک باہر کی طرف کھلتا تھا اور دوسرا تمہارے کمرے میں۔ پہلے میں تالا لگا ہوا تھا لیکن دوسرا غیر مقفل تھا۔ —— تم صبح ہونے سے پہلے بغیر اطلاع دئے غیر معمولی رفتار سے فرار ہوئے —— تمہارے یہاں

خون آلود خنجر پا لیا گیا ـــــ اس کے علاوہ گھبرائی ہوئی صورت بتلا رہی ہے کہ تمہیں "قاتل" ہو ....

"صاف صاف کہدو کہ تم نے کیوں قتل کیا اور کتنی رقم چرائی ؟"

سعید نے قسمیں کھائیں کہ نہ تو میں نے قتل ہی کیا اور نہ رقم چرائی ۔ مقتول سے اس کی دوستی تھی۔ اس لئے دونوں قریب کے کمروں میں مقیم ہوئے ۔ شاید اسی وجہ سے اُس نے تالا بھی نہ لگایا ہو ـــــ اور رات رہنے سے نکلنے کا سبب یہ تھا کہ پچھلے کی ٹھنڈک میں سفر بے تکان ہوتا ہے

بہتیرے آنسو بہائے لیکن انسپکٹر نے ایک نہ سُنی ۔ سعید کے آٹھ سو روپیہ بھی مالِ مسروقہ سمجھکر ضبط کرلے گئے اور پولیس کے سپاہی اس کو کشاں کشاں تھانہ کی طرف لے گئے ۔ پولیس نے اپنی پوری تدبیریں ختم کردیں مگر سعید نے قتل اور چوری کا اعتراف نہ کیا مجسٹریٹ کے اجلاس میں مقدمہ پیش ہوا تو بہت غور وخوض کے بعد سعید کو قاتل اور چور ٹھہرا کر حبس دوام کی سزا سنادی گئی ۔

سعید کی بیوی کیلئے یہ خبر سوہانِ رُوح تھی ۔ چھوٹے سے لڑکے کو سینے سے چمٹائے وہ آخری دیدار کیلئے آئی پہلے تو چوکیدار نے اجازت نہ دی لیکن بعد میں اس کی گریہ وزاری پر رحم آ ہی گیا ، وہ سعید کے قدموں پر گر پڑی اور اپنی بیکسی وبے بسی اور لڑکے کی پرورش کے متعلق دلسوز بین کرنے شروع کئے ، جب ان سے فراغت ہوئی تو اس نے اصل واقعہ دریافت کیا سعید نے شروع سے آخر تک جو کچھ گذری تھی من وعن کہہ سنائی ۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے ؟" بیوی نے دریافت کیا ۔

"کیوں نہ ہائیکورٹ میں مرافعہ کریں ؟" سعید نے مشورہ دیا ۔

بیوی نے سارا قصہ سنایا کہ کس طرح اس نے پہلے ہی عرضی پیش کی تھی اور وہاں کے حکام نے کسقدر بے رُحمی ظاہر کی ۔ عدالت نے اس کی فریاد پر توجہ نہ کی اور اب وہ مایوس ہو کر یہاں چلی آئی ۔

سعید کی دنیائے امید کی واحد شمع جو امید وبیم کی ہواؤں سے جھلمل جھلمل کر رہی تھی ۔ یاس کے اس تند جھونکے سے بھڑک کر خاموش ہوگئی ۔ نظریں نیچی کئے وہ زمین کی طرف گھورنے لگا ۔

"آہ ! میرا خواب کسقدر خوفناک تھا ۔ تم نے میری بات نہ سُنی ۔ اُف ! میں دیکھ رہی ہوں کہ قید کی طویل مدت نے تمہارے بال سفید کر رکھے ہیں" بیوی نے کہا ۔

"سعید ! پیارے سعید ! میں التجا کرتی ہوں کہ واقعہ مجھ سے نہ چھپاؤ ۔"

اس نے سلسلہ جاری رکھا ۔ "کہو کیا تم نے واقعی قتل نہیں کیا ؟"

سعید کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا ۔

عین اُسی وقت چوکیدار کمرے میں داخل ہوا اور کہا ۔ "بس اب تمہیں جدا ہو جانا چاہیئے" ۔

جب بیوی چلی گئی تو سعید یوں دل سے باتیں کرنے لگا ۔ "کیا واقعی تمام دنیا مجھے قاتل سمجھتی ہے ۔ بس اب بارگاہ ایزدی ہی میں التجا کرنی چاہیئے کیونکہ وہی خوب جانتا ہے کہ میں بیگناہ ہوں" ۔

اس وقت سے سعید نے اپنی امیدوں کا سلسلہ توڑ ڈالا اور خدائے تعالیٰ سے لو لگائے دعا ومناجات میں ہمہ تن مصروف رہا ۔

اسی صبر وشکر کی حالت میں اس نے چھبیس سال قید خانے میں کاٹے ۔ اس کے بال سفید بھک ہوگئے ۔ ڈاڑھی بڑھ کر سینہ کو چھونے لگی اور کمر خمیدہ ہوگئی ۔

حکام کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سعید دوسرے قیدیوں سے بالکل علیحدہ عادات واطوار کا مالک ہے ۔ وہ خاموش طبع ۔ تنہائی پسند ۔ گوشہ نشین اور کم سخن تھا ۔ دوسرے قیدی آپس میں لڑتے جھگڑتے ۔ غذا کی شکایت کرتے اور کام سے جی چراتے تھے لیکن یہ اُن سب سے الگ تھلگ رہتا ۔ نہ شرارتوں میں شامل ، نہ برائیوں میں شریک ، یہی بے لوث زندگی تھی جسکی وجہ سے افسروں کو اُنس اور دوسرے قیدیوں کے دلوں میں احترام قائم ہو چلا تھا ۔

اس طویل عرصہ میں سعید کو نہ کوئی خط ملا اور نہ بیوی بچے کی خیریت معلوم ہوئی ۔ جب کبھی گھر کا خیال آتا ، خوفناک اندیشے رونما ہوتے اور دل پر سانپ لوٹ جاتا ۔ دل بہلانے کی غرض سے وہ قصداً اپنے آپ کو دوسری طرف متوجہ کرلیتا ۔

ایک دن نو گرفتاروں کا گروہ قید خانے میں داخل ہوا حسب معمول سب قیدی ان کی داستانِ الم سننے کے شوق میں صحن میں جمع ہوئے سعید بھی ایک طرف دُور بیٹھا غم انگیز داستان سُنکر اظہار ہمدردی کر رہا تھا ۔ ایک اونچے اور دُبلے پتلے قیدی کی باری آئی ۔ اس کی سفید لمبوتری ڈاڑھی اور چمکدار آنکھیں صاف بتلا رہی تھیں کہ وہ ایک گرگِ باراں دیدہ ہے ۔

"دوستو" اس نے شروع کیا ۔ "یقین مانو کہ میں بیگناہ ہوں ۔ میرا گناہ صرف یہ تھا کہ میں نے بغیر پوچھے عزیز وہمسایہ کا گھوڑا باندھا تک

لے گیا۔ حالانکہ میرا مقصد صرف سودا سلف فرا جلدی لے آنا تھا۔ پولیس کو کس کس طرح سمجھایا کہ میری نیت چوری کی ہرگز نہ تھی۔ صرف ایک گھنٹہ کے لئے گھوڑا لیا تھا اور اب واپس کر دینے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن سنتا کون؟ اُنہوں نے خواہ مخواہ مجرم بنا عدالت میں پیش کیا۔ سچ جانئیے مجھے قوی امید تھی کہ میرے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ مگر کچھ کہے سنے بغیر مجسٹریٹ نے سزا سنا دی۔ دوستو! مخفی نہ رہے کہ یہاں میں پہلے بھی مظلوم کی حیثیت میں رہ چکا ہوں"۔

وہ آنکھیں ملکر رونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟" ایک نے دریافت کیا۔

"میں شادنگر میں رہتا تھا" اس نے جواب دیا۔ "نہ معلوم پولیس کو مجھ سے کیوں بغض للّہی ہے۔ حالانکہ انہوں نے مجھے دو مرتبہ ناکردہ گناہ کی حیثیت سے قید کروایا تھا۔

سعید شادنگر کا نام سنکر چونک پڑا۔ "کیا تم نے کبھی سعید کا نام بھی سُنا ہے؟" اس نے پوچھا "کیوں نہیں" وہ بولا۔ "شادنگر میں اس کی دونوں دکانیں خوب چلتی تھیں اور وہ ایک متمول تاجر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن کئی سال پہلے اس کو حبس دوام کی سزا مل چکی ہے۔ وہ بھی مجھ جیسا بدقسمت تھا —— خیر میری کہانی تو ختم ہوئی اب تم اپنا قصہ سناؤ۔" اس نے فرمائش کی۔

سعید اپنی خونچکاں داستان سنانے کا عادی نہ تھا۔ اس لئے ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولا۔ "میں —— میں اپنے گناہوں کی سزا چھبیس[۲۶] سال سے بھگت رہا ہوں۔

"آخر وہ کون گناہ تھے؟" اس نے پوچھا۔

"ایسے گناہ جن کی سزا حبسِ دوام ہو سکتی ہے" سعید نے کہا۔ اور منہ پھیر کر خاموش ہو گیا۔ ساتھیوں نے سارا واقعہ بیان کیا کہ کس طرح سعید پر ایک تاجر کے قتل کا بے جا الزام لگایا گیا۔

"تعجب! سخت تعجب ہے! تم بہت بوڑھے ہو گئے ہو" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

لوگوں نے تعجب کی وجہ پوچھی اور دریافت کیا کہ کیا وہ سعید سے واقف ہے؟ جس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ یوں گویا ہوا۔ "عجب اتفاق ہے۔ عجب اتفاق!"

سعید کو معاً خیال ہوا کہ کہیں یہ اصلی قاتل سے واقف تو نہیں۔ اسلئے پوچھا "کیا تم نے یہ قصہ کبھی پہلے بھی سنا ہے؟

"سنا!" اس نے تکرار کی "کیوں؟ —— ایک زمانہ میں کیا یہ قصہ شادنگر کے بچے بچے کی زبان پر نہ تھا؟ —— لیکن اتنا عرصہ گذر چکا کہ اب مجھے تفصیل یاد نہیں۔"

"اچھا کیا یہ بھی سنا کہ اصل قاتل کون تھا؟" سعید نے دریافت کیا۔

وہ مسکرایا اور بولا "اصلی قاتل وہی ہونا چاہیے جس کے ٹرنک سے خون آلود خنجر برآمد ہو۔ اگر کوئی اور شخص تمہارے ٹرنک میں خنجر چھپا دیتا تو تم چوری کے الزام میں گرفتار ہوتے۔ بفرض محال اگر ایسا ہوتا بھی تو چونکہ ٹرنک تمہاری چارپائی کے نیچے تھا اس لئے اس کے کھولنے میں آواز ہوتی اور تم ضرور بیدار ہو جاتے۔"

اس گفتگو سے سعید کو نئے قیدی پر شبہ ہونے لگا۔ "بہت ممکن ہے کہ یہی اصل قاتل ہو۔" اس نے سوچا۔

طبیعت بہلانے کی فکر میں وہ دوسری طرف متوجہ ہوا۔ لیکن رات کے پُرسکون لمحوں میں اس کے تخیل نے پچھلی زندگی کا ایک خاکہ پیش کیا۔ سینما کی طرح یہ تصویریں متحرک ہوئیں۔ بیوی سے رخصت ہونا۔ اس کا میلہ جانے سے منع کرنا اور خوفناک خواب بیان کرنا۔ اس کا بے پروائی سے لڑکے کو پیار کر کے چلدینا —— پھر راستے میں دوسرے تاجر سے ملنا۔ سرا میں ٹھہرنا۔ رات کے آخری لمحوں میں اس کا عازم سفر ہونا —— پھر دن ڈھلنے کے بعد دوسری سرا میں ستانے کیلئے ٹھہرنا۔ پولیس کا خون آلود خنجر ٹرنک سے برآمد کرنا۔ مجسٹریٹ کا سزا سنانا —— قید کی چھبیس[۲۶] سالہ زندگی، اور آج اس نئے قیدی کا طرز عمل ....

"یقیناً یہی اصل قاتل ہے!" سعید بے ساختہ چلایا۔ فوراً اس نے گردن اٹھا کر چو طرف دیکھا۔ سب قیدی محوِ خواب تھے، لیکن ایک نے یہ چیخ سنکر کروٹ بدلی۔ سعید اس کی طرف گھورنے لگا مگر اس نے پھر کوئی حرکت نہ کی۔

صبح ہوئی تو سعید نے عہد کر لیا کہ اس نئے قیدی سے ملنا تو اور چیز صورت بھی نہ دیکھے گا۔ دن تو کسی طرح کٹ ہی جاتا لیکن رات کاٹے نہیں کٹتی۔ ایک رات بےچینی سے تنگ آ کر سکونِ قلب کے لئے سعید زیرِ آسمان ٹہل رہا تھا۔ یکایک اس کی نگاہ ایک شخص پر پڑی جو غیر معمولی محنت و مشقت سے زمین کھودنے میں مصروف تھا۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہی نیا قیدی سرگرم کار ہے۔ سعید اس کی طرف دیکھنا نہ چاہتا تھا، اس لئے ہٹا اور واپس ہو جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن قیدی نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگا "سنو! میں کئی رات سے سرنگ تیار کرنے میں مشغول ہوں اور شاید کل رات تک مکمل ہو جائے۔ خبردار! کسی سے نہ کہنا۔ تمہیں بھی

اپنے ساتھ لے چلونگا - اور اگر تم نے یہ راز فاش کیا تو خوب یاد رکھو کہ میرے آہنی چنگل سے بچنا محال ہے۔"

بے پروائی سے ہاتھ چھڑا کر سعید نے کہا۔ "مجھے رہائی سے کوئی فائدہ نہیں ہے - اور نہ تم مجھے دوبارہ اپنی فریب کاری سے نقصان پہنچا سکتے ہو - رہا یہ سوال کہ میں تمہارا راز بے نقاب نہ کروں ——— یہ بالکل میری مرضی پر منحصر ہے -"

دوسرے روز چند مزدور اور سپاہی صحن کی سطح درست کرنے کے لئے بلا توقع آئے - دیوار کے قریب کا پتھر جب ہٹایا گیا تو ایک سرنگ نظر آئی - سپاہیوں نے مہتمم قیدخانہ کو اطلاع دی - اس نے تمام قیدی بلائے اور ایک ایک سے باری باری سوال کیا " سچ سچ کہدو یہ کس کی کارگذاری ہے؟" لیکن سب نے لاعلمی ظاہر کی - جب سعید کی باری آئی اس نے کہا - "بوڑھے آدمی! میں تمہیں ایماندار اور سچا سمجھتا ہوں - صاف صاف بتا دو کہ یہ سرنگ کس نے کھودی ؟"

نیا قیدی بھی قریب کھڑا تھا - وہ اپنے آپ کو بے پروا ظاہر کرنا چاہتا تھا - لیکن رہ رہ کر اس کی نظریں مہتمم کے چہرے پر گڑ جاتی تھیں - سعید عجب کشمکش میں مبتلا تھا - اس نے سوچا - "کیا میں اس کو بچالوں؟ مگر کیوں؟ اس نے مجھ کو تباہ کیا - اب اس کو بھی برباد ہونے دو ——— لیکن .... اس کو برباد کرنے میں میرا کیا فائدہ ہے ؟"

مہتمم نے پھر پوچھا - "کہو بوڑھے آدمی! کس نے یہ شرارت کی ؟" سعید نے ایک لمحہ کے لئے نئے قیدی پر نظر کی اور کہا - "سرکار مجھے معاف فرمائیں - میں نہیں کہہ سکتا - آپ کو اختیار ہے جو چاہیں سزا دیں"

مہتمم نے بہت کچھ ڈرایا دھمکایا - لیکن کوئی کارآمد نتیجہ نہ نکلا - اس لئے یہ پتہ نہ چل سکا کہ سرنگ کس نے کھودی تھی -

اسی رات کو سعید بستر پر نیم خوابی کے عالم میں پڑا تھا - کوئی شخص اس کی طرف آہستہ آہستہ کھسک رہا تھا - سعید چونک پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا ——— نیا قیدی گھٹنوں کے بل اس کے سامنے کھڑا تھا -

"اب تم کس بدمعاشی کے سلسلے میں میرے پاس آئے ہو ؟" سعید نے دریافت کیا -

نئے قیدی نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ وہ قریب تر ہوتا گیا -

"تمہارا کیا ارادہ ہے ؟ جاتے ہو یا سپاہیوں کو آواز دوں ؟" سعید نے جھنجھلا کر کہا -

"سعید! مجھے معاف کردو" - نئے قیدی نے عاجزی سے کہا -

سعید خاموش تھا -

"میں وہی بدمعاش ہوں جس نے تاجر کو قتل کیا اور تمہارے ٹرنک میں خون آلود خنجر چھپا دیا - - - - - - - - - - - "میں تمہیں بھی مار ڈالنا چاہتا تھا لیکن باہر کی ایک آواز نے مجھے جلد فرار ہونے پر مجبور کیا - اس لئے میں خنجر تمہارے ٹرنک میں چھپا کر دریچہ کی راہ سے چلدیا -

سعید نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کہے -

"سعید مجھے معاف کردو - خدا کے لئے معاف کردو -" اس نے اصرار کیا - "میں صبح اپنے جرم کا اقبال کرلونگا اور مہتمم صاحب تمہیں رہا کردیں گے "

"تم اقرار تو کرلوگے اور مہتمم صاحب مجھے چھوڑ بھی دیں گے" سعید نے جواب دیا - "لیکن یہ بتاؤ کہ میں کہاں جاؤں ؟ ——— چھبیس سال بعد - اُف! میری بیوی مرگئی ہوگی - اور لڑکا - پیارا لڑکا - مجھے پہچان بھی نہ سکیگا .... بتاؤ میں رہا ہوکر کیا کرونگا ؟"

"سعید - نیک سعید - معاف کردو - للہ معاف کردو" اس نے پھر التجا کی - "اگر مجھے کوڑے لگتے تو بھی اتنی اذیت نہ ہوتی جتنی تمہاری بیگناہ صورت دیکھکر تکلیف ہو رہی ہے - کل تم نے مجھے بچا لیا - اچھے سعید دیکھو میری آخری خواہش رد نہ کرو - مجھے معاف کردو -"

اس کی آنکھوں سے ندامت کا دریا رواں تھا -

سعید یہ منظر دیکھ نہ سکا - اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے - کہنے لگا - "میں کون تمہیں معاف کرنے والا - خدا سے دعا کرو کہ وہ تمہیں بخش دے - صدق دل سے توبہ کرو اور یہ تمہارے ندامت کے آنسو گناہ بخشوانے کے لئے کافی ہیں -

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

صبح نئے قیدی نے مہتمم کے آگے تاجر کے قتل کا اعتراف کیا اور استدعا کی کہ سعید کو رہا کردیا جائے -

لیکن جب سپاہی رہائی کا حکم لیکر سعید کے کمرے میں پہنچے تو اس کا روح قفس عنصری سے رہا ہوچکا تھا -

سید بادشاہ حسن (حیدرآبادی)

سینما

شیریں فرہاد پر تبصرہ

بعض دوستوں کے اصرار سے مجبور ہوکر آخر کار ہم بھی الفنسٹن تھیٹر میں شیریں فرہاد کا تماشہ دیکھنے چلے ہی گئے۔ ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ آخر ہزار دقّت و رسوائی کے بعد ہمیں بھی ایک کونے میں جگہ مل ہی گئی۔ کھیل شروع ہونے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ ہم نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ہر قماش کا آدمی موجود تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر ہمارے افسوس اور تعجب کی انتہا نہ رہی کہ تماشہ میں سفید رنگ کی قوم کا ایک نمائندہ بھی موجود نہ تھا۔ خدا خدا کرکے کھیل شروع ہوا۔ شیریں فرہاد کی داستانِ عشق اتنی قدیم اور عام ہوچکی ہے کہ اس کا دہرانا ایک فضول سی بات ہوگی۔ لیکن اس مضمون کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بے جا نہ ہوگا۔ اگر ہم اس کا مختصر ساذکر کردیں۔

قباد سوداگر شہنشاہ خسرو والئے ایران کے حضور میں دنیا کی حسین ترین نازنین شہزادی شیریں کی تصویر پیش کرتا ہے۔ خسرو تصویر کو دیکھ کر ازخود رفتہ ہوجاتا ہے اور شادی کا پیغام بھیجتا ہے۔ شیریں خسرو کی رفیقۂ حیات بننے کے لئے آرمینیا سے ایران روانہ ہوتی ہے، ایران کا باکمال لیکن بدقسمت اور نادار انجنیئر فرہاد دربارِ شاہی میں پیش ہوتا ہے اور جوئے شیر تیار کرنے کا حکم حاصل کرتا ہے۔ نہر تیار ہوجانے کے بعد شیریں فرہاد کو اُس کی محنت کا صِلہ دینا چاہتی ہے لیکن خود فراموش فرہاد خود شیریں کو طلب کرتا ہے جو اس کے مطالبہ کو ٹھکرادیتی ہے۔

فرہاد عشق میں دیوانہ ہوجاتا ہے اور کوچہ و بازار میں شیریں شیریں پکارتا پھرتا ہے۔ کوتوالِ شہر اسے گرفتار کرکے بادشاہ کے حضور میں لے جاتا ہے۔ جو فرہاد کے قتل کا حکم صادر کرتا ہے لیکن اپنے وزیر کے مشورہ سے فرہاد کے سامنے کوہ بے ستون کو ہموار کرنے کی ناممکن العمل شرط پیش کرتا ہے جسے فرہاد جوشِ عشق میں منظور کرلیتا ہے۔ لیکن لبقول شخصے "عشق از یں بسیار کردو کند" یہ شرط بھی پوری ہوجاتی ہے۔ خسرو جوشِ رقابت میں فرہاد کے قتل کئے جانے کا حکم دیتا ہے لیکن چالاک وزیر دوبارہ بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کرلیتا ہے کہ وہ تمام معاملہ اس کے سپرد کردے۔ عیّار وزیر اپنے ایک بڈھو کے ذریعہ فرہاد کو شیریں کے مرنے کی جھوٹی خبر پہنچاتا ہے جسے سُنکر فرہاد اپنی حسرتوں کا ماتم کرتے ہوئے تیشہ سے اپنا سر پھوڑ لیتا ہے۔ شیریں بھی سچے عشق سے متاثر ہوکر فرہاد کی قبر میں پناہ لیتی ہے۔ یہ ہے شیریں فرہاد کی داستانِ عشق کا خلاصہ۔

سینما والوں نے اگرچہ اِس قصہ میں رد و بدل کیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی نفسِ مضمون اصل کے مطابق ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب ہم اصل کھیل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اِس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ ہندوستان میں فلم کی صنعت نے اپنے ابتدائی مدارج کے مقابلہ میں بہت ترقی کی ہے۔ ہر ایک ہندوستانی کو اس بات پر فخر ہونا چاہیئے اور اس کی یہ خواہش ہونی چاہیئے کہ یہ صنعت اپنے مدارجِ کمال پر پہنچ جائے۔

لیکن اِس سلسلہ میں یہ امر یاد رکھنا نہایت ضرور ہے کہ سینما اور تھیٹر دو مختلف چیزیں ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ بات نہایت معمولی دکھائی دیتی ہے لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان کے قریباً تمام فلم ایکٹروں ڈرامہ نگاروں اور ڈائرکٹروں کی کامیابی کے راستہ میں یہی امر سدِّراہ ثابت ہوا ہے۔ اور جب سے "ٹاکیز" (بولنے والی فلمیں) شروع ہوئی ہیں ایکٹروں اور ڈرامہ نگاروں کو اس غلطی کے مزید ارتکاب کا موقع مل گیا ہے۔

چونکہ ہندوستانی نہایت قدامت پرست واقع ہوئے ہیں اور شروع ہی سے ایکٹری کا پیشہ ذلیل خیال کیا جاتا ہے اس لئے اس وقت تک ہمارے قابل اور تعلیم یافتہ اشخاص نے اس صنعت کی طرف وہ توجہ نہیں کی جس کی وہ مستحق ہے۔ اب حالات کسی قدر تبدیل ہورہے ہیں اور "وسنت سینا" جیسی فلموں کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب اس صنعت کو ہمارے ملک میں بھی وہی رتبہ حاصل ہوجائیگا جو یورپ اور امریکہ میں حاصل ہے۔

شیریں فرہاد کی فلم بھی ان نقائص سے خالی نہ تھی بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کھیل کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک ایسے ڈرامہ کی تصاویر

لے لی گئیں ہیں جو سٹیج پر کھیلا جا رہا ہو۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایسا ہی کیا گیا ہو۔ ہندوستان کے مشہور و معروف ایکٹر مسٹر عبدالرحمٰن خسرو کا پارٹ کر رہے تھے۔ لاہور میں مڈن کمپنی کے مقبولِ عام ڈرامہ "دھرمی بالک" میں جس شان سے آپ نے اپنا پارٹ ادا کیا تھا اس کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب تک تازہ ہے۔ لیکن ہم ان کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ تھیٹر اور "سینما کا پردہ" کچھ اور چیز ہے۔ جب آپ شیریں کی تصویر دیکھکر از خود رفتہ ہو گئے اور بھرے دربار میں دل پر ہاتھ رکھکر اس کی تعریف فرمانے لگے تو بہت ممکن ہے کہ اس انداز میں آپ سٹیج پر بہت بھلے معلوم ہوتے لیکن سینما کے پردہ پر تو یہ نہایت مضحکہ انگیز معلوم ہوتا تھا۔

اسی طرح کوتوالِ شہر جب ماسٹر نثار کو جو فرہاد کا پارٹ کر رہے تھے، گرفتار کرنے آیا تو گرفتاری سے پہلے آپ کو ایک گانا سنانے کی اجازت دی گئی، جس میں ایک جگہ آپ کو یہ کہنا تھا کہ

"ڈراتے ہو کسے تم کھینچ کر تلوار تھوڑی سی"

پیشتر اس کے کہ وہ یہ الفاظ کہتے سپاہیوں نے اپنی تلواریں نیاموں سے دو دو انچ باہر نکال لیں۔ گویا انہیں علم تھا کہ اب یہ کہا جائیگا۔ اول تو سٹیج پر بھی یہ بات نہایت معیوب معلوم ہوتی لیکن ممکن ہے کہ بعض "ناقدر شناس ہنر" اس سے ایک آدھ لحہ کے لئے ہنسی کا سامان حاصل کر لیتے۔ مگر سینما کے پردے پر تو تلواریں پردہ ہی میں رہتیں تو بہتر تھا، جب بڑے بڑے باکمال" ایکٹروں کا یہ حال تھا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ چھوٹے موٹے" ایکٹروں نے کیا کیا" نمونے پیش کئے ہونگے۔

ہاں اس سلسلے میں یہ ذکر نہایت ضروری ہے کہ نہ معلوم کس قماش کے لوگ اس قسم کے گانے ایجاد کرتے ہیں۔ اور پھر انہیں کس طرح موقع بے موقع ڈرامہ کے پلاٹ میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔

فرہاد صاحب مرنے لگے تو دنیا کو الوداع کہنے سے پیشتر آپ نے ایک راگ گایا۔ شیریں اپنے عاشق صادق سے قبر میں ہمکنار ہونے لگیں تو انہوں نے بھی ایک عدد غزل سنائی۔ بادشاہ سلامت پیچھے کیوں رہ جاتے آنجناب نے بھی جب کوہ ستون کے ہموار ہونے کی خبر سنی تو اپنی بدبختی اور مصیبت کا رونا رویا۔ غرض کوئی "ہائے دل" پکار رہا ہے تو کوئی "ہائے گل"۔ مگر سوچا جائے تو ان بیچارے ایکٹروں کا کیا قصور۔ انہیں تو جو کہا جائے وہ کرنا پڑتا ہے۔

اِن تمام نقائص کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو تمثیل نگاروں پر اور ڈائرکٹروں پر جو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ اُن کی ان لغو اور بے معنی ہدایات سے ہندوستان میں فلم کی صنعت کو فائدہ کی بجائے الٹا نقصان پہنچ رہا ہے۔ ہندوستانی ایکٹروں کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنے آپ میں وہ صلاحیت اور دیگر ضروری اوصاف (بالخصوص چہرے سے اندرونی جذبات کی قدرت کا اظہار) پیدا کریں لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہمارے قابل اور اعلےٰ تعلیم یافتہ طبقہ کو چاہیئے کہ وہ اس صنعت کی طرف دلی توجہ کرے اور اس کے معیار کو بلند کرنے کے لئے سعی بلیغ سے کام لے۔

مکالمہ کی چستی برجستگی۔ قصہ کا تسلسل۔ گانوں کا برمحل استعمال ایسے امور ہیں جن کا خاص لحاظ رکھنا چاہیئے۔ اور جب یہ اعلےٰ تعلیم یافتہ اصحاب کے ہاتھ میں آگیا تو لازمی طور پر اس کا نتیجہ ہوگا کہ ڈرامے دلچسپ اور روزمرہ کے حالات کے مطابق لکھے جائیں گے۔ قابل ڈائرکٹروں کی ہدایات کے ماتحت ایکٹنگ نہایت اعلیٰ ہوگا۔ ٹائیٹل وغیرہ جو لکھے جاتے ہیں وہ اغلاط سے پاک ہونگے اور "ایکٹری" ایک باعزت پیشہ خیال کیا جائے گا۔

"ز"

رباعی

یہ رُوح نہ بندِ غم سے آزاد ہوئی ۔۔۔ دم بھر بھی نہ طبعِ مضمحل شاد ہوئی
خالی نہ رہی ہمارے دل کی بستی ۔۔۔ امید گئی تو یاس آباد ہوئی

روّاں

حال و قال

سالنامہ

سالنامہ کے لئے جو تین سو روپے کے تین انعامی مقابلوں کا اعلان کیا گیا تھا اُس سلسلے میں افسانہ نگاروں نے اپنے شاہکار بھیجنے شروع کر دیئے ہیں جب دس افسانے جمع ہو جائیں گے منصفوں کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

سالنامہ کیلئے نظر افروز تصاویر کی بہم رسانی بھی ہو رہی ہے، ملک کے مشہور آرٹسٹ اپنی بہترین تصاویر عنایت فرما رہے ہیں۔ میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ معاصر نیرنگ خیال، ہمایوں، عالمگیر اور چمن کے سالناموں کی سب سے اچھی تصویریں بھی ادبی دنیا کے سالنامے کیلئے حاصل کروں تاکہ ادبی دنیا کے معزز خریداروں کا تصویری البم ہر حیثیت سے مکمل ہو جائے۔ دوسرے معاصرین کی خوبیاں اپنے رسالے کیلئے فراہم کرنے کو میں اصولاً بُرا نہیں سمجھتا۔ بلکہ اسے ادبی دنیا کی خصوصیات میں اضافہ تصور کرتا ہوں۔

ادبی دنیا کو زیادہ دلچسپ اور زیادہ ہمہ گیر بنانے کیلئے ایک اور تجویز سوچی گئی ہے اُس پر آئندہ نمبر سے عمل درآمد بھی شروع ہو جائے گا۔

تجویز یہ ہے کہ ہر ماہ کے اردو رسالوں میں جو مضمون سب سے بلند سب سے دلچسپ اور سب سے مفید شائع ہوا کرے۔ ادبی دنیا میں رسالہ اور مضمون نگار دونوں کا حوالہ دیکر نقل کر لیا جائے۔ یہ تجویز عملی صورت میں ادبی دنیا کو صحیح معنی میں مکمل بنا دیگی۔

خدائے برتر کا شکر ہے کہ ادبی دنیا کی اشاعت اب روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ادبی دنیا کو محبت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھنے والے اس کی اشاعت میں سرگرمی کا اظہار فرما رہے ہیں۔

پروفیسر گامو

اردو زبان کی ہمہ گیری اور وسعتِ اقتدار کی حیرت زا مثال میں جاپان کے اردو پروفیسر رچی گامو کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے جاپان سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا، ٹوکیو دارالسلطنت جاپان کے اُس کالج میں تعلیم پائی جو بیرونی ممالک کی زبانوں کی تعلیم کیلئے حکومت نے قائم کیا ہے آپ نے اپنی ملکی تعلیم کی تکمیل کرنے کے ساتھ ہی اردو زبان کو سبقاً سبقاً پڑھا اور اُس میں اس حد تک ملک حاصل کیا کہ آج اُسی کالج میں اردو زبان کی تعلیم دے رہے ہیں۔

" تعلیم دے رہے ہیں " کے فقرہ سے شاید قارئین کو دھوکا ہو اور وہ یہ سمجھیں کہ پروفیسر گامو بھی بعض مشرقی زبانوں کے ولایت پاس شدہ ہندوستانی پروفیسروں کی طرح رومن میں اردو لکھتے پڑھتے ہوں گے۔ جیسا کہ ہماری بعض یونیورسٹیوں میں اندھیر گردی ہو رہی ہے۔ تو ہم اُنہیں بتا دینا چاہتے ہیں کہ وہ اِس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ پروفیسر گامو نے اپنے ہاتھ سے اردو میں جو خط ہمیں لکھا ہے ہم اُسے اِس نمبر میں اُن کی تصویر کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ اِس خط کی اردو عبارت کو پڑھ کر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ اِس کا کاتب کسی اردو رسالے کا ایڈیٹر نہیں ہے۔ بلکہ ایک جاپانی ہے جس کی مادری زبان میں ہم ہندوستانیوں کے نزدیک

" چونگ چانگ چُونگ "

کے فقرہ کی طرح چ گاف اور نون ہائے غنہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا

ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر رچی گامو ایسی صحیح اور ادیبانہ اردو لکھنے کی مہارت رکھتے ہیں کہ ہمارے بعض اردو اخبار نویس صحتِ زبان میں برسوں بھی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

پروفیسر گامو جاپانی زبان میں اردو ادب کی مستند کتابوں کا ترجمہ کر رہے ہیں، اور اِس سلسلے میں ہندوستان کی سیاحت کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم اُنہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہندوستان اپنے اِس مہمانِ عزیز کی عزت و احترام میں اپنی دیرینہ روایات کو قائم رکھے گا۔

مولٰنا بدر الاسلام فضلی بی۔ اے جو جاپان کے اسی کالج میں اردو زبان کے پروفیسر اور ادبی دنیا کے دیرینہ قلمی معاون ہیں۔ ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے وطن سے ہزاروں میل کی مسافت پر بھی ادبی دنیا کو یاد رکھا۔ اور نہ صرف یہی کہ " جاپانی زبان کی خصوصیات " پر ایک قابلِ قدر مضمون ادبی دنیا کے لئے ارسال فرمایا بلکہ پروفیسر رچی گامو جیسے ماہرِ اردو سے ہمیں اور قارئین ادبی دنیا کو روشناس کرایا۔

تاریخ ادب اردو

مشہور ادیب مسٹر بابو رام سکسینہ کی انگریزی تصنیف "ہسٹری آف اردو لٹریچر" کا ترجمہ ہے، مرزا محمد عسکری بی اے مترجم نے جگہ جگہ حاشیوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اگرچہ اصل تصنیف کا زور ترجمہ میں قائم نہ رہ سکا مگر ترجمہ سے فائدہ اٹھانے والوں کا دائرہ چونکہ بہت وسیع ہو جائیگا اس لئے اصل تصنیف سے ترجمہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

مصنف پر یوپی اور خاص کر لکھنؤ کے آدمیوں کی مروتوں کا اثر زیادہ پڑا ہے اور قدرتاً یہی ہونا چاہئے تھا۔ دوسرے صوبوں کے بہت سے قابلِ ذکر انشا پردازوں کے تذکرہ سے یہ تاریخ خالی ہے۔ اور کئی ناقابلِ ذکر حضرات مقامی اثرات کے سبب اس میں شامل کر لئے گئے ہیں، امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان خامیوں کو دور کر دیا جائے گا۔

بہر حال اس عدیم النظیر والا طبقہ مصنف اور مترجم دونوں کی قابلِ قدر دماغی کاوشوں کا شکر گذار ہے اردو ادب کیلئے ایسی مفید کتابیں اُس کا متاعِ گراں بہا سمجھی جا سکتی ہیں۔ مسٹر بابو رام سکسینہ نے جس وسعتِ نظر سے کام لیکر اردو ادب کی یہ مفید تاریخ تصنیف کی، اس کے لئے وہ اہلِ ملک کی قدر شناسی کے مستحق ہیں اور مرزا محمد عسکری صاحب نے ایسی گراں وزن تصنیف کا ترجمہ کر کے اپنے ذوقِ انتخاب کی بلندی کا ثبوت دیا ہے۔ کتاب کا حجم آٹھ سو صفحے کے قریب ہے۔ مشہور شعرا کی کئی تصاویر بھی ہیں۔ نو روپے میں نولکشور پریس لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

سید علی اختر صاحب اختر حیدر آبادی کی تصویر اُن کی ایک بلند نظم کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔

بیان کی متانت، خیال کی بلندی و افادت، زبان کی حلاوت و سادگی، مفہوم کی سلاست و عام فہمی اختر صاحب کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

پریم کا سرورق

ادبی دنیا کے دفتر سے بچوں اور بچیوں کے لئے اردو کا ایک ہفتہ وار باتصویر اخبار پریم بھی جاری ہے۔ پریم ہندوستان کے محکمہائے تعلیم میں منظور شدہ ہے اور سرکاری طور پر ہزاروں کی تعداد میں خریدا جاتا ہے۔

پریم کے سرورق سے اُس کے جاری کرنے کا مقصد معلوم ہو جاتا ہے آج ہندوستان کی مختلف قومیں جو ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بچپن ہی سے ہم مذہب کے معنی غلط سمجھتے چلے آتے ہیں۔ ہر مذہب اپنے پیروؤں کو نیکی سکھانے اور برائی سے بچانے کی تعلیم دیتا ہے، ہمسایہ قوموں اور دوسرے مذہب والوں سے محبت اور پریم بھاؤ سکھاتا ہے۔ جب تمام مذہبوں کا نصب العین خدا کی تلاش اور نیکی کا پرچار ہے تو قدرتاً سب مذہبوں کے پیروؤں کو آپس میں میل جول سے رہنا چاہیئے اور ہم اپنے بچوں کو سب سے پہلے یہ بتائیں کہ ہر مذہب اور ہر مذہبی پیشوا کی جس نے دنیا کو نیکی کا سبق دیا عزت کریں۔ اپنے اپنے مذہب پر مضبوطی سے قائم رہ کر دوسرے مذہب والوں سے محبت اور رواداری سے پیش آئیں۔ بچوں کے دل میں رواداری اور باہمی محبت کا نیک جذبہ پیدا کر دیا جائے تو آج کے بچے بڑے ہو کر کل کو بھائیوں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے پیش آئیں گے اور ہمارے ملک کا بدترین میوہ "پھوٹ" ملک سے ناپید ہو جائیگا۔

پریم کے مقصد کو میں نے ذیل کے دو شعروں میں بیان کیا ہے۔

بھارت ماتا سب کی مائی — سب ہندی ہیں بھائی بھائی
من میں بہائیں پریم کی گنگا — ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی

پریم کے سرورق میں مسجد، مندر، گرجا، گردوارہ کی تصاویر دی گئی ہیں اور ہر قوم و مذہب کے بچوں کو مادرِ وطن کی آغوشِ محبت میں دکھایا ہے۔ لڑکے اپنی اپنی*

پریم کی پالیسی کو ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر قوم کے افسرانِ تعلیم اور محبانِ وطن نے پسند کیا ہے۔ مجھے پندرہ سال سے بچوں کی ذہنیت اور افتادِ طبع کے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا ہے اور میں اپنے دیرینہ تجربے کی روشنی میں بچوں کو آسان گھریلو زبان میں اخلاقی اور علمی کہانیوں کے ذریعہ دنیا اور زندگی کے متعلق مزید ہدایات و معلومات بہم پہنچا رہا ہوں۔ میری رائے ہے کہ پریم کو سال بھر برابر مطالعہ کرنے والے بچوں کی دنیا اور زندگی کے متعلق معلومات اور ادبی استعداد انٹرنس میں پڑھنے والے لڑکوں کی برابر ہو جاتی ہے۔

ادبی دنیا کے معزز خریدار اپنے پیارے بچوں کے مطالعے میں پریم کو رکھ کر آزمائیں گے تو میری گذارش کی تصدیق کرینگے۔ پریم کے سرورق (ٹائیٹل) کی سہ رنگی تصویر اس بار ادبی دنیا میں شائع کی جا رہی ہے۔ اس سے اُس کی خصوصیات کا کچھ اندازہ ہو سکیگا۔ پریم ہر ہفتہ شائع ہوتا ہے اور اس کے ہر نمبر میں بلاک کی ایک تصویر اور کئی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں بھی کہانیوں کی تشریح کے طور پر دی جاتی ہیں۔ بچوں کے دوسرے ہفتہ وار پرچوں سے اسکی ضخامت ڈیوڑھی اور سرورق اور اندرونی تصاویر میں سب پرچوں سے ممتاز ہے۔ پریم کا سالانہ چندہ چھ روپے اور محصول وی پی وغیرہ چار آنہ ۴ ماہ ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنہ علاوہ محصول وی پی۔ نمونہ مفت۔

نوٹ:- اہل نظر پریم کی اشاعت میں حصہ لیکر ادبی دنیا کی مشکلات کو کم کر سکتے ہیں۔ — تاجور

* [illegible]

اس نمبر میں شاعر شیوا بیان جناب نفیس خلیلی کی تصویر جا رہی ہے۔ آپ نے رامائن کو اردو نظم کے سانچے میں ڈھال کر ہندو مسلم اتحاد کی ایک منظوم یادگار قائم کی ہے۔ سلاست۔ صفائی۔ بے ساختگی اور دلکشی جناب نفیس کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ — وقار

پنجاب یونیورسٹی کے فارسی کورس

کے اغلاط

ہمیں دفتری مصروفیتوں نے اتنی مُہلت نہ دی کہ یونیورسٹی کے جدید فارسی کورسوں کو وقت نکال کر تفصیلی نظر سے دیکھتے تاہم ایک سرسری نگاہ جن اغلاط پر پڑی اُنہیں ذیل میں درج کرتے ہیں اور آئندہ وقتاً فوقتاً اِس سلسلے میں کچھ نہ کچھ شائع کرتے رہیں گے۔

جدید ایف اے کورس میں بہت سا حصّہ پرانے کورس کا ہے۔ پرانے کورس کی بہت سی غلطیاں پروفیسر متراسنے اپنے ترجمے میں شائع کر ہی دی تھیں۔ اِس لئے اُنہیں نظر انداز کر کے تھوڑے سے جدید حصّے کے اغلاط پیش کئے جاتے ہیں۔

یہ اغلاط ترتیب سے بھی متعلق ہیں اور تصحیح سے بھی اور ایڈیٹر ہی پر اِن سب کی ذمہ داری عائد ہے۔

اغلاط

"حکمت"۔

حکیمے گوید کہ وائے براں کس کہ مبتلا شود بصحبتِ سلطان کہ ایشاں را نہ خویش بود و نہ فرزند، و نہ خادم وکس را آزرم نکنند و گرامی ندارند و مگر آں کس را کہ بدو حاجت داشتہ باشند از روئے دانش یا بجہتِ مردانگی و چوں حاجتِ خویش را از ایشاں یافتند نہ دوستی ماند و نہ وفا و نہ آزرم و کارِ ایشاں اکثر ریا باشد"

(اقتباس از کتاب نصیحۃ الملوک مصنفہ امام غزالی رح ایف اے فارسی کورس صفحہ ۲)

جدید ایف اے کورس کے صفحہ ۲ سے مذکورہ بالا عبارت حرف بہ حرف نقل کی گئی ہے۔ ایڈیٹر نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "نصیحۃ الملوک" سے اس حصّے کو اقتباس کیا ہے۔

اب خدارا کوئی ہمیں بتائے کہ یہ عبارت امام غزالی تو درکنار کسی معمولی فارسی خواں کی بھی ہو سکتی ہے جو گرامر کی پہلی، دوسری، کتاب پڑھ چکا ہو۔ ساری عبارت میں "شتر گربہ" کا عیب پیدا ہو گیا ہے

"سلطان" کا لفظ مفرد ہے۔ مگر اُس کے لئے کہیں کنند، کہیں باشند کہیں ایشاں کہیں ندارد کے متضاد حیثیت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ "کس" کا لفظ "مگر آن کس را" میں مفرد ہے لیکن اُسی "کس" کیلئے "چوں حاجتِ خویش را از ایشاں یافتند" میں "ایشاں" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اِس کی نظیر اردو میں یہ عبارت ہوگی:۔

"بادشاہ اپنی غرض کا بندہ ہوتے ہیں جب اُس کا مطلب نکل جاتے ہیں تو نہ بیٹے کو بیٹا سمجھتا ہیں نہ خادم کا خیال رکھتا ہے۔"

اب اگر مذکورہ بالا نبگالی اردو کسی کورس میں لی جا سکتی ہے تو وہ بلوچستانی فارسی بھی جو امام غزالی رح کے سر تھوپی گئی ہے نصاب میں آ سکتی ہے۔

اگر کتاب نصیحۃ الملوک کے اس نسخے میں من وعن یہی عبارت تھی جو درج کی گئی ہے تو وہ نسخہ قطعاً غلط ہے۔ بہرحال ایڈیٹر کو اقرار کرنا چاہیئے کہ اُس کی تدوین و ترتیب کا یہ نقص ہے۔ جس سے عبارت مضحکہ انگیز بن گئی ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی یا اُسے ایسا ہونا چاہیئے:۔

• حکیمے گوید کہ وائے براں کس کہ مبتلا شود بصحبتِ سلاطین کہ ایشاں را نہ خویش بود و نہ فرزند و نہ خادم وکس را آزرم نکنند و گرامی ندارند مگر آں کس را کہ بدو حاجت داشتہ باشند از روئے دانش یا بجہتِ مردانگی و چوں حاجتِ خویش را ازو یافتند نہ دوستی ماند و نہ وفا و نہ آزرم و کارِ ایشاں اکثر ریا باشد۔

(باقی باقی)

ناز پروردِ تنعّم نبرد راہ بدوست
عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

ناجور

دُنیائے ادب

عربی

خوفناک کہر

جج نے پُرشکوہ آواز میں کہا۔
"میں خیال کرتا ہوں، کہ اگر میں پبلک اور عام آدمیوں کو شریروں کی فتنہ پردازی سے محفوظ نہیں رکھ سکونگا۔ تو یقیناً میں اپنے اہم فرائض کے انجام دینے سے قاصر رہونگا۔ نکولس جرانت! عدالت نے تمہارے لئے پانچ سال قید کی سزا تجویز کی ہے۔ اور تمہاری بیوی کے متعلق چونکہ عدالت یہ رائے رکھتی ہے، کہ اس نے جو کچھ کیا وہ تمہارے مجبور کرنے اور زور ڈالنے سے کیا، اس لئے اسے نو ماہ قید کی سزا دیتی ہے۔

عورت کے وکیل نے کہا۔ "سر مارٹن! یہ عورت بالکل بے گناہ ہے" "میں نظر ثانی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں"! جج نے بے توجہی سے جواب دیا۔

ابھی جج اپنی جگہ سے اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ کسی شخص نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ "کچھ دنوں بعد تم اپنے اس فیصلہ پر نادم ہوگے" کانسٹیبل مجرموں کو لیکر جیل کی طرف چلدیئے۔ اور جو لوگ مقدمہ کی کارروائی دیکھنے کی غرض سے عدالت کے کمرے میں بھرے ہوئے تھے۔ پوری خاموشی سے باہر نکل گئے۔

۲

ایک کوتاہ قامت شخص نے پولیس آفیسر کے کمرہ کا دروازہ کھولا، اور ترساں و لرزاں کمرہ میں داخل ہوا۔ سارجنٹ جو فاگن نے آہستہ آہستہ اپنا سر اوپر اٹھایا، اور آنے والے کی خاکی وردی، بوسیدہ نکٹائی، اور درخشاں جوتیوں کی طرف گہری نظر سے دیکھا اور کہا۔

— ہاں کیا بات ہے؟

— میرا نام ایمز ہے، میں وولکنگ میں مکان نمبر ۱ میں رہتا ہوں۔

— اچھا کیا ہوا؟ جس محلہ میں تم رہتے ہو، وہ تو بہت ہی ساکن اور پُرکشش محلہ ہے۔

— خوفناک کہر۔

— مجھے علم نہیں۔

"جو" اپنی کرسی سے اٹھا اور کہنے لگا۔

— جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو، صاف صاف کہو! اور جلد کہو۔

— میں یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ میری تصدیق فرمادیں اور مجھے دروغ گو خیال نہ کریں۔ یہ کہکر ایمز نے اپنے آپ کو ایک سوفے پر جو سارجنٹ کی کرسی کے قریب ہی پڑا ہوا تھا، ڈالدیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا کر بیٹھ گیا۔ "جو" اسکے قریب آنا چاہتا تھا کہ اتنے میں کمرہ کا دروازہ کھلا، اور ایک طویل القامت چھریرے بدن کا شخص یہ کہتا ہوا کمرہ میں داخل ہوا۔

— آج کے کہر سے خدا بچائے۔ ایسا غلیظ کہر ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا۔ اور ہاں! یہ شخص کون ہے؟

— "ابھی یہاں آیا ہے، اور اپنا نام ایمز بتاتا ہے"۔ "جو" نے جواب دیتے ہوئے کہا، آنے والے نے پھر دریافت کیا۔

— کس غرض سے آیا ہے؟

— مجھے علم نہیں، دریافت کر رہا ہوں۔

مسٹر باؤل پولیس کا مشہور و معروف جاسوس کوتاہ قامت شخص کے قریب آیا، اور اسکی طرف جھک کر اس سے کہا۔

"مسٹر ایمز۔ آپ یہاں کس لئے ہیں"؟ ایمز پہلے تو کانپا، پھر یک بیک اپنی جگہ سے تنکر کھڑا ہوگیا، اور کہنے لگا۔

— بہت ہی عجیب و غریب قصہ ہے۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ میں ایک بے گناہ کی زندگی بچا سکتا ہوں، وہ یقیناً دس بجے تک صحیح اور زندہ تھا، لیکن اسکے بعد . . . . . .

— یہ مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ تم میرے کمرہ میں آجاؤ۔ اور

پھر اطمینان سے تمام واقعہ بیان کرو، "صبو"! تم بھی ہمارے ساتھ چلو، اور تمہارا یمان اُسے کہدو کہ وہ یہاں تمہاری جگہ بیٹھ جائے!

تینوں جاسوس کے کمرہ میں داخل ہوئے۔ باؤل میز کے پیچھے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور ایمز کو اپنے سامنے ایک کرسی پر بٹھلا دیا "جو" دروازہ کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ایمز نے کہنا شروع کیا۔

"میں ووکنگ میں رہتا ہوں۔ وہیں میری اسٹیشنری کی دوکان ہے میری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے، میری پھوپی میرے پاس رہتی ہے جو ماں کی طرح مجھسے محبت کرتی ہے، ایک بوڑھی عورت ہم نے ملازم رکھ لی ہے۔

"میں دکان کا سامان اکثر پھیری والوں سے خریدتا ہوں، صرف سال میں ایک یا دو مرتبہ بعض تجارتی کاموں سے مجھے لندن جانا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں کل ۳ بجے" ہو فرش" گیا تھا۔

کل آپ کو معلوم ہے، تمام فضا پر گار رہا اور غلیظ کہر محیط تھا، اور ایسی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن میں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی، اور میں دوپہر سے پہلے پہلے اپنے بعض کاموں سے فارغ ہو گیا، ایک بجے کے قریب میں نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اور پھر حرکت کرنے والی مشین کی طرح اپنے بقیہ کام انجام دینے میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت کہر بہت غلیظ ہو گیا تھا۔ اور میں کوشش کے باوجود اپنے سے دو قدم کا آدمی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"میں خاموشی سے چلا جا رہا تھا۔ کہ اچانک ایک ایسے شخص سے متصادم ہو گیا۔ جسکے ہاتھ میں بہت سی شیشیاں تھیں، اسکی ساری شیشیاں زمین پر گر گئیں۔ اور گرتے ہی چکنا چور ہو گئیں۔

جب اس غریب نے اپنی ساری پونجی آنکھوں کے سامنے اس طرح ضائع ہوتے دیکھی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، مجھے اس پر بہت رحم آیا۔ اور اس کی آہ و زاری سے میرا دل پھٹنے لگا۔ میں نے جیب سے ایک گنی نکالی اور یہ کہکر اس کے ہاتھ پر رکھدی، لو بھئی یہ تمہارے نقصان کا تاوان ہے۔

"اس شخص کا رنگ گندمی تھا، افریقیہ یا ہندوستان کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے شکریہ کے ساتھ میرے ہدیہ یا زر تاوان کو قبول کر لیا۔ اور اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر مجھے دی اور یہ کہا کہ اس شیشی کی دوا بہت ہی مفید ہے۔ میں نے اس خیال سے اس شیشی کے لینے میں تامل نہ کیا کہ کہیں میں اپنے اس فعل سے اسکے سچے جذبات کو مجروح نہ کردوں، جب میں نے اس غیر معلوم دوا کے فوائد اس سے دریافت کئے، تو اس نے فخر کے لہجہ میں جواب دیا، کہ یہ دوا بصری اعصاب پر اثر ڈالنے میں بہت عجیب ہے، انسان کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ کثیف سے کثیف کہر کے تاریک پردوں کو پھاڑ کر تاریکی میں لپٹی ہوئی چیزوں کو صاف طور پر دیکھ سکے۔

"یہ سن کر میں نے شیشی کا کاگ کھولا۔ اور اُسے لبوں کے قریب لے جا کر ساری دوا غٹ غٹ گلے سے اتار گیا، مجھے کوئی خاص مزہ نہ معلوم ہوا اور نہ میں نے اپنی آنکھوں پر کوئی غیر معمولی اثر محسوس کیا۔

"اسکے بعد مجھے ایک مقام پر خاص کام تھا، میں وہاں چلا گیا لیکن جس شخص سے مجھے کام تھا، اس سے میری ملاقات نہ ہو سکی اور میں اسی وقت اُلٹے پاؤں ووکنگ واپس لوٹ آیا۔

- کیا تم نے یہ تمام واقعات اپنی پھوپی سے بیان کر دیئے؟
- نہیں میں نے ایسا نہیں کیا۔
- اچھا بیان کرو آگے کیا ہوا؟

"آج صبح میں ناشتہ کر رہا تھا، تو میری پھوپی نے یہ کہکر مجھے لندن جانے سے منع کرنا چاہا کہ کہر بہت کثیف ہے اور فضا مکدر ہے، مجھے حیرت ہے کہ میری پھوپی یہ کہہ رہی تھی، اور میں کہر کا نشان تک نہ پاتا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے پائین باغ کا گوشہ گوشہ نہایت صاف طور پر نظر آ رہا تھا، مجھے اس وقت یقین ہو گیا کہ یہ اسی اجنبی تاجر کی حیرت انگیز دوا کا اثر ہے۔

میں لندن گیا۔ اور ایسی حالت میں وہاں کی سڑکوں اور شاہراہوں پر گھومتا رہا جبکہ کہر کی غیر معمولی کثافت کی وجہ سے لوگ دو قدم بھی اطمینان سے نہیں چل سکتے تھے۔ میں قریباً ۵ بجے اپنے کام سے فارغ ہو گیا۔ اور ایک ہوٹل میں جا کر .... چائے پی۔ ہوٹل کی خادمہ نے مجھسے بیان کیا، کہ کہر برابر غلیظ ہوتا جا رہا ہے، اور اس نے کئی آدمیوں کی زبانی سنا ہے، کہ جنوبی ریلوے لائن پر دو گاڑیاں ٹکرا گئیں۔ اور قریباً تیس آدمی موت کی نذر ہو گئے۔

میں یہ سنکر ڈرا کہ کہیں یہ خبر میری بیوی تک نہ پہونچ گئی ہو اور وہ میری طرف سے پریشان ہو، یہ خیال آتے ہی میں اٹھا، اور کہر کے سیاہ پردوں میں لپٹ کر ایک طرف چلدیا، اس وقت چاروں طرف تاریکی تھی، موٹریں اور لاریاں متصادم ہو جانے کے خوف سے سڑک کے دونوں طرف کھڑی ہوئی تھیں، میں صاف طور پر ہر چیز کو دیکھ رہا تھا، میری نظر کہر کے سیاہ پردوں کو پھاڑ کر سڑک کے آخری کنارے تک پہنچ رہی تھی۔

"میں گھومتا گھامتا "براجوا سٹریٹ" پر آن پہنچا، میں نے ایک شخص کو اپنے سے تقریباً پانچ گز کے فاصلہ پر دیکھا، یہ شخص خاکی کپڑے پہنے ہوئے تھا، اور میرا خیال ہے کہ اس نے عمداً یہ کپڑے زیب تن کئے تھے، تاکہ کہر کی سیاہی میں کوئی اسے دیکھ نہ سکے، کوئی دومنٹ میں ایک جوان عورت اسکے قریب آئی، یہ عورت بھی خاکی کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھی۔ میں نے اسے کہتے ہوئے سُنا۔

— کیا تم کام کر چکے؟

اجنبی نے جواب دیا۔

— ابھی نہیں، کیا میں نے تم سے یہ نہ کہا تھا، کہ کام دس بجے سے پہلے نہیں ہو سکتا؟

— تم بھول گئے کیا؟ تو بتاؤ تم نے کام انجام دینے کیلئے کیا سوچا ہے؟

اجنبی نے جیب سے ایک چمکدار اور تیز چھری نکالی۔ جس کا دل تقریباً ایک فٹ اور عرض دو انچ تھا، چھری دیکھکر میرے تمام جسم میں لرزہ پڑ گیا۔ لیکن میں ہمت کرکے اس طرف بڑھا جہاں وہ دونوں کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دونوں مجھے نہیں دیکھ سکینگے، میں نے عورت کو کہتے سُنا۔

— ۵ برس تمہیں اور ۹ ماہ مجھے!!!

— کس میں یہ طاقت ہے کہ مجھے جیل بھیج سکے۔

— تم سینٹ انڈریوز کیسے جاؤ گے!

— پیادہ

— پھاند جاؤ گے؟

— ہاں پھاند جاؤنگا۔

— اچھا گڈ لک خدا تمہاری مدد کرے۔

اجنبی نے جوان عورت کو گلے سے لپٹایا، بوسے دیئے اور ایک طرف چلدیا۔ اسوقت مجھے یقین ہو گیا۔ کہ یہ شخص کسی کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ میں نے ایک شریف وطن پرست انسان ہونے کی حیثیت سے یہ مناسب نہ سمجھا، کہ میں دوکنگ لوٹ آؤں اور اس اجنبی شخص کے پُردنائت منصوبے کے ناکام بنانے میں کوئی سعی نہ کروں۔ چنانچہ میں اسکے پیچھے ہو لیا۔ میں ربڑ کے تلے کا جوتہ پہنے ہوئے تھا۔ اسلئے وہ یہ محسوس نہیں کر سکتا تھا، کہ کوئی شخص اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ راہ میں میں نے کوشش کی کہ کسی پولیس کے آدمی سے مدد لوں، لیکن مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس وقت میری آنکھوں سے حیرت انگیز دوا کا اثر زائل ہونا شروع ہوا، اور نظروں کے سامنے سے تمام چیزیں یکے بعد دیگرے غائب ہونے لگیں، اور کوئی دو ہی لمحوں میں تمام فضا تاریک ہو گئی۔ اور اس تاریکی میں وہ اجنبی غائب ہو گیا۔

میں گھٹا ٹوپ اندھیری میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ ایک پولیس کے آدمی سے میری ملاقات ہو گئی۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے کسی قریب کی پولیس چوکی پر پہنچا دے وہ مجھے یہاں لے آیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی اتنا وقت باقی ہے کہ ایک بے گناہ کو موت کے پنجے سے چھڑایا جا سکے،

مسٹر باؤل نے گھبرا کر گھڑی کی طرف نظر کی، اور کہا۔

— ہاں۔ آٹھ بجے ہیں، وقت میں گنجایش ہے، میں جانتا ہوں کہ یہ اجنبی کون ہے، مجھے معلوم ہوا ہے، کہ یہ شخص آج ہی ڈانوز جیل سے فرار ہوا ہے، کیا تم اسے دیکھکر پہچان لوگے؟

— مجھے یقین نہیں ہے، اس لئے کہ وہ میری طرف پشت کئے ہوئے تھا۔ ہاں اس عورت کو میں فوراً پہچان سکتا ہوں

— وہ اسکی بیوی ہے۔ خباثت نفس اور دغائت میں اپنے شوہر سے دو جوتے آگے ہے۔ اس وقت میں اسکاٹ لینڈ یارڈ جا رہا ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ تم میرے پیچھے یہاں ٹھہرنے پر مجبور ہوگے،

- یہ تو میں پہلے سے جانتا تھا، لیکن یہ چاہتا تھا کہ اپنی پھوپی سے مل لیتا۔

- تم فون پر اپنی پھوپی سے بات کرسکتے ہو، وہ دیکھو دوسرے کمرہ میں ٹیلیفون لگا ہوا ہے،

ایبز کمرہ سے باہر چلا گیا، اور باؤل نے "با بیان" کو کہتے سُنا۔

- بہت اچھا جناب۔

اسکے بعد پیروں کی چاپ سنائی دی۔ اور ایبز ٹیلیفون کے کمرہ میں غائب ہوگیا، باؤل کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اور وہ ٹیلیفون کے کمرہ کی طرف بھاگا۔ اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب اس نے ٹیلیفون کے تاروں کو کٹا ہوا پایا،

۳

اگلے دن کے روزناموں میں یہ خبر شایع ہوئی۔

"۱۰ ار ماہ رواں کو شام کے ۷ بجے سرمارٹن دنج، کو انکی اپنی کوٹھی واقعہ سینٹ انڈریوز میں نہایت بیدردی سے قتل کردیا گیا، قاتلہ جسکا نام اینا جرانت ہے اب سے تقریباً گیارہ ماہ پہلے ایک ہیبت انگیز سرقہ کے جرم میں ۹ ماہ کیلئے قید کردیگئی تھی۔ اس خوفناک حادثہ قتل میں قاتلہ کا سفاک شوہر نکوس جرانت بھی شریک ہے، یہ شخص حادثہ کے دن ددالنور جیل سے جہاں وہ اپنی پانچ سال قید کے سخت ایام گذار رہا تھا بالکل پراسرار طریق پر فرار ہوگیا۔ اور شل پولیس چوکی پر، جو سینٹ انڈریوز سے تقریباً پانچ سو گز کے فاصلہ پر واقع ہے، بھیس بدل کر آیا، اور اس خیال سے کہ سرمارٹن کی کوٹھی سے فون پر پولیس کو طلب نہ کیا جائے، ٹیلی فون کے تار کاٹ کر کہر کی تاریکی کیطرف بھاگ گیا،

(ترجمہ از "الفکاہہ" مصر)

سید شوکت علی سبزواری

(مولوی فاضل منشی فاضل)

سنسکرت

عورت

عورت رنج میں ساتھ دیتی ہے اور راحت کو دوبالا کردیتی ہے باعصمت عورت عموماً مغرور اور شوخ ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے اپنی عصمت پر ناز ہوتا ہے۔ عورت مرد کے لیے بیش بہا نعمت اور خدائی برکت ہے۔ عورت نہایت بے تکلفی کیساتھ شوہر سے ان مشکلات کا شکوہ کرتی ہے۔ جو اسے گھر میں پیش آتی ہیں۔ لیکن اگر اسے عیش و آرام میسر ہو تو وہ شاذ و نادر ہی اسکا ذکر کرتی ہے (کالیداس)

انگریزی

۱- شیریں کلامی، خوش اخلاقی دو ایسی چیزیں ہیں کہ انسان ان کی بدولت دنیا میں جنت کے مزے لے سکتا ہے۔

۲- مال و دولت کا فقدان مفلسی نہیں، حقیقی مفلسی جوش، ہمت اور اُمنگ کا نہ ہونا ہے۔

۳- بہتر کام وہی ہے۔ جو خدا کی خوشنودی کے لیے کیا جائے۔

۴- اے بندے! ہر وقت خدا کی ذات پر بھروسہ رکھو! اپنی عقل و فراست پر نازاں نہ ہو۔

۵- جنت کا راستہ اسی دنیا میں سے ہوکر گذرتا ہے، اگر اللہ کی خوشنودی مدنظر رکھتے ہوئے دنیا میں نیک عمل کئے تو جنت میں پہنچ جانا... اسکی رحمت سے بعید نہیں۔

۶- تم یہ کہنے کے مستحق نہیں کہ میرا مکان بہشت ہے تاوقتیکہ اپنے مکان کو بہشت بنانے کی کوشش نہ کرو۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ

"میں بہشت میں جاؤنگا!" بیجا ہے، تاوقتیکہ بہشت میں جانے کے کام نہ کیے جائیں۔

۶۔ اگر دنیا میں رہنا ہے تو علم و ہنر سیکھو۔

(ترجمہ) جان محمد عاطف از رُڑکی

محبّت

سمندر کی طرح محبت کی بھی کوئی تھاہ نہیں۔ محبت پہاڑ کی طرح لازوال اور قائم ہے۔ (برے)

محبت اور موت ہی دو ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو زمین سے آسمان پر لے جاتی ہیں۔ (ایمیل ڈگلس)

محبت ہی ہمکو غم و فکر کے بوجھ سے نجات دلا سکتی ہے (امرسی)

محبت ایک ایسی آگ ہے جو اپنی گرمی سے آہنی دل کو موم کیطرح پگھلا دیتی ہے۔ (مکلارن)

محبت ہی تمام دنیا کی بنیاد ہے۔ اسی کی وجہ سے تمام دنیا اب تک قایم ہے۔ جیدن محبت کا خاتمہ ہوگا، اسدن دنیا کا ہرگز بقا نہ ہوگا۔ (ریورنڈ جین)

محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جو بغیر تلوار کے حکومت کرتی ہے (ماکس میولر)

(ترجمہ) پرتیم سپالوڑی

فرانسیسی

شہرت

جب ایک دفعہ شہرت کا غلغلہ بلند ہوتا ہے تو نیند حرام ہوجاتی ہے۔ (والٹیر)

شہرت اچھی چیز ہے بشرطیکہ دیرپا اور لازوال ہو۔ (نپولین)

تلوار اور قلم

دنیا میں صرف دو طاقتیں ہیں — تلوار اور قلم۔ لیکن جیت ہمیشہ قلم کی ہوتی ہے۔

میں چار متخاصم اخباروں سے اتنا ڈرتا ہوں۔ جتنا ہزار ہا سنگینوں سے بھی نہیں ڈرتا۔ دنیا تخیل کے زیرنگیں ہے۔ (نپولین)

تاریخ

دنیا ہزار سال کی پرانی ہے۔ ہمیں اس کے تجربات سے سبق لینا چاہیئے۔ پرانے رسوم نئے نظریوں سے بہتر ہیں۔ (نپولین)

تاریخ اقوام عالم کو بہترین درس دیتی ہے (والٹیر)

جرمن

لندن کی سیر

میری آنکھوں نے وہ عظیم ترین چیز بھی دیکھی ہے کہ زمانہ کسی انسانی دل و دماغ کی جس سے توا منع کرسکتا ہے۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔ لیکن اب تک سراپا حیرت بنا ہوں۔ مکانات کے پتھریلے جنگل اب تک میرے آئینۂ دل پر مرتسم ہیں۔ ان کے درمیان بازاروں میں زندہ انسانوں کی ایک رو بہتی نظر آتی ہے اس سے میری مراد شہر لندن ہے۔

رجسٹرڈ — ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد ۵ — بابت ماہ اگست ۱۹۳۱ء — نمبر ۲

تصاویر:- سہ رنگی: (۱) عشق بے رحم۔ یک رنگی: (۲) خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم (۳) مسٹر کمار کرشن مترا ایم اے۔ (۴) خیال پرست۔ (۵) مبڈونا۔ (۶) مولوی فتح محمد خاں صاحب جالندھری۔ (۷) مہارانی کشمیر (۸) اختر انصاری (۹) مس حمیدہ ادیب۔

حال وقال

سالنامہ

سالنامہ کی ترتیب کا کام زیادہ تر مولٰنا سید حسن برنی ایڈووکیٹ بلند شہر رکن ادارہ ادبی دنیا انجام دیں گے۔ سید صاحب کی تصنیفی شہرت "البیرونی" جیسی گراں مایہ کتاب کے سبب دنیائے اردو میں ثبت دوام حاصل کر چکی ہے۔ ملک کے بلند رتبہ رسالوں میں آپ کے قابلقدر مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور ادبی دنیا تو آپ کی توجہاتِ بیکراں کا سب سے زیادہ حصہ دار بن چکا ہے۔ آپ نے میری اس درخواست کو بڑی محبت سے منظور فرمایا ہے کہ سالنامہ کے لئے فراہمی مضامین اور ترتیب کی ذمہ داری وہ اپنے سر لیں اور میں اس سلسلے میں اُن کی زیر ہدایت کام کروں۔

اب اردو کے "میر تقیوں" سے گذارش ہے کہ

"میں کیا اور میرا مضمون کیا؟"

یا "عدیم الفرصتی" کے فقرات لکھ کر ہمارے حوصلوں پر افسردگی طاری نہ کریں۔ اور رسالہ ادبی دنیا کو جس کے اصلی مالک ملک کے اہل قلم اور اس کے قدر شناس ہی ہو سکتے ہیں اپنانے سے احتراز نہ فرمائیں۔

میرا کالج گرمیوں کی چھٹیوں کے سبب ۲۷ جون سے ۲۲ ستمبر تک کیلئے بند ہو چکا ہے۔ میں یہ وقت یوپی کے حسب ذیل شہروں کی سیر اور ان شہروں میں رہنے والے اصحاب کی ملاقات میں گذاروں گا۔

بریلی۔ بدایوں۔ شاہجہان پور۔ ہردوئی۔ لکھنؤ۔ گورکھپور۔ الٰہ آباد کانپور، آگرہ۔ دہلی۔ بنارس۔ جونپور اور ممکن ہوا تو عظیم آباد اور کلکتہ تک جاؤنگا۔

ممکن ہے میری غیر موجودگی کے سبب ادبی دنیا کی ترتیب یا تصحیح میں کچھ خامیاں رہ جائیں۔ اس نمبر کی ترتیب و تصحیح بھی میری غیر موجودگی ہی میں تکمیل پذیر ہوئی ہے۔

حنیف ہاشمی مرحوم۔ ادبی دنیا کے پہلے چار نمبروں میں میرا شریک ادارہ میرا ایک عزیز شاگرد حنیف ہاشمی بھی تھا۔ یہ صالح، نوجوان بہت ہونہار ادیب تھا۔ اردو ادب کی بہت سی توقعات اس سے وابستہ تھیں، لاہور کے بعض مہربانوں کے غلط مشوروں کا شکار ہو کر دفتر ادبی دنیا کو چھوڑ کر اخبار ریاست میں چلا گیا تھا۔ دہلی کی آب و ہوا اُسے راس نہ آئی اور وہاں سے سل اور دق میں مبتلا ہو کر وطن آ گیا۔ پچھلے دنوں اُس کے وطن (رجوں) سے اُس کے انتقال کی خبر آئی ہے۔ مجھے اس خبر نے بیحد صدمہ پہنچایا، میں نے ابتدا ہی میں مرحوم کی غیر معمولی ذہانت سے اندازہ کر لیا تھا کہ حالات جلد سے جلد اِسے یا تو بلندیوں پر پہنچا دیں گے اور یا پھر اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ افسوس ہے کہ اُسے مساعد حالات نصیب نہ ہوئے اور اپنی ہزاروں آرزوؤں کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا۔

ادبی دنیا کے "اہل نظر" اس کی اشاعت کی جانب متوجہ ہو گئے ہیں اور اب مجھے توقع ہو چلی ہے کہ اُن کی قابلقدر توجہ ادبی دنیا کی اشاعت کو جلد دس ہزار تک پہنچا دیگی۔ جب سے ادبی دنیا میں نئی سے نئی دلچسپیوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے اور اِسے ہر عمر اور ہر طبقے کے اُردو خوانوں کے لئے دلچسپ بنانے کی تجاویز پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔ اہلِ ملک بھی اِسے نگاہِ قبول سے دیکھ رہے ہیں۔

لاہور کے مشہور بنگالی ڈاکٹر مسٹر ایس کے مترا ایم بی بی ایس کے چھوٹے بھائی مسٹر کمار کرشن مترا ایم اے نے اس سال ریاضی کا امتحان قابل رشک عزت کے ساتھ پاس کیا ہے۔

آپ کی عمر اس وقت کل بیس سال کی ہے۔ اس عمر میں ریاضی کے امتحان میں فسٹ ڈویژن میں اوّل درجہ حاصل کرنا اور چھ سو نمبروں میں سے ۵۳۶ نمبر لیکر بیس سال کا ریکارڈ توڑ دینا ایسا امتیاز ہے جس پر وہ اور اُن کی قوم جسقدر بھی فخر کرے بجا ہے۔

خان بہادر شیخ نور الٰہی ۔ لاہور ڈویژن کے انسپکٹر مدارس خان بہادر شیخ نور الٰہی ایم اے آئی ای ایس نے کرنل رائٹ سابق ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کے ایک سرکلر کی سررشتہ کی مصلحتوں کی بناپر تجدید کی تھی اِس سرکلر کی رُو سے عربی، فارسی، ہندی وغیرہ کی تعلیم پانچویں جماعت کی بجائے ساتویں سے شروع ہوا کرے گی ۔

شیخ صاحب کے بعض ماتحتوں نے جواپنی کجراہیوں اور محکمانہ غلط کرداریوں کے سبب اُن کے زیرِ عتاب تھے اِس معولی سے واقعہ کو فرقہ داری کا رنگ دیکر مختلف ناموں سے ہندو اخباروں میں شائع کراکے ایک طوفان برپا کردیا ۔

سمجھدار اور متین ہندوؤں کے ایک وفد نے جب شیخ صاحب سے اِس امر کی شکایت کی تو اُنہوں نے تمام تفصیلات پر روشنی ڈال کر یہ بتا دیا کہ اِس سرکلر سے میرا کوئی تعلق نہیں، کرنل رائٹ نے اِسے جاری کیا تھا اور اب تخفیفِ اخراجات کی بناپر اِس کی تجدید ہوئی ہے اور اِس سِلسلے میں ہندی کے ساتھ عربی، فارسی بھی شامل ہیں اور پھر یہ کہ اسی قسم کا سرکلر بعض دوسرے ڈویژنوں میں بھی جاری ہوا ہے ۔

ہندو حضرات کے اِس نمائندہ وفد کی درخواست پر شیخ صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ڈائرکٹر کو لکھیں گے کہ اِس سرکلر پر عملدرآمد نہ کیا جائے ۔ چنانچہ انہوں نے ایک پُرزور تحریر کے ذریعہ ڈائرکٹر صاحب کو سرکلر پر عملدرآمد سے روک بھی دیا ہے ۔

انبالہ ڈویژن میں پیر محمد نواز صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کرنال نے اسی قسم کے کسی سرکلر کی تعمیل کرنی چاہی تھی ۔ اِس بنا پر خان بہادر شیخ نور الٰہی کے ساتھ پیر صاحب کو بھی ہدفِ ملامت بنایا جارہا ہے ۔

اصولِ صحافت یہ ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق مفصل واقفیت بہم پہنچانے کے بعد اُس کے متعلق رائے شائع کی جائے ۔ اور اگر کوئی رائے پوری واقفیت حاصل کرنے سے پہلے غلطی سے شائع کردی گئی ہے تو صحیح اطلاع کے بعد اُس کی تردید شائع کرنے میں دریغ نہ کیا جائے ۔ مگر اِس دور کی ملعون فرقہ دارانہ جنگ میں اہلِ صحافت نے حق و انصاف سے دست برداری دے رکھی ہے ۔ ہندو کسی مسلمان سے اور مسلمان کسی ہندو سے انصاف کرنے کو کسی طرح آمادہ نہیں ۔

خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب کو جاننے والے ہزاروں ہندو ان میں ایمانداری کے ساتھ کوئی ایک بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ متعصب افسر ہیں ۔ بارہ منگا ہائی اسکول کا واقعہ ایسا تھا کہ کوئی فرقہ پرست ہندو انسپکٹر بھی اُسے نظر انداز نہ کرتا ۔ اسکول اور اُس کا مینجر اِس خطرہ سے سلامت نہ نکل سکتا ۔ لیکن شیخ صاحب نے معمولی تنبیہ کو کافی سمجھ کر ایک ہندو ہائی اسکول کو خطرہ سے بچالیا، خود اُس کا مینجر بھی راقم الحروف کے سامنے اظہارِ حیرت و سپاس کرچکا ہے ۔

شیخ صاحب نے چودھری گیان سنگھ کو لاہور ڈویژن میں بہت کوشش کرکے اپنا ڈپٹی انسپکٹر بنوایا اور پھر اپنے تبادلہ کے وقت امکانی طاقت صرف کرکے پورے ڈویژن کا انسپکٹر بنوادیا ۔ حالانکہ راجہ فاضل محمد خاں صاحب اُن سے سینیر اُن سے زیادہ کارداں اور اپنی خدمات کے سبب سب سے زیادہ اِس جگہ کے مستحق تھے ۔ مگر شیخ صاحب نے حق قرابت، حق دوستی اور حق خدمات کو یک قلم نظر انداز کرکے راجہ صاحب کی بجائے چودھری گیان سنگھ صاحب کو اپنی جگہ دلوائی ۔ محکمے کے تمام مُسلمان اُنہیں ہندو نواز کہتے ہیں ۔ راقم الحروف کے سامنے بعض مسلمان ڈسٹرکٹ انسپکٹروں نے بارہا ازراہِ شکائیت ہندو مسلم کا سوال شیخ صاحب کے سامنے پیش کیا ہے تو ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جس میں شیخ صاحب نے اُنہیں تلخ روئی کے ساتھ یہ جواب نہ دیا ہو کہ

> "میرے سامنے ہندو مسلمان کا سوال کبھی نہ پیش کیجئے ۔
> مَیں تو جسے ترقی کا اہل پاؤنگا آنکھ بند کرکے اُسے آگے
> بڑھاؤنگا ۔ وہ مسلمان ہو یا ہندو اِس کا لحاظ ہرگز نہ کرونگا "

ہمارے ہندو معاصر شیخ صاحب کو ظالمانہ حدتک متعصب ظاہر کرتے ہوئے اِس پر ذرا بھی غور نہیں کرتے کہ اُس سرکلر میں ہندی کے ساتھ عربی اور فارسی بھی ہے ۔

فارسی مسلمانوں کی حکومتی زبان ہے ۔ اور عربی تو خالص اسلامی زبان ہے جس کی تعلیم از روئے مذہب ضروری ہے ۔ مگر ہندی ہندو بھائیوں کی نہ حکومتی زبان ہے نہ مذہبی ۔

اس سرکلر کی شکائیت تو دراصل مسلمانوں کو کرنی چاہئے تھی ۔ مگر تعصب کا بُرا ہو کہ یہ بیماری براہِ راست بصیرت اور بصارت پر نازل ہوتی ہے اور پھر اپنے مریض کو دیکھنے اور سوچنے سے یکبارگی محروم کردیتی ہے ۔

ہم رائے صاحب لالہ رگھوناتھ سہائے بی اے ہیڈ ماسٹر

دیال سنگھ ہائی اسکول اور دوسرے ہندو ہائی اسکولوں کے اُن ہیڈ ماسٹروں سے درخواست کرتے ہیں جو آزاد رائے کے اظہار میں دلیر ثابت ہوئے ہیں کہ وہ شیخ صاحب کے تعصب کی بابت جو صحیح رائے رکھتے ہوں ہندو پبلک کو اُس سے مطلع کر کے غلط فہمیوں کو دور کریں کیونکہ ایک غیر متعصب افسر پر جب خواہ مخواہ تعصب کی تہمت تراشی جائے اور پوری سازش کے ساتھ اُس تہمت کی اشاعت کی جائے تو اُس افسر کو کچھ نقصان پہنچے یا نہ پہنچے اِس شور بے ہنگام کا نتیجہ یہ ضرور نکلتا ہے کہ وہ افسر صحیح معنی میں متعصب ہو جایا کرتا ہے۔

تاجور

خان بہادر مرزا سلطان احمد مرحوم ۔ دنیائے ادب اس ماہ اردو کے نامور، بلند نظر اور فاضل ادیب خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب سے بھی محروم ہو گئی۔ آپ نہایت قابل انشا پرداز تھے۔ اردو کا کوئی رسالہ اُن کے رشحات قلم سے محروم نہ رہا ہوگا۔ قانون وعدالت کی اہم مصروفیتوں کے باوجود بھی مضامین لکھنے کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ بہت جلد مضمون لکھتے تھے۔ عدالت میں ذرا سی فرصت ملی تو وہیں ایک مضمون لکھکر کسی رسالہ کی فرمائش پوری کر دی۔ اُردو زبان کے بہت سے مضمون نگاروں نے اُنکی طرز انشا کو سامنے رکھکر لکھنا سیکھا۔ افسوس کہ ایسا ہمہ گیر وہمہ رس انشا پرداز موت کے ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا۔

مرزا صاحب مرحوم سیلف میڈ (خود ساز) لوگوں میں سے تھے۔ آپ نے پٹواری کی حیثیت سے ملازمت شروع کی اور ڈپٹی کمشنری تک ترقی کی۔ آپ مرزا غلام احمد صاحب (مسیح موعود) کے فرزند تھے۔ اپنے محترم باپ کی زندگی میں ان کی "نبوت بروزی" پر ایمان نہیں لائے۔ ان کی وفات کے بعد اور اپنی وفات سے کچھ دن پہلے اپنے چھوٹے بھائی حضرت مرزا بشیر الدین محمود خلیفۃ المسیح کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اُردو میں بیش قیمت لٹریچر آپ نے اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا ہے علم اخلاق پر آپ کی کتابیں اردو زبان کی قابل قدر تصانیف میں سے ہیں۔

اِس نمبر کی سہ رنگی تصویر

قدیم مشرقی طرز کے طویل افسانوں کی طرح انگریزی کے ایک افسانہ کا ہیرو جیسن اپنے باپ کا کھویا ہوا تاج و تخت لینے کی خاطر غنیم کے ملک میں جاتا ہے۔ بادشاہ کو جوتشی بتاتے ہیں کہ یہ شخص تجھ پر غالب آئیگا۔ بادشاہ اُس کے سامنے یہ شرط پیش کرتا ہے کہ اگر تو سنہری مینڈھے کی پشم (جسے اس زمانے میں ناممکن الحصول خیال کیا جاتا تھا) لے آئے تو یہ بادشاہت تجھے دیدونگا۔ جیسن شرط پوری کرنے کی غرض سے روانہ ہوتا ہے۔ راستے میں بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں، ایک بادشاہ کی لڑکی میڈیا جو ساحرانہ قوتوں کی مالک تھی جیسن کے عزم واستقلال پر عاشق ہو جاتی ہے اور اپنی ساحرانہ قوتوں کے ساتھ اپنا دل بھی اسے دیدیتی ہے۔ جیسن میڈیا اور اس کے بھائی کو ساتھ لیکر اپنی مہم پر روانہ ہوتا ہے اور مینڈھے کی کھال سنہری پشم سمیت اُتار لیتا ہے۔ میڈیا کے باپ کو جب یہ خبر ملتی ہے تو وہ جیسن کا تعاقب کرتا ہے۔ میڈیا باپ کے جہاز کو روکنے اور جیسن کو بچانے کے لئے اپنے بھائی کو سمندر میں پھنکوا دیتی ہے، تاکہ باپ کا جہاز بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر رُک جائے۔ تصویر میں یہی منظر دکھایا ہے۔ تصویری نظم اسی کو دیکھ کر فکر کی گئی ہے۔

آئندہ نمبر کے بعض اہم مضامین

عمر گرامی کے عزیز لمحے، مولانا سید ابن الحسن صاحب فکر ایم اے کا انسانی مصروفیتوں پر ایک قابل قدر مضمون۔

تنقید سیاست اور علامہ شبلی نعمانی۔ مولانا سید مقبول حسین صاحب بی اے کی ایک دلچسپ تالیف۔

بھو بھوتی ۔ سنسکرت کے ادب قدیم کے مشہور ماہر اور کالیداس کے ہم پایہ شاعر بھو بھوتی کا تذکرہ۔

مسئلہ تکوین انسانی ۔ مولانا سید حسن برنی صاحب بی اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ رکن ادارہ کے مضمون "تاریخ اور وقت" کے سلسلے میں ایک دلچسپ اور اہم بحث

ادارہ

لاہور میں چند خوش مذاق نوجوانوں نے "دی ایسٹرن فلم آرٹ پروڈیوسرس کلب" کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد رکھی ہے، جس کا مقصد مشرقی فلموں پر تنقید سینما کے متعلق مضامین اور لکچروں کا اہتمام، اور معیاری ڈرامے تیار کرنا ہے۔ گذشتہ دنوں میں اِس کلب کے اہتمام سے "سینما کی ضرورت" پر وائی ایم سی ہال میں کامیاب تقریریں ہوئیں۔ فلمی دنیا سے دلچسپی لینے والے حضرات کو اس کلب کی طرف متوجہ ہونا چاہئیے۔ پراسپکٹس منگانے کا پتہ:۔ دی ایسٹرن فلم آرٹ پروڈیوسرس کلب، معرفت جنرل سیکرٹری ... لاہور

آئینۂ عالم

ترکی میں قیامِ امن

انگورہ میں جمہورِ ترکیہ کے وزیرِ اعظم عصمت پاشا کی تازہ تقریر سے اس خلفشار کی حقیقت کھُل گئی، جو سال گذشتہ کے اختتام پر ترکی حکومت کے خلاف رونما ہوا اور جسے کمال پاشا کے زبردست ہاتھوں نے آناً فاناً فرو کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اس تحریک کا دائرۂ اثر محدود اور خالصۃً مقامی تھا، لیکن اس کی پشت پر ان لوگوں کی مضبوط جماعت تھی جو مذہب اور سیاسیات کی علیحدگی سے بیزار ہیں۔ عصمت پاشا نے اس افسوسناک غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے کہا:- "حکومتِ ترکیہ کے پیشِ نظر یہ مقصد ہے کہ مذہب کے معاملہ میں ہر شخص کو کامل آزادیٔ ضمیر کا حق حاصل ہو۔ اور کوئی شخص سیاسی قوت کی بدولت دوسرے کے مذہبی عقیدہ کی تبدیلی کے لئے جبر و اکراہ سے کام نہ لے سکے" آپ نے غیر مبہم انداز میں کہا کہ حکومتِ ترکیہ کے اس مسلک سے مذہب کی تحقیر مقصود نہیں۔

ترکی حکام نے فوجی نظام کے ذریعہ جس بغاوت کا استیصال کیا ہے۔ اس کی ابتدا موضع 'مینی مین' سے ہوئی۔ یہاں ایک درویش محمّد نامی نے جلسۂ عام میں نہایت اشتعال انگیز تقریر کی۔ اور جب فوجِ مستحفظ کے ایک نوجوان افسر نے اسے روکا۔ تو درویش کے حامیوں نے اُسے ہلاک کر ڈالا۔ اس پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ فوجی سپاہی آئے اور انہوں نے باغیوں کو گرفتار کر لیا۔ دیگر حصصِ ملک میں بھی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ کورٹ مارشل نے ۲۷ ملزموں کو رہا کر دیا۔ ۲۸ کو پھانسی کی سزا دی گئی اور ۵۰ کو قید بامشقت کی سزا کا حکم ملا۔ اس اثنا میں مصطفےٰ کمال پاشا نے ملک کے طول و عرض میں دورہ کیا، اور جا بجا عوام کو اپنی شکایات پیش کرنے کا موقع دیا۔ اناطولیہ اور تھریس میں آٹھ ہفتے دورہ کرنے کے بعد غازی ممدوح سمرنا اور جنوبی صوبوں میں تشریف فرما ہوئے۔ آپ نے متعدد درس گاہوں کا معائنہ کیا۔ اور طلبا سے تاریخِ ترکیہ کے متعلق سوالات پوچھے۔ اس وسیع سیاحت کے بعد آپ ماہِ مارچ کے اوائل میں انگورہ واپس تشریف لائے اور عوام کے جذبات کی تسکین کے لئے آپ نے نیشنل اسمبلی یعنی مجلسِ ملیّہ کو توڑ کر جدید انتخابات کا اعلان کر دیا۔ مجلس مذکورہ ۳۱۵ ارکان پر مشتمل ہے۔ اور یقین کامل ہے کہ ان میں کم از کم ۲۰۰ ممبر از سرِ نو منتخب کئے جائیں گے۔ اقتصادی تنگی کو مدِ نظر رکھ کر یکم جولائی ۱۹۳۱ سے آئندہ سال کے میزانیہ میں بھاری تخفیف کر دی گئی ہے۔ جہاں گذشتہ سال کا بجٹ ۱۱ کروڑ ڈالر تھا وہ اب ۹½ کروڑ ڈالر سے زیادہ نہیں ہو گا (ایک ڈالر تین روپیہ کے مساوی ہے) نیز مجلسِ ملیہ کے ارکان کا مشاہرہ ایک تہائی کم کر دیا جائے گا۔

روس کی جنگی تیاریاں

روس جہاں ایک طرف اپنے پانچسالہ اقتصادی پروگرام پر سرگرمی سے عمل کر رہا ہے۔ وہاں ساتھ ہی ساتھ اس کی جنگی تیاریاں بھی بڑے زور شور سے جاری ہیں۔ اور اسلحہ کے کارخانے بہت تیزی سے کھل رہے ہیں۔ مختلف ممالک سے مشینری اور انجنیئر روس میں بلائے جا رہے ہیں۔ اِس سلسلے میں روس کی سب سے بڑی کوشش ہوائی جہاز بنانے کے لئے ایلومینیم کی صنعت کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ حال ہی میں اس نے ایک برطانی کمپنی سے ۳۰ لاکھ ٹن ایلومینیم خریدا ہے۔ روس کی جنگی تیاریوں میں برطانیہ کا امداد دینا تعجب کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔

ایسٹ اینڈ ویسٹ کارپوریشن

ہندوستان میں دس کروڑ روپے کے سرمایے سے اس نام کی ایک نئی تجارتی کمپنی قائم ہوئی ہے جس کا سرمایہ دس دس روپے کے ایک کروڑ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کمپنی کے قیام کی بڑی غرض یہ ہے کہ کپڑا۔ سوت۔ خام اشیاء۔ رنگ وغیرہ کی درآمد برآمد اور خرید و فروخت کو فروغ دیا جائے۔ اور تبادلہ کا کام کرے۔ یہ کمپنی خالص اسلامی ہو گی۔ مسلمانانِ ہند کا یہ اقدام ان کے تجارتی شوق کی دلیل ہے۔

ادارہ

پنجاب یونیورسٹی

(۴)

(۱) پنجاب یونیورسٹی کی غلط کاریوں پر ادبی دنیا میں جو سلسلۂ مضامین شائع کیا جا رہا ہے۔ اہلِ پنجاب نے اُس کی جانب توجہ مبذول کرنی شروع کر دی ہے۔ صوبہ کی انجمنوں اور اخبارات میں بھی اِس سے حرکت پیدا ہو گئی ہے۔ عام پبلک اور خاص کر مسلمانوں میں یونیورسٹی کے خلاف ایک سخت ایجی ٹیشن ہو رہا ہے اب پنجاب کونسل کے ممبران نے ذرا سی ہمت دکھائی تو حکومت یونیورسٹی کی جانچ پڑتال کے لئے ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کرے گی۔

(۲) ہم جدید امتحانات کے سلسلے میں یونیورسٹی کے اربابِ اقتدار سے حسبِ ذیل سوالات کے جوابات چاہتے ہیں۔

(۱) کیا یہ صحیح ہے کہ حال ہی میں کسی مقدمۂ رشوت دہی کی تحقیقات کے اثنا میں پنجاب پولیس کے ایک خطاب یافتہ گزیٹڈ آفیسر نے یونیورسٹی کے بعض ملازموں کی رشوت ستانی کی تحقیقات کی تھی۔

(۲) کیا اِس ذمہ دار پولیس افسر کو جو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا منصب رکھتا ہے۔ اثنائے تحقیقات میں یونیورسٹی کے بعض ذمہ دار ملازموں کی رشوت ستانی کے کچھ ثبوت ملے ہیں؟

(۳) کیا یہ سچ ہے کہ اِس پولیس افسر نے اپنی تحقیقات کے نتیجے کے طور پر رپورٹ میں یہ لکھا ہے کہ

"پنجاب یونیورسٹی میں ہر شخص روپے کے زور پر امتحانات میں کامیاب ہو سکتا ہے"!

(۴) کیا اس پولیس افسر نے یونیورسٹی کے ملازموں کی رشوت ستانی کے واقعات کی ایک طویل رپورٹ یونیورسٹی کے حکام کے ملاحظہ میں پیش کی تھی؟

(۵) اگر یہ سوالات صحیح ہیں تو بتایا جائے کہ اُس پولیس افسر کی رپورٹ پر یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد نے کیا کارروائی کی؟ اور اگر کوئی کارروائی کی گئی ہے تو پبلک کو اُس سے بے خبر کیوں رکھا گیا؟ اور اگر اُس رپورٹ پہ کوئی کارروائی سر دست ضروری نہیں سمجھی گئی تو کیوں؟ اور کیا یونیورسٹی کے متعلق پبلک کی عام بدگمانی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یونیورسٹی کے عملۂ انتظام کی کارگزاریوں کی چھان بین کے لئے کسی تحقیقاتی کمیٹی کے تقرر کی ضرورت پر غور نہیں کیا جائیگا؟

پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے وہ ممبران جو تعلیم و تعلّم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اِس بارے میں کونسل میں سوالات پیش کرکے اُس رپورٹ کو میز پر طلب کریں۔ اور تھوڑی سی زحمت گوارا کرکے اِس سلسلے میں پولیس کی تحقیقاتی رپورٹ کے متعلق واقفیت بہم پہنچائیں۔

آنریبل وزیرِ تعلیم کی خدمت میں یہ درخواست ہے کہ اس بارے میں وہ اپنے اختیارات سے کام لیکر پولیس کی رپورٹ کو طلب فرمائیں اور حکومت پر زور ڈال کر یونیورسٹی کے تمام حالات کی جانچ پڑتال کے لئے ایک کمیشن مقرر کریں۔

پبلک کا یہ دیرینہ مطالبہ پورا کر دیا گیا تو آنریبل وزیرِ تعلیم کی عہدِ وزارت کا یہ زرّیں کارنامہ کونسل کی تاریخ میں ثبتِ دوام حاصل کر لے گا۔

(۶) پنجاب یونیورسٹی کے بورڈ آف سٹڈیز نے ایم۔ اے (عربی) کے لئے ڈاکٹر نکلسن کی کتاب تاریخ ادب عربی اور بی اے کی اسلامی تاریخ کے سلسلے میں ڈاکٹر وائل کی کتاب "دی اسلامک پیوپلز" کو داخلِ نصاب کر رکھا ہے۔

اِن دونوں کتابوں میں پیغمبرِ اسلام علیہ السلام اور اُن کے صحابۂ کرام پر شرمناک تہمتیں لگائی گئی ہیں اور نہایت خیرہ چشمی سے اُن کی مقدس شان میں مجرمانہ دریدہ دہنی سے کام لیا گیا ہے۔

ایک علمی ادارہ جسے ایسی شرمناک کتابوں سے بے تعلق رہنا چاہیئے کسقدر افسوسناک بات ہے کہ وہ انہیں داخلِ نصاب کرکے ان کے نامعقول مصنفوں کی سرپرستی کرتا ہے۔ مسلمانوں میں ان کتابوں کے خلاف ایک طوفانِ اختلاف برپا ہے اور اُسی کے زیرِ اثر وہ بجا طور پر پنجاب یونیورسٹی سے اظہارِ نفرت و ملامت کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر شجاع الدین کا بیان ہے کہ وائل کی رسوائے عالم کتاب مسٹر محمد شفیع پرنسپل اورینٹل کالج کی تجویز و سفارش پر داخلِ نصاب کی گئی ہے۔ تاریخ ادب عربی بھی مسٹر شفیع کے استاد ڈاکٹر نکلسن کی تصنیف ہے۔

اور ظن غالب ہے کہ عربی زبان کا استاد ہونے کی حیثیت میں یہ کتاب بھی مسٹر شفیع ہی کی تجویز پر ایم اے (عربی) میں داخل کی گئی ہوگی پنجاب یونیورسٹی کے رول کے مطابق مسٹر شفیع نے ان کتابوں کو کورس میں داخل کرنے کی تجویز و شفارش کے ساتھ یونیورسٹی کو یہ تحریر دی ہوگی کہ میں نے اِن کتابوں کو لفظاً لفظاً پڑھا ہے اِن میں کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں۔ تو اِس صورت میں ہم شفیع صاحب سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کو (العیاذ باللہ تعالےٰ) ظالم بدہن، عیار، فریبی، جعلساز اور شیطان کا لقب دینے والی کسی کتاب کو یونیورسٹی کے کسی امتحان میں داخل کرنے کی دلیری کوئی مسلمان کر سکتا ہے؟

کیا آپ یونیورسٹی میں مسلمانوں کی نمایندگی اِس انداز میں کرتے ہیں؟ کیا عامۃ المسلمین کا یہ مطالبہ بے جا ہے کہ آپ چونکہ اُن کے صحیح نمائندہ نہیں ہیں، اِس لئے یونیورسٹی سے باہر نکل آئیں۔

ہم آپ سے دردمندانہ طور پر درخواست کرتے ہیں کہ آپ وقت کی نزاکت کو محسوس کر کے خود بخود یونیورسٹی سے دست بردار ہو جائیں ورنہ اگر آوازِ خلق کی جانب سے کان اسی طرح بند کئے یونیورسٹی کو آپ چمٹے رہے تو وہ وقت دور نہیں ہے کہ مسلمانوں کے لئے آپ ناقابلِ برداشت مصیبت بن جائیں۔

ہز ایکسیلنسی چانسلر پنجاب یونیورسٹی سے مسلمانوں کا یہ متفقہ جائز مطالبہ ہے کہ وہ حکماً اِن کتابوں اور اِن کے تجویز کرنے والوں کو یونیورسٹی سے خارج کر کے مسلمانوں کو اِس یقین کو پائدار بنائیں کہ حکومت کسی جماعت کی مذہبی دل آزاری کو روا نہیں رکھتی۔

---

(۷) پنجاب یونیورسٹی درحقیقت صوبہ پنجاب کا ایک علمی سرچشمہ ہے اِس منبع سے علم کی نہریں نکل کر صوبے کے نونہالوں کے دماغی نشوونما کا ذریعہ بنتی ہیں، پس اگر سرچشمہ ہی مسموم ہو رہا ہو تو ہمارے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کسقدر خطرات سے گھری ہوئی ہوگی؟

ضرورت ہے کہ اِس سرچشمۂ علوم کو وبائی جراثیم سے پاک کیا جائے، اہلِ پنجاب جن کے گاڑھے پسینے کی کمائی پنجاب یونیورسٹی کو چلا رہی ہے یہ جاننے کا حق رکھتے ہیں اور اِس حق کو استعمال کرنے پر وہ آمادہ ہیں کہ علوم مشرقیہ کی خدمت کے جن رنگین و خوش آیند

... وعدوں کی چٹان پر پنجاب یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی اُس چٹان کی کیا حفاظت اب تک کی گئی؟ عربی، فارسی، سنسکرت اور علوم مشرقیہ کی حفاظت حمایت اور اشاعت کے سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی نے کیا خدمات انجام دیں؟

بظاہر تو آج تک بھی جب کہ یونیورسٹی اپنی پنجاہ سالہ جوبلی پر ایک لاکھ روپے کی رقم خطیر صرف کرنے کا پروگرام سوچ رہی ہے، علوم مشرقیہ اور السنۂ شرقیہ کس مپرسی کی حالت میں نظر آتی ہیں۔ اور ہمارے نام نہاد پروفیسروں کو عربی ادب کی تاریخ اور اسلامی تاریخ کیلئے نکلسن اور روائل کی دل آزار، بیہودہ، اور سوختنی کتابوں کے سوا کوئی کتاب اس قابل نظر نہیں آتی جسے وہ کورس بنا سکیں۔

یونیورسٹی کی عمر کے پچاس سال گزرنے پر بھی آج واقفانِ حال اس کے متعلق یہی رائے رکھتے ہیں کہ

"پنجاب یونیورسٹی کوئی یونیورسٹی نہیں۔ یہ ایک دھوکا ہے۔ ایسا دھوکا جو اُن لوگوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے جن کو اِس میں کبھی کوئی شک نہیں ہوا۔"

پروفیسر برج نرائن ایم اے

تاجور

سالنامے کے متعلق

(۱) اہلِ قلم حضرات کے انعامی مضامین موصول ہو رہے ہیں آپ بھی اپنے شاہکار ارسال فرمائیں

(۲) وہ حضرات جو محض سالنامہ خریدنے کے لئے درخواستیں بھیج رہے ہیں ان کی خدمت میں پہلے بھی عرض کیا گیا تھا۔ اور اب بھی عرض کیا جاتا ہے کہ سالنامہ محض خریداروں کو ملیگا۔ وہ اتنی ہی تعداد میں چھپوایا جائیگا، جتنے کہ ادبی دنیا کے مستقل خریدار ہیں۔

بعض حضرات کے مضامین پر ان کی بدخطی کا ماتم ادبی دنیا کے عملہ ادارت و کتابت کو بھی رلاتا ہے۔ اگر سالنامے کے لئے وہ حضرات ہمیں اس نظر سوزی اور اشکباری سے بچالیں تو ہمارے حال پر ان کا یہ بڑا کرم ہوگا۔

مینجر ادبی دنیا

جدید الفاظ

مارکہ (تجارتی نشان)	Trade Mark
مُسَقّفہ (عمارت کا) خاکہ	Draught
خطاب ، سرورق	Title
مزدوری، قیمت ، نرخ	Charges
لیٹ فیس، تاوانِ تاخیر	Late-fee
دخل درمعقولات	Interfere
اُخوت ، بھائی چارہ ، مساوات	Brotherhood
تربیت ، قواعد	Training
تربیت یافتہ ، باقاعدہ	Trained
محرومِ ترقی، پابند، مسدود	Detained
محصول آمدنی، ٹیکس	Income-tax
خودساز	Self-made
انتہاپسند	Extremist
بین الاقوامی	International
صحت گاہ، گرمائی قیام گاہ	Sanitarium
مُترجم	Translator
ترجمان	Interpreter
عدالت خاص	Tribunal
نفسیات	Psychology
مخصوص، نام زد ، ریزرو	Reserved
داروغۂ آبکاری	Excise Inspector
امتحانی پروگرام ۔ فہرست اوقاتِ امتحان ، ڈیٹ شیٹ	Date-sheet
حوصلہ افزائی	Encouragement
رکاوٹ ۔ پابندی	Detention
وقتِ شمولیت	Joining time

تمکین رامپوری

تنقیدِ شعری

آنسو سے خطاب

قاصر زباں ہوتی ہے جب عرضِ حال سے
بنتا ہے ترجمانِ دلِ بیقرار تو!
اگلی مصیبتوں کا تو ایک پیش خیمہ ہے
پچھلی مسرتوں کی ہے اِک یادگار تو!

مذکورہ بالا اشعار ملک کے سحر طراز ادیب پنڈت میلا رام وفا ایڈیٹر روزنامہ ویر بھارت لاہور کی طراوشِ فکر سے ہیں۔

وفا صاحب نے اپنی مشہور نظم "آنسو سے خطاب" میں آنسو کو مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر کہے ہیں۔ کسی اچھے کلام کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اُس کے الفاظ کم ہوں اور معانی زیادہ۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اچھا کلام درحقیقت ایک اجمال ہے کہ اُس میں معانی کی سلسلہ در سلسلہ تفاصیل نہاں ہیں۔ اب اگر اُس اجمال پر نظر پڑنے کے ساتھ ہی اُس کی تمام تفاصیل تک ذہن کی رسائی ہو گئی تو یہ کلام گراں وزن اور بلند پایہ ہے اور جو اجمال اور تفصیل کے درمیان بہت سے مقدمات نکالنے پڑے تب اُس اجمال سے وہ تفصیل ذہن میں آئی تو یہ کلام مغلق کہلائے گا۔ اور اکثر اوقات ایسے کلام کا اغلاق اہمال تک پہنچ جاتا ہے۔

وفا کے مذکورہ بالا دونوں شعروں میں ہر شعر ایک تفصیلِ طویل کا ایسا اجمال ہے کہ شعر پڑھنے کے ساتھ ہی شعر کے تمام معانی پرا باندھ کر نظر کے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔

پہلے شعر کا تجزیہ کیجئے۔

(۱) محبوب جو دلِ دردمند کے لئے باعثِ شکیب و قرار ہے۔ رخصت ہونے کو ہے دل اُس کی جدائی کے صدمے سے پاش پاش ہوا جاتا ہے۔ عاشق کو اتنی جرأت نہیں کہ اس کا دامن پکڑ کے اُسے روک لے لیکن اُس کی جدائی کا قلق بھی حدِ ضبط سے باہر ہوا جاتا ہے۔ زبان دل کی شریکِ حال ہے، دل بے قابو ہے تو زبان بھی بے اختیار ہے۔ دل میں جو جذباتِ حزن و ملال موج زن ہیں زبان اُن کی تصویر کشی سے عاجز ہو چکی ہے۔ عاشق کچھ کہنا چاہتا ہے مگر زبان کو یارائے گفتگو کہاں؟

دل و زبان کی اِس کشمکش بے ہنگام میں آنکھ زبان بن کر دل کی ترجمان بن جاتی ہے اور ایک اشکِ گرم پلکوں پر آکر دل کے درد و کرب کی داستاں بیان کر دیتا ہے۔ شعر پڑھنے کے ساتھ ہی معاً یہ تمام تصورات واقعات بن کر چشمِ تخیل کے سامنے بے نقاب ہو جاتے ہیں اور سننے والے .... پر ایسی حالت طاری ہونے لگتی ہے گویا یہ داستانِ درد اُسی پر گذر رہی ہے۔

(۲) اگلی مصیبتوں کا تو ایک پیش خیمہ ہے
پچھلی مسرتوں کی ہے اک یادگار تو!

یہ شعر پہلے شعر سے بھی زیادہ دل گداز ہے۔

ایک فلاکت زدہ انسان جس کے مستقبل کی فضا میں مصیبتیں بپا ہی ہوں، جس کا زرّیں ماضی راحت و عیش کی رنگینیوں سے بیرنگِ نگاہ بن رہا ہو اور جو ستم رسیدہ حال کی بے کسی و پامالی سے نڈھال ہو چکا ہو۔ ایسی اندوہناک حالت میں ماضی کی یاد اور مستقبل کے خطراتِ بیکراں کا خیال ایک آنسو کی شکل میں اُسکی پلکوں پر نمودار ہو کر اُسکی زندگی کے مصائب کو نظر کے سامنے مجسّم بنا دیتا ہے۔ اِن افسانہائے رنج و حزن کو شاعر نے دو مصرعوں میں ادا کر کے اپنے کمالِ فن کو حدِ اعجاز تک ظاہر کر دیا ہے۔ شعر کو پڑھتے ہی ایک دردناک نظارہ ایک مکمل ٹریجڈی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہ تین منظر بہ یک وقت نگاہوں میں پھر جاتے ہیں۔

(۱) ماضی کی مسرتوں نے ایک شخص کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر رکھا ہے
(۲) حال کی بدحالیوں سے اُس پر حیرت طاری ہے
(۳) اُس کا مستقبل حدِ خیال تک خطرات و مصائب سے لبریز نظر آرہا ہے

الحق کہ شاعر کی قادر البیانی نادر البیانی اور نقاشی قابلِ ہزار تحسین و آفرین ہے

عشق بے رحم

محبت عشق کی صورت میں جب تبدیل ہوتی ہے
گدازِ عشق سے عقلِ بشر تحلیل ہوتی ہے

سراسر آتشیں ہے عشق کے جذبات کی دنیا
انہی شعلوں سے جل اٹھتی ہے احساسات کی دنیا

تمیزِ نیک و بد اٹھتی ہے انسانی نگاہوں سے
گذرتا ہے بشر جذبات کی پُرہول راہوں سے

یہاں دنیا کا ہر اعزاز جل کر خاک ہوتا ہے
یہاں شخصیت و سطوت کا قصہ پاک ہوتا ہے

شہامت کانپتی ہے عشق کے اخلاص کیشوں سے
یہاں سر پھوڑ لیتی ہے شجاعت اپنا تیشوں سے

یہاں کیا ذکر ہے رسمی تکلف اور بناؤ کا
یہاں کیا کام ہے جھوٹی لگاوٹ اور لگاؤ کا

یہاں اغراضِ نفسانی کا قتلِ عام رہتا ہے
یہاں وردِ زباں محبوب ہی کا نام رہتا ہے

یہاں رسم و رواجِ عام کی پروا نہیں ہوتی
کسی کو اپنے ننگ و نام کی پروا نہیں ہوتی

یہاں عشاق کے در پر جھکاتے ہیں حسینوں کو
یہاں دیتے ہیں جلادوں کا منصب نازنینوں کو

یہاں انسان کا اپنا پرایا چھوٹ جاتا ہے
یہاں مضبوط سے مضبوط رشتہ ٹوٹ جاتا ہے

یہاں آکر جدا ہوتے ہیں بیٹے اپنی ماؤں سے
لڑائی ٹھان لیتے ہیں پجاری دیوتاؤں سے

یہاں اولاد سی دولت کو بھی انسان کھوتا ہے
یہاں بہنوں کے ہاتھوں بھائیوں کا خون ہوتا ہے

جمالی پیکروں سے بھی عیاں شانِ جلالی ہے
یہ بے رحم عشق کی دنیا زمانے سے نرالی ہے

وقار (انبالوی)

تصحیح

نقطۂ نظر

اکثر تعلیم یافتہ اصحاب اور پنجاب کے بعض اخبار نویس بھی پوائنٹ آف ویو (Point of view) کے معنی میں "نکتۂ نظر" استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ

صحیح تلفّظ "نقطۂ نظر" ہے

نُقطہ خط کی اِنتہا کو کہتے ہیں اور نظر نگاہ کو۔ شعاعِ نظر کو ایک خط فرض کر کے جہاں اس کی انتہا ہو اُسے نقطۂ نظر کہتے ہیں۔ نکتہ امرِ لطیف کو کہتے ہیں جو یہاں بے معنی ہے۔

پوائنٹ کا صحیح ترجمہ نقطہ ہے نکتہ نہیں

مرکزِ نگاہ، منتہائے توجہ۔ پوائنٹ آف ویو کے معنی ادا

کرنے کے لئے آپ

ہمیشہ "نقطۂ نظر" لکھیئے

سجّاد میرٹھی رکن ادارہ

سوال و جواب

سوالات

۱۔ تہیدستی ہو قسمت میں تو کب وہ جانیوالی ہے
حنا سے دیکھ لو دُزدِ حنا کا ہاتھ خالی ہے

مفہوم سمجھ میں نہیں آتا ذرا وضاحت سے بیان فرماویں۔
(شریف عالم، برہ پور۔ بھاگلپور)

۲۔ کہاں گردشِ فلک چین دیتی ہے بھلا انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

انشاؔ کے اس شعر کا مطلب اور 'ہم صورت' اور 'ہم صورت دو چار' کی تشریح فرما دیجئے۔ کیا مصرعہ دوم یوں بھی ہے۔ ع غنیمت ہے کہ ہم یاں صورت دو چار بیٹھے ہیں۔ (قاضی علی اکبر، مدرس مڈل سکول سید پور راولپنڈی)

۳۔(ا) تیری بیداد کا انداز تغافل تو نہ تھا
تیری بیداد نہیں، یہ تری بیداد نہیں

(ب) کھول کر بال جو سوتے ہیں وہ شب کو حسرتؔ
گھیر لیتی ہے اُنہیں زلفِ معنبر کیا خوب (حسرت موہانی)

(ج) ہر عشق تیری الفت کے سوا آئینہ ہے خود غرضی کا
جو تجھ سے محبت کرتے ہیں وہ تجھ سے محبت کرتے ہیں (علامہ تاجور)

(د) تخیل، طلسم۔ لغزش، تلون،

براہِ کرم مندرجہ بالا اشعار کی تشریح اور الفاظ کا تلفظ اور معنی تحریر فرمائیں۔ (محمد شفیع، کوچۂ باغبانان)

(۴) پرانی کتابوں اور قصے کہانیوں میں پرستان اور دیو، جن کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ اس کی حقیقت سے آگاہ فرمائیے۔
(محمد حسین، ایڈیٹر رسالہ کاکائی معل (زبان منی پوری) امپھال منی پور اسٹیٹ آسام)

۵۔(ا) مشکور ہونگا اگر مندرجہ ذیل شعر کا مطلب آئندہ اشاعت میں درج فرماویں۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

(ب) محاورہ "بلائیں لینا" اس کی بھی تشریح فرما کر ممنون فرمائیے۔ (محمد صادق، ڈی۔ اے۔ وی کالج جالندھر)

جوابات

(۱) دزدِ حنا۔ ہاتھ کی وہ لکیریں جو مہندی کے رنگ سے چھوٹ جائیں۔ بعض لوگ ان سفید لکیروں کو مہندی چور بھی کہتے ہیں۔ شعر کا مطلب صاف ہے۔ صرف حُسنِ تعلیل ہے اور کچھ نہیں۔ یعنی جس چیز کی قسمت میں محرومی ہو وہ کب جا سکتی ہے۔ دُزدِ حنا (باوجود مہندی چور ہونے کے) مہندی سے محروم ہے!

(۲) 'صورتِ دو چار' کا نسخہ مُہمل ہے۔ پہلا مصرعہ بھی آپ نے صحیح نہیں لکھا۔ اصل میں شعر اس طرح ہے ؎

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ہم صورت = ایک جیسے مراد ہم مشرب۔ دو چار۔ چند (محاورہ ہے) مطلب ہے کہ اے انشاؔ! گردشِ فلک کس کو چین لینے دیتی ہے۔ غنیمت ہی ہے کہ چند ہم مشرب اس وقت ایک جگہ جمع ہیں۔

(۳) (الف) محبوب! تیری جفا کے سارے انداز میں جانتا ہوں تُو نے بیداد ضرور کی لیکن تغافل کے انداز میں کبھی نہیں۔ آج یہ نئی طرزِ جفا (جس میں تغافل بھی شامل ہے) پتہ دیتی ہے کہ اس پردے میں کوئی دوسرا (یعنی رقیب) کام کر رہا ہے!

یا مطلب یہ ہے کہ تو مرے حال سے غافل نہیں تھا۔ اگرچہ میرے حق میں بیداد کرتا تھا لیکن اب تیری غفلت نے تیری بیداد سے محروم کر دیا۔ اور یہ غفلت یہ کسی اور نے تجھے سکھائی ہے۔

(ب) رات کو جب وہ بال کھول کر سوتے ہیں تو اُن کی خوشبودار زُلفوں کا اُن کے چہرے کی نقاب بن جانا، حُسن کی زیادتی اور حفاظت دونوں رعائتوں کا حامل ہے۔

(ج) اس شعر کی تشریح کے لئے ادبی دُنیا کی گذشتہ اشاعت کا "تنقیدِ شعری" والا حصہ ملاحظہ ہو۔

(د) تخیل۔ کسی چیز کو خیال میں لانا، پروازِ خیال

طِلسم - شعبدہ۔ فسوں کاری - جادو

لغزش - اپنی جگہ سے ہٹ جانا، پھسلنا - غلطی کرنا -

تلوّن - غیر مستقل مزاجی، چھچھوراپن -

(۴) قدیم افسانوں میں کوہِ قاف کے علاقے کو پرستان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے - خوبصورت عورت کو لوگ آج بھی پری کہہ دیتے ہیں - قفقازی پہاڑوں اور اُن کے دامنوں میں جو انسان آباد ہیں وہ اپنی خوبصورتی میں لاثانی ہیں - اگر لوگوں نے اِس غیر معمولی خوبصورتی کی بنا پر اِس علاقے کا نام پرستان رکھ دیا ہو تو قرینِ قیاس ہے -

دیو - فرضی نام ہے - جس طرح عنقا کا فرضی نام کسی نایاب چیز کے لئے استعارہ کر لیتے ہیں اسی طرح دیو کا استعارہ بھی غیر معمولی قوت اور جُثّے والے حیوان سے ہوتا ہے -

جن - اِس لفظ کے لغوی معنی ہیں چھپا ہوا - اس کے تمام مشتقات میں یہی معنی مشترک پائے جاتے ہیں - مثلاً جنین (بچہ جو ابھی شکم مادر میں ہو) جنون (ایک دماغی بیماری جس کا احساس محض بیماری کی علامات سے ہوتا ہے -) جنّت (ایک دلکش اور پُر فضا مقام جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے) وغیرہ چونکہ لفظ جن قرآن شریف میں بھی آیا ہے - اِس لئے علمائے مفسرین نے اِس کے کئی معنی لکھے ہیں - اِس کے معنی عقلی طور پر صرف یہی لینے چاہئیں، کہ جن ایک چھپی ہوئی مخلوق کا نام ہے اور بس - نوعیت مخلوق کی نسبت جو کچھ کہا جاتا ہے وہ خیالی اور فرضی ہے اسی وجہ سے جن آج تک پری اور دیو کے مترادف معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے -

(۵) قیس - لیلیٰ کا عاشق - مجنوں -

بروئے کار آنا - مقابلے میں آنا - سامنے آنا - کام آنا -

صحرا - مراد ہے میدانِ محبت و عشق

مطلب یہ ہے، کہ میدانِ عشق میں آج تک قیس کے سوا کوئی مرد میدان مقابلے میں نہیں آیا - شاید صحرا (میدانِ محبت) حاسد کی آنکھ کی طرح تنگ ہے - ورنہ دنیا میں لاکھوں انسان ہیں - کوئی تو اُس طرف بڑھتا -

(ب) بلائیں لینا محاورہ ہے - ہندوستانی شرفا میں قاعدہ ہے کہ جب کوئی آدمی سفر سے واپس آتا ہے - یا سفر کو جاتا ہے - تو بڑی بوڑھیاں اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر انگلیوں کو اپنی کنپٹیوں کے ساتھ الٹی رکھ کر چٹخاتی ہیں - مطلب یہ ہوتا ہے کہ سفر جانے والے کی یا سفر سے آنے والے کی تمام صعوبتیں اُس نے اپنے سر لے لی ہیں - بلائیں لینا اب قربان ہونے اور پیار کرنے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے -

دو مزید سوالات

سوال (۱) براہ کرم اس شعر کا مطلب واضح طور پر بیان کیجئے -

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھا
مُدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تحریر کا (غالب)

(۲) وحدت الوجود سے کیا مراد ہے؟ یوسف علی نائر (حویلی)

جواب (۱) آگہی - سمجھ -

دامِ شنیدن - سننے کا جال -

عنقا - ایک فرضی جانور جس کی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ جس کے سر پر سے گزر جائے وہ شخص بڑا نصیبہ ور ہوتا ہے - عام طور پر اب عنقا ایسی چیز کو کہتے ہیں جو نایاب ہو،

اِس شعر میں مرزا غالب نے سمجھ کو شکاری اور قوتِ سماعت کو جال اور اپنے اشعار کے معنوں کو عنقا بیان کیا ہے - مطلب یہ ہے کہ اے سمجھ کے شکاری تو خواہ کہیں تک سُننے کا جال بچھائے میرے اشعار کا مطلب عنقا کی طرح تیرے جال میں نہیں آسکتا - یعنی میرے اشعار کو کوئی شخص چاہے کتنی بار سُنے سمجھ نہیں سکتا - چونکہ مرزا مشکل پسند شاعر تھے اور ان کا کلام مشکل ہے اِس لئے وہ ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آتا - اُنہوں نے ایک جگہ اور بھی اس مشکل کا ذکر یوں کیا ہے -

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

(۲) وحدت الوجود ایک مذہبی اصطلاح ہے - مراد اس سے یہ ہے کہ کائنات مع تمام مختلف مظاہر کے ایک ذات واجب کی مختلف تجلیات کا ظہور ہے - کوئی شے بذاتِ خود کچھ نہیں - اُسی ایک ذات کا پرتو یا سایہ ہے - حقیقی وجود صرف ایک ہے - باقی تمام موجودات اعتباری وجود رکھتے ہیں - صوفیائے کرام کا مسلک عموماً یہی رہا ہے -

جب سوا تیرے کچھ نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ادارہ

اخبار علمیہ

سائنس کا کرشمہ

ایک مدت سے بہت سے علماء اور اطباء اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح اس نابینا کو جو پیدا ہونے کے بعد اپنی نظر کھو چکا ہے یا ماں کے پیٹ ہی سے نابینا پیدا ہوا ہے ۔ بینا بنا سکیں، اس غرض سے وہ تجربے کر رہے ہیں۔

کوئی دو ماہ کا عرصہ گزرا ہے کہ ڈاکٹر ایچ ۔ جے مور نے جو امریکہ کے ممتاز ڈاکٹروں میں سے ہیں فلاڈلفیا کے رہنے والے ایک ایسے نوجوان کا اپریشن کیا جو ماں کے بطن سے اندھا پیدا ہوا تھا اور جس کی دونوں آنکھوں کی پتلیاں معدوم تھیں، اس نوجوان کا نام ارل ہو سلمان ہے، یہ شخص ایک ایسے اسکول میں جہاں اندھوں کو تعلیم دیجاتی ہے، پڑھ چکا ہے، کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کو اس اپریشن میں قدرے کامیابی ہوئی ہے ۔

جس وقت اُس نوجوان کی آنکھوں سے پٹیاں اتاری گئیں تو وہ ٹھوس اجسام بخوبی دیکھنے لگا، اور گہرے چمکدار رنگوں میں تمیز کرنے لگا۔ یہ شخص چونکہ ابھی تاریک دنیا سے ایک روشن عالم میں آیا ہے ۔ اس لئے سخت متحیر ہے، اور جو چیز اُس کی آنکھوں کے سامنے آتی ہے اُسے بغور دیکھتا ہے اور اُس کا نام دریافت کرتا ہے، وہ دیکھ کر مرد اور عورت میں تمیز نہیں کر سکتا۔ حالانکہ اس سے پہلے صرف آواز سنکر تمیز کر لیا کرتا تھا۔ آجکل وہ اپنے مشاہدات کے دائرہ کو وسیع بنانے میں مصروف ہے ۔ اور اُن تمام چیزوں کے نام جو اُس کی آنکھوں کے سامنے آتی ہیں، حفظ یاد کر رہا ہے۔

ایک اخبار نویس بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ ارل کے سامنے ایک مرد کی تصویر لائی گئی اور اُس سے دریافت کیا گیا کہ وہ عورت کی تصویر ہے یا مرد کی؟ اُس نے تھوڑی دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا اور پھر جواب دیا:-

"یہ عورت کی تصویر ہے" غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ اُس نے صاحبِ تصویر کی گردن نکٹائی سے خالی پائی اور صرف یہی ایک امتیازی چیز تھی۔ جس سے وہ مرد اور عورت میں تمیز کیا کرتا تھا ۔

ایک روز اُس کے سامنے ایک شخص کے چہرہ کی جانبی تصویر پیش کی گئی، وہ شناخت نہ کر سکا، اور جب اُسے بتایا گیا کہ وہ ایک انسان کا چہرہ ہے تو وہ بہت متحیر ہوا اور تعجب کرنے لگا کہ محض وضع بدل دینے سے انسان کے چہرہ میں اتنا بڑا تغیر کیسے پیدا ہو گیا ۔

یہ نوجوان اس وقت تک اجسام کی موٹائی، اُن کو ہاتھ سے چھوئے بغیر معلوم نہیں کر سکتا اور نہ وہ مختلف حجم رکھنے والے جسموں میں حجم کے اعتبار سے فرق کر سکتا ہے ۔ وہ اجسام کو صاف طور پر دیکھتا ہے۔ لیکن اُن کا صحیح نام بتانے سے قاصر ہے ۔

آجکل اسے لکھنا پڑھنا اور حروف و کلمات کا تلفظ از سرِ نو سکھایا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے وہ جو کچھ اندھوں کے اسکول میں پڑھ چکا ہے. آج اُس کے بینا ہو جانے کے بعد وہ یکسر غیر مفید ثابت ہو رہا ہے ۔

ارل نے ایک اخبار کے نمائندہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:-

"میں پھولوں کی تازگی، اور اُن کے خوشنما رنگ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ اس سے پہلے میں اِن کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا تھا، کہ وہ نرم ہیں، آج اُن کی سحر کاری اور جمال میری آنکھوں میں ہے"۔

"میری زندگی میں غالباً سب سے زیادہ سعید و ساعت ہوگی جب میں اپنے اعزہ اور رفقاء کے چہرے دیکھ کر محظوظ ہونگا، یہ وہ چہرے ہیں جنہیں میں نے آجتک نہیں دیکھا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ وہ اُس سے کہیں زائد حسین و جمیل ہونگے جتنا میں انہیں اپنے خیالی دنیا میں دیکھتا رہا ہوں"

"میں اپنی تعلیم کے زمانے میں یہ امید رکھا کرتا تھا کہ یقیناً ایک دن ایسا آئیگا جبکہ میں خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے حسن و جمال سے اپنی آنکھوں کو فروغ دونگا۔ یہ مسکرانے والی اور پُر سعادت آرزو کبھی میرے دل کے گوشہ سے جدا نہیں ہوئی - اور آج میں، خدا کا شکر ہے، دو دیکھنے والی آنکھیں رکھتا ہوں۔

شوکت میرٹھی

پنجاب یونیورسٹی کے فارسی کورس

(۲)

"اور اگفتند از ناشائستگاں کدام زیاں کارتر است، گفت آنانکہ برسولی روند و از بہر مقصودِ خویش خیانت کنند و ہمہ ویرانی مملکت از ایشاں خیزد۔"

اِس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ بادشاہ سے لوگوں نے پوچھا کہ بُرے لوگوں میں سب سے زیادہ تباہ کار لوگ کون ہوتے ہیں، اُس نے جواب دیا کہ جو لوگ قاصد بن کر جاتے ہیں اور اپنی کسی غرض کے لئے پیام رسانی میں خیانت کرتے ہیں۔ سلطنت کی تمام تباہیاں انہیں خیانتی قاصدوں کے سبب سے ظہور پذیر ہوا کرتی ہیں۔ آگے کہتا ہے۔

چنانکہ اردشیر گفتے۔

"چند خونہا ست کہ ریختہ اند و چند لشکر ہا ہزیمت نمودہ اند - چند اہلِ حرمت و عصمت را پردہ دریدہ اند و چند خواستہا ست کہ غارت کردہ اند بخیانت ہائے رسولاں و ناشائستگیٔ ایشاں"

(سید گل اقتباس از کتاب نصیحۃ الملوک صفحہ ۱۶)

اِس عبارت میں اختلال ہے، مفہوم اور واقعہ کے اعتبار سے اِن افعال کا فاعل "رسولاں" ہے اور عبارت کے سیاق و سباق سے "رسولاں" فاعل نہیں بن سکتا۔ موجودہ صورت میں اِن متعدی افعال کا فاعل کہیں سے پیدا کیجے کیونکہ رسولاں کو فاعل بنانے سے ترکیب نحوی غلط ہو جاتی ہے۔ یہ اختلال اس طرح دور ہو سکتا ہے کہ عبارت میں ترتیب الفاظ بصورت ذیل بدل دیجائے۔

چند اہلِ حرمت و عصمت را پردہ دریدہ اند و چند خواستہ است کہ غارت کردہ اند رسولاں بخیانت ہائے خویش و ناشائستگی خود شاں

"ایشاں قاضی القضاۃ را موبدان گفتندے" (صفحہ ۱۸)

قاضی القضاۃ واحد ہے اور موبدان جمع لہذا عبارت غلط ہو گئی۔ اسے یُوں درست کیجئے۔ "ایشاں قاضی القضاۃ را موبد موبداں گفتندے"

"و ہر دم منادی پادشاہ ندا رو دادے کہ ہر کرا پادشاہ خصومت نیک بنشیند کہ نخست کارگذاری شما کند" (صفحہ ۱۸)

عبارت میں اختلال ہے۔

ہر کرا واحد غائب نیک بنشیند واحد غائب، اِس واحد غائب کے لئے "شما" جمع حاضر کا استعمال درست نہیں۔

یہ اختلال شما کو او کے ساتھ تبدیل کرنے سے رفع ہو سکیگا۔

"و باہمہ بزرگی و حکمت بزرجمہر کی وزیر او بود انوشروان ترتیب وزارت او چناں کرد کہ دبیر بزرجمہر و نائب نزدیک کسریٰ آمد و شد توانستی کرد و ما این نائب را وکیل در خوانیم و پہلوی ایران ما زغر گفتندے بنیابت وزیر دارد و ہر سہ گماشتہ کسریٰ انوشرواں بودندے در خدمت وزیر او بزرجمہر و وزیر بذات خود ازیں سہ کس ہیچ را نتوانستی گماشت" (صفحہ ۳۶)

ایڈیٹر صاحب مذکورہ بالا عبارت کو ناقص بتلاتے ہیں مگر اس نقص کو دور کرنے کی زحمت نہیں فرماتے۔ آخر طلبہ ناقص عبارت سے کیونکر مستفید ہو سکتے ہیں؟ اِس کے علاوہ ایڈیٹر کا فرض غلط سلط یا ناقص عبارت کو صرف نقل کر دینا تو نہیں ہے۔ تصحیح عبارت تو اس کا پہلا کام ہے۔ لیجئے یہ فرض ہم ادا کئے دیتے ہیں۔ عبارت کی گنجلک اِس طرح دور ہو جائیگی۔

انوشروان ترتیبِ وزارت او چناں کرد کہ دبیر بزرجمہر و ہر دو نائب نزدیک کسریٰ آمد و شد توانستندے کرد و ما ازیں دو نائب یکے را وکیل در خوانیم و پہلوی ایران ما زغر گفتندے و نیابت وزیر دارد۔ و دیگرے را نائب مال، و ایں ہم نیابت وزیر دارد الخ

اور فٹ نوٹ میں جو آپ نے وکیل در کے متعلق فرمایا ہے

"احتمال دارد کہ کلید دار باید خواند بجائے وکیل در"

ایں احتمال خالی از اختلال نیست زیرا کہ "وکیلِ در" منصبے بود در عہدِ انوشروان۔

تاجور

اعلیٰحضرت احمق شاہ

ملکہ میریا نے نرگسیں آنکھیں جھکالیں، اپنے جواہر نگار جوڑے کو دیکھا اور چیں بہ جبیں ہوکر کہا۔ "اماں جان! پھر بھی گریمالٹ بادشاہ ہے"۔

"ہاں" اس کی ماں ڈچز آرلینا نے تیزی سے جواب دیا۔ "آج بادشاہ اور کل ایک بوسیدہ لاش! اس سے زیادہ کچھ نہیں، اگر گریمالٹ کی یہی حماقت رہی"

"آپ کا یہ کہنا تو صریح مبالغہ ہے"۔ میریا نے سرد لہجہ میں کہا۔

"بالکل نہیں" ڈچز آرلینا نے زور دیکر کہا۔ "فرانس میں ایسے بادشاہ کی گنجائش نہیں جو ملک نہ رکھتا ہو، زنجیر یا خنجر! ایسے حالات کا نتیجہ بس یہی ہے"

"لیکن اماں جان" میریا نے فلسفیانہ انداز سے جواب دیا۔ "زنجیر یا خنجر تو ظالم بادشاہوں کا حصہ ہوتا ہے اور گریمالٹ کو آپ ظالم نہیں کہہ سکتیں۔"

"ظالم نہیں مگر ظالم سے بدتر، یعنی احمق" ڈچز نے گرم ہوکر کہا۔ "ایسے گمراہ بادشاہ کے لئے اور کوئی لفظ نہیں، جو باغیوں کو معاف کر دیتا ہے۔ رعایا کے بلند آہنگ اور شورش آمیز مطالبات پر انہیں زمینیں اور حقوق بخشدیتا ہے۔ رحم کے نام سے واجب الادا لگان اور ٹیکس معاف کر دیتا ہے اور اپنی مملکت میں ناداروں اور بھکاریوں کی تلاش کرتا پھرتا ہے۔ تاکہ انہیں مدد پہنچائے اور ان کے پیٹ بھرے۔ تمہی کہو ایسا شخص احمق نہیں تو اور کیا ہے؟ بادشاہ کو بادشاہ ہونا چاہیئے۔ کیا فرمانروائی اسی احمقانہ طرز عمل کو کہتے ہیں؟"

"لیکن گریمالٹ یہ کام اس لئے کرتا ہے کہ رعایا خوش رہے۔ ویرانے آباد ہوں اور زمین کی پیداوار زیادہ ہو"۔ میریا نے جواب دیا۔ "اماں جان۔ کیا آپ کے خیال میں یہ حماقت ہے؟"

یہ سنتے ہی ڈچز آرلینا کے ابروؤں پر بل آئے۔ اس نے دانت پیسکر کہا۔ "ایسے بادشاہ کا جس نے حال ہی میں شادی کی ہے، اولین فرض یہ ہے کہ وہ محل میں رہے، اپنی ملکہ سے ہنسے بولے، اس کی مسرتوں کا خیال کرے۔ لیکن وہ تو تمہارے پاس ٹھہرتا ہی نہیں۔ جب دیکھو باہر کی سیر ہے۔ محل سے ہفتوں غایب۔ فرض کرو ملک کی زمین بہت زرخیز ہوجائیگی۔ لیکن اُس زمین کی زرخیزی ہی کیا جو اپنی ملکیت نہ ہو۔ میں سچ کہتی ہوں تمہارے شوہر نے وہ طریقہ اختیار کیا ہے جس سے وہ ملک، تاج اور اپنا سر سب کچھ کھو بیٹھے گا۔ اور اس بدحالی کو بدتر بنانے کے لئے اس بیوقوف نے ملک کے بد دماغ اور سرکش اُمرا کی ایک کونسل طلب کی ہے تاکہ اس شاہانہ قصر و ایوان میں جمع ہوں اور مملکت کے نظام پر بحث و تمحیص کریں۔ کیا گریمالٹ خود اپنی قوتِ بازو سے فرانس پر حکمرانی نہیں کر سکتا؟ بادشاہ! صرف نام کا بادشاہ! کام کا نہیں! یہ بادشاہ ہے یا مٹی کا کھلونا؟"

خوبصورت اور کمسن میریا اپنے زرتار ملبوس کا دامن ہاتھ میں لیکر اور گردن کو ایک ہلکی سی جنبش دیکر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں ایسی باتیں سنتے سنتے تھک گئی" اس نے کہا۔ آج یہ شکایت سُنی۔ کل وہ شکایت سُنی۔ اماں جان۔ اگر آپ کو کچھ کہنا ہے تو بادشاہ کے منہ پر کہئے۔ آپ کو تو جھوٹا جواب نہیں ملیگا:

"لیکن بیہودہ جواب ملیگا" ڈچز آرلینا نے تیزی سے کہا۔ "نہیں نہیں میں اپنے منہ سے کچھ کہنا نہیں چاہتی وہ تمہارا شوہر ہے۔ تم اس کی ملکہ ہو۔ یہ فرض تم پر عائد ہوتا ہے کہ اسے ان حماقتوں سے باز رکھو، قبل اس سے کہ تباہی اور بربادی کا اژدھا اسے نگل جائے۔ تم جانتی ہو کہ میں جو کچھ کہتی ہوں تمہاری اور تمہارے شوہر کی بھلائی کے لئے کہتی ہوں مجھ سے لوگوں کے طعنے نہیں سنے جاتے، لوگوں کی سرگوشیاں نہیں دیکھی جاتیں۔ تمہاری پیٹھ پیچھے سب ہنستے ہیں اور مضحکہ اڑاتے ہیں کہ گریمالٹ آئے دن اس طرح سفر میں رہتا ہے جیسے محل اور ملکہ سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ جب دیکھو گھوڑے کی سواری ہے، سیر و تفریح ہے، اس کے آوارہ منش ساتھی ہیں اور سنا جاتا ہے کہ بعض بدچلن عورتیں بھی ہیں۔ تمہاری تو نائس کٹ گئی۔ ہر طرف تھڑی تھڑی ہو رہی ہے"

ملکہ میریا کا حسین گلابی چہرہ تمتما اُٹھا۔ "یہ سراسر جھوٹ ہے، کذب ہے، افترا ہے" اس نے تھرتھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "ایک بادشاہ کے چال چلن پر جھوٹا اور بیرحمانہ الزام ہے!"

تو بیٹی تم دنیا کو دکھلا دو کہ یہ جھوٹ ہے" ڈچز نے سمجھا کر کہا "یہ کام جیاتنک جلد ہو بہتر ہے ورنہ گریمالٹ سارے فرانس میں تمہیں قہقہہ کا نشانہ بنا دیگا۔" یہ کہکر ڈچز آرلینا اپنی لڑکی کی طرف بڑھی۔ اس مکار اور فریب ساز لیڈی کا چہرہ فکر آلود تھا اور ہونٹ مرتعش تھے۔ "پیاری بیٹی!" اس نے ظاہری سنجیدگی سے پھر کہا "آج رات کو بادشاہ پھر اپنے دوستوں کے ساتھ لاموج کی طرف جانیوالا ہے۔ محل میں چہ می گوئیاں شروع ہوگئی ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اسے روک دو۔ تم اس کی ملکہ ہو۔ اسے اپنی طرف متوجہ کرو۔ ضد کرو۔ اصرار کرو۔ اور کسی حال میں آج اُسے محل سے باہر نہ جانے دو۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس سے تم دشمنوں کی زبان بند کرسکتی ہو۔"

میریا کے یاقوتی لب متحرک ہوئے اور اس نے اپنی قوت ارادی کو مجتمع کر کے کہا۔ "آج رات کو گریمالٹ محل سے باہر نہیں جاسکتا۔"

"شاباش!" اس کی ماں نے جواب دیا۔ "ایسی ہی کوشش کرو۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ مردوں کے دماغ میں سفر کی جگہ گھس ہوا کرتا ہے جس کا ثبوت تمہارے مرنیوالے باپ ڈیوک آرلینا نے مجھے کافی طور پر دیا تھا۔ تاہم تم اپنی ذہانت، دلفریبی اور ترغیب سے آج گریمالٹ کو مجبور کر دو۔"

"اماں جان۔ ایسا ہی ہوگا" میریا نے جواب دیا۔

× × × × × ×

"بہتر۔ تو آپ میری التجا کو بیرحمی سے ٹھکرا دیتے ہیں آج آپ محل میں نہیں ٹھہر سکتے؟" میریا نے دبی زبان سے کہا۔

ملکہ میریا نہایت دلکش آسمانی زر لفت کا لباس پہنے ایک غیر متحرک مجسمہ کی طرح شاہانہ خوابگاہ میں کھڑی تھی۔ گریمالٹ کا شاہی محل پیرس سے جنوب کی طرف تقریباً نصف میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ میریا اپنے شوہر کی طرف ٹکٹکی لگائے نہایت ملتجیانہ نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

"لیکن گریمالٹ کی نگاہ میریا کے حسین چہرے اور دلربا آنکھوں کی طرف نہ تھی، وہ انتہائی بے پروائی سے آئینہ کے روبرو کھڑا تھا اور سفر کا لباس پہنکر اپنی ٹوپی میں ایک خوبصورت مصنوعی پھول لگا رہا تھا۔

"مجھے سفر کرنا ضرور ہے" اس نے میریا کے متواتر اصرار پر جواب دیا۔ "میریا! سواری کے لئے ایک اچھا گھوڑا اور دلبستگی کیلئے چند اچھے ساتھی اس سے زیادہ ایک آدمی کو کیا چاہئے؟ راستے کے مناظر، نیلگوں آسمان، صاف ہوا، کھلی ہوئی فضا اور چمکتے ہوئے ستارے۔ یہ مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔"

"جی ہاں عزیز ہیں۔ اور سب سے زیادہ!" میریا نے بھویں جھکا کر کہا "کیا یہ چیزیں آپ کو اپنی بیوی سے بھی زیادہ عزیز ہیں؟"

"تم تو جو کچھ کہتی ہو چبھتی ہوئی کہتی ہو۔" گریمالٹ نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "دنیا میں انسان اپنی بیوی کو تمام عورتوں سے زیادہ چاہتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ اپنے دوستوں سے کنارہ کش ہو جائے۔ بہر حال جیسا کہ میں تم سے کہہ چکا ہوں، آج میں لاموج کا سفر ضرور کرونگا میں ایک افسوسناک جھگڑے کا فیصلہ کرنے جا رہا ہوں۔ میں اس لئے جا رہا ہوں کہ غریب اور بھوکے کسانوں کے مُنہ میں روٹیاں ہوں........"

"بس کافی ہے" ملکہ نے بات کاٹکر کہا "یہ اتنا ہی کافی ہے کہ آپ جا رہے ہیں۔ میری استدعا نہیں سُنتے۔ میری بات نہیں مانتے۔ میری تمناؤں کا پاس نہیں کرتے۔ مجھے اس لئے چھوڑ دیتے ہیں کہ پیرس کی دنیا مجھے ایک ناپسندیدہ، ذلیل، نظروں سے گری ہوئی ملکہ سمجھ کر میرے مضحکے اڑائے میری حالت پر قہقہے لگائے۔"

"دنیا کو ہم ایسے لوگوں سے خالی نہیں کرسکتے جو کسی نہ کسی چیز پر ہنستے ہی رہیں گے۔ لیکن جب تک تم اپنے فرائض محل میں رہکر اور میں اپنے فرائض باہر جا کر ادا کرتا ہوں، ہمیں ان کتوں کے بھونکنے کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔"

میریا نے چاہا کہ شادی سے پہلے محبت اور "کورٹ شپ" کے مختصر وقفہ کی یاد دلا کر گریمالٹ سے التجا کرے۔ لیکن بات زبان پر آکر رہ گئی۔ اس حسینہ کے خیال میں وہی زمانہ ایسا تھا جب گریمالٹ حقیقت میں ایک دلیر اور باہمت بادشاہ ہی نہیں بلکہ سینے میں دل رکھنے والا عاشق بھی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اب شبہات میریا کے دل میں گھر کر رہے تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ محبت نے میری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ جس شخص کو میں ہیرو سمجھتی رہی وہ اسقدر متلون اور بے پروا تھا۔ ایسے شخص کی محبت کا کیا اعتبار جو آج عشق کے بلند و بانگ دعوے کرے، کل بالکل سرد اور غافل ہو جائے، اور اپنے نکمے دوستوں کو اپنی محبوبہ پر ترجیح دے۔

"اچھا جائیے" میریا نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔ "اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" میں یہ بھی نہیں پوچھنا چاہتی کہ آپ کب واپس آئیں گے۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا" گریمالٹ نے ہنسکر جواب دیا۔ "تم تو بالکل ہی خفا ہوگئیں۔ تم جانتی ہو کہ میں نے اپنے امرا کو حکومت کے اہم مشوروں کے لئے آٹھ دن میں طلب کیا ہے۔ کونسل کے وقت تو میں ضرور ہی آجاؤنگا۔ اچھا۔ اب میرے پاس وقت نہیں۔ میریا خدا حافظ۔ اپنی والدہ محترمہ کو میرا سلام کہدینا۔"

گریمالٹ تیزی سے باہر نکل گیا۔ میریا سوچنے لگی "آہ اس کی شخصیت کتنی دلچسپ ہوتی اگر یہ وفادار شوہر ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ گریمالٹ انتہا درجہ کا خود پرست آدمی ہے۔ اگر وہ اپنی ہی راہ پر چلے گا تو میں بھی کوئی اپنی راہ نکالونگی۔ اپنا دل اس کی محبت سے خالی کر دونگی۔ اگرچہ اس سے روح کو اذیت ہوگی تاہم یہ عارضی حالت گذر جائیگی اور وقت خود ہی زخم جگر کا مرہم بن جائے گا۔ کاش آج ہی میں اسے بھول جاتی! آہ۔ انسان کا حافظہ بھی کتنا بیرحم ہے!"

میریا کے دل میں خیالات کا کچھ ایسا محشر بپا تھا کہ کمرے میں ڈچز آرلینا کے داخلہ کی اسے خبر نہ ہوئی۔ جونہی اس کی ماں نے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھا، میریا نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار تمہیں کامیابی نصیب نہ ہوئی" ڈچز آرلینا نے کہا۔ "ہز میجسٹی نے لاتوریج کا سفر کیا۔ کیوں؟"

"ہز میجسٹی جہاں چاہیں جائیں۔" میریا نے منہ بنا کر کہا۔ "مجھے اب اس کی پرواہ نہیں۔ کیونکہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں آرلینا کو واپس چلی جاؤنگی۔ آپ کا جی چاہے تو اس محل کا پہرا کرتے رہیں۔ میں تو اب یہاں نہیں رہ سکتی۔"

ڈچز آرلینا نے سر کو ایک جنبش دی۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ میریا کی ناکامی پر اس کا دل اندر ہی اندر مسرور تھا۔

"تمہیں ایسے غیر ذمہ دارانہ طرز عمل سے باز رہنا پڑیگا" ڈچز آرلینا نے کہا۔ "تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تم ایک شخص کی بیوی اور ایک بادشاہ کی ملکہ ہو۔"

"ملکہ تو ضرور ہوں لیکن بیوی ...." جملہ ختم ہونے سے پہلے میریا نے ایک طنز آمیز قہقہہ لگایا۔ "نہیں۔ بیوی مجھ جیسی بے اختیار اور ناپرسان عورت کو نہیں کہتے۔"

"مجھے اعتراف ہے کہ تمہاری شادی کے معاملہ میں مجھ سے غلطی ہوئی۔" ڈچز آرلینا نے کہا۔ "اس سے ہزار درجہ بہتر تھا کہ تم ڈیوک برگنڈی کے لڑکے ہمفری سے شادی کرتیں۔"

میریا چونک پڑی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس کے دل میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔

"ہمفری؟" اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "ہمفری؟ لیکن اماں جان! کیا آپ نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہمفری کی طرف کچھ توجہ نہ کرنا۔ اگر سارے فرانس میں صرف ہمفری ہی ایک مرد باقی رہ جائے جب بھی تم اس سے شادی کا خیال نہ کرنا۔ کیا آپ کے یہ الفاظ نہ تھے؟"

"ممکن ہے میں نے کہا ہو" ڈچز نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ گریمالٹ ایسا احمق ہے، ایسا ہٹ دھرم ہے، ایسا گدھا ہے جو اپنے دوست اور دشمن دونوں کے لئے خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔ تمہاری شادی یقیناً ایک غلطی تھی۔ لیکن اس غلطی کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے۔ میں جانتی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ ان ظاہری تلخیوں اور ناکامیوں سے کوئی بہتر نتیجہ برآمد ہوگا۔"

یہ کہکر ڈچز آرلینا مسکرائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میریا امید و بیم اور شبہات کے طوفان میں گھر گئی۔ کبھی اسے گریمالٹ کا خیال آتا جس نے اسے سب کی نگاہوں میں ذلیل کیا تھا، کبھی ہمفری کو یاد کرتی جو سال بھر پہلے ایک وفادار عاشق کی طرح اپنا دل نذر کر رہا تھا، لیکن میریا نے اس کی التجاؤں کو ٹھکرا دیا تھا۔

× × × × × × × × ×

گریمالٹ کی غیر حاضری میں کامل ایک ہفتہ تک میریا کی طبیعت میں ایک تلاطم بپا رہا۔ اس عرصہ میں ہمفری اسے اکثر یاد آیا کرتا۔ جب کبھی اپنے حالات پر غور کرتی تو اس کا خیال ہمفری کی طرف منتقل ہو جاتا۔ گریمالٹ کی کوئی خبر ابتک اسے نہ ملی تھی۔ لیکن فضا اس افواہ سے گونج رہی تھی کہ فرانس کے جنوبی اضلاع میں مسلسل لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ گریمالٹ کے دوستوں اور دشمنوں میں جنگ چھڑی ہوئی ہے اور جا بجا محاصرہ، لوٹ مار اور کشت و خون جاری ہے۔

ان تمام وحشت ناک خبروں سے ایک حقیقت صاف طور پر واضح ہوگئی تھی اور وہ یہ کہ ہمفری کے باپ ڈیوک برگنڈی نے فرانس کی غیر مستقل حالت سے فائدہ اٹھا کر گریمالٹ کا متزلزل تخت حاصل کرنے کے لئے ملک پر حملہ کر دیا ہے۔

ہفتہ کے اختتام پر میریا اپنے کمرے میں نہایت فکرمند بیٹھی ہوئی تھی کہ یکایک اس کی ماں آ پہنچی۔

"برگنڈی نے دو بار پہلے بھی اس کی کوشش کی تھی اور شکست کھائی تھی" ڈچز آرلینا نے کہا۔ "لیکن ابکے وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ اس کی فتح یقینی ہے۔"

ڈچز کے چہرے پر مسرت کی ایک ایسی لہر دوڑ رہی تھی کہ میریا حیرت زدہ ہوگئی۔

"میریا! اب تمام مشتبہ حالات کا خاتمہ ہوگیا" ڈچز آرلینا نے تیزی سے کہا "آج رات کو بڑے اہم معاملات درپیش ہیں - برگنڈی یہاں آپہنچا ہے"

میریا چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی ماں کا ناقابلِ فہم طرزِ عمل دیکھ کر ہکا بکا سی ہوگئی۔

"برگنڈی؟" میریا نے مضطرب ہوکر پوچھا۔ "برگنڈی؟"

"اُلو کی طرح آنکھیں نکال کر مجھے نہ دیکھو" ڈچز نے جواب دیا "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم صاف صاف باتیں کبھی نہیں سمجھ سکتیں۔ ہاں برگنڈی۔ رابرٹ ڈیوک آف برگنڈی یہاں پہنچ گیا ہے۔ میں کہہ چکی کہ نہایت اہم معاملات درپیش ہیں"

میریا کی سمجھ میں ابتک کچھ نہ آیا تھا۔ وہ اپنی ماں کا چہرہ دیکھ رہی تھی اور دل سے کہہ رہی تھی "کیا یہ ممکن ہے کہ برگنڈی کونسل میں شرکت کے لئے یہاں آیا ہوا!"

"کس کے بلانے سے؟" میریا نے جھجھک کر پوچھا۔

"میرے بلانے سے۔ بچی۔ میرے بلانے سے" ڈچز نے جواب دیا "کیا تم نہیں جانتیں کہ گریمالٹ کبھی برگنڈی کو دعوت نہیں دے سکتا"

ڈچز نے ایک طنز آمیز قہقہہ لگایا۔ میریا اپنے پریشاں خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"گریمالٹ ایسی حرکت کو معاف نہیں کریگا" میریا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"جہنم میں جائے گریمالٹ اور اس کی معافی۔ میں دونوں پر لعنت بھیجتی ہوں" ڈچز نے منتقمانہ لہجہ میں کہا۔ "گریمالٹ احمقوں کا احمق۔ اب اسے اپنی کرتوت کی سزا مل جائیگی۔ یہ سزا ہر اُس شخص کو ملتی ہے جو ڈچز آرلینا کی مخالفت کرتا ہے۔ گریمالٹ کی کیا ہستی جو میرا مقابلہ کرسکے! میں نے اس سے استدعا کی تھی کہ مجھے آرلینا کی خود اختیاری حکومت دے دی جائے خراج نہ طلب نہ کیا جائے۔ میرے طرزِ عمل پر نکتہ چینی نہ کی جائے۔ لیکن اس نے انکار کردیا۔ وہی گریمالٹ جسے میں نے اپنی لڑکی دیدی۔ یہ احمق بادشاہ میری طاقتوں کا تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ اب اسے معلوم ہوجائیگا کہ صرف آرلینا کیا چیز ہے۔ سارا فرانس اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔"

"لیکن اماں جان!" میریا نے آہستہ سے اپنے ہونٹ چبا کر کہا۔ "آپ نے تو کہا تھا کہ آپ کی خفگی دوسرے اسباب کی بنا پر ہے۔"

"ممکن ہے! ممکن ہے!" ڈچز نے خفگی سے جواب دیا۔ "میں تم سے بحث کرنے نہیں آئی ہوں۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ اب اپنے خوبصورت سر سے گریمالٹ کا سودا نکال پھینکو۔ اس وقت تمہیں جو کچھ کرنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ بہتر سے بہتر لباس پہنکر سُرخ مخمل کا وہ زربفت کا گون جس میں مرصع کمربند ہے اور اطالوی جواہرات کے زیور پہنکر۔ گنبد والے کمرے میں فوراً چلی آؤ۔ میں وہیں جارہی ہوں۔ دیکھو میرا حکم یاد رکھو"

ڈچز آرلینا نے دو خواصوں کو بلاکر میریا کو آراستہ کرنے کا حکم دیا اور وہاں سے چلی گئی۔ میریا اپنی ماں کی غیر محدود طمع اور سازشی فطرت سے واقف تھی۔ لیکن ڈچز کے تحکمانہ انداز نے بچپن ہی سے میریا کو مرعوب کر رکھا تھا۔ ایک طرف خواصیں اسے آراستہ کر رہی تھیں دوسری طرف اس کے خیالات اس اہم معاملہ کے مختلف گوشوں میں پہنچ رہے تھے۔ اس کی ماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس شاہی قلعہ اور قصر میں ڈیوک برگنڈی کی موجودگی یہی تبلا رہی تھی کہ گریمالٹ کا تخت اس سے چھن جائیگا یا چھن چکا ہے اور اس کی ماں نے اس شورش اور بغاوت میں ڈیوک برگنڈی سے پہلے ہی سازباز کر رکھی تھی۔ میریا کا دل بیحد مضطرب تھا۔ وہ سوچ رہی تھی "اب مجھے کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے! معلوم نہیں اس سازش میں مجھ سے کون سا کام لیا جائیگا! کیا میں بھی گریمالٹ کی مصیبت اور جلا وطنی کی شریک ہوجاؤں! یا عمر بھر اپنی مغرور ماں کا حکم مانتی رہوں! خدا جانے ہمفری کا اس سیاہ سازش میں کیا حصہ ہے!........"

میریا جب گنبد والے کمرے کی طرف چلی اور قلعہ کے لمبے اور تاریک اندرونی راستے طے کرنے لگی تو اس کے دل کا اضطراب لحہ بہ لحہ بڑھتا گیا۔ راستے کے سنگین فرش سے اس کے قدموں کی جو آواز اُٹھتی تھی اس سے "دغا اور فریب" کی صدائے بازگشت اس کے کانوں میں آتی تھی۔ ہوا کے سرد زناٹے بھی خطرات کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔ میریا نے جوں ہی شمالی راستہ کی طرف مڑنا چاہا، دفعتاً ایک تاریک گوشہ سے ایک شخص نے نکلکر اس کا بازو پکڑ لیا۔ دہشت کی ایک چیخ میریا کے ہونٹوں تک آتے ہی حیرت کی صدا سے بدل گئی۔

"کون؟ ہمفری!!"

ہمفری نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور جھک کر سلام کیا۔ ہمفری ایک خوبصورت خوش وضع تیس سالہ جوان تھا۔ اس کے آراستہ بالوں سے خوشبو آرہی تھی۔ اور اس کے دلکش لباس اس کے ذوق کا پتہ دے رہے تھے۔

"ہاں۔ میں ہمفری ہوں" اس نے جواب دیا۔ "وہی ہمفری جو تمہاری محبت ترک نہیں کرسکتا، اگرچہ تم دنیا کی سب سے بڑی ملکہ بھی بن جاؤ۔ وہی

ہمفری جس نے تم سے عہد کیا تھا کہ فرانس تو ایک طرف، اگر تم دنیا کے کسی حصہ میں بھی رہو گی، تو وہ تمہارا سایہ بنکر وہاں موجود رہیگا۔"

میریا کو ایسا کوئی وعدہ یاد نہ تھا۔ لیکن ہمفری نے اس دلکش اور دلیرانہ انداز سے اس کا اعادہ کیا تھا کہ میریا نے تسلیم کرلیا۔

"لیکن وہ باتیں تو مدت ہوئی بھولی جا چکیں،" میریا نے جلدی سے کہا اور اپنے چہرے کی افسانہ گو رنگت سے مجبور ہو گئی۔ "اس وقت میں ایک ضروری مشورہ میں شریک ہونے جا رہی ہوں۔"

"میں تو وہیں سے واپس آ رہا ہوں،" ہمفری نے جواب دیا۔ "لیکن پیاری میریا! ان بوڑھے مدبّروں میں تم سی حسینہ کا کیا کام! آؤ ہم تم بالاخانے پر چلیں اور وہاں اپنے مستقبل کے متعلق میٹھی میٹھی باتیں کریں۔ باہمی محبت کی۔ شعر و موسیقی کی۔ رقص و سرود کی۔"

"یہ کیا حماقت ہے!" میریا نے کہا۔ "تم اس طرح باتیں کرتے ہو جیسے مجھے اور تمہیں ساتھ رہکر زندگی بسر کرنی ہے۔ شاید تم میرے شوہر بادشاہ گریالٹ کو بھول گئے ہو!"

یہ سُنکر ہمفری نے ایک قہقہہ لگایا اور تضحیک کے انداز سے کہا۔ "بادشاہ گریالٹ! انہیں کون بھول سکتا ہے؟ اعلیٰحضرت احمق شاہ! کیا اچھا خطاب ہے! ایسے مجنوں کے لئے جو تاج و تخت بھی کھو رہا ہے اور اپنی حسین ملکہ کو بھی چھوٹے منہ نہیں پوچھتا۔ بس اب تم میرے دل کی ملکہ بن جاؤ۔"

میریا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس کی خودداری کو ایک زبردست ٹھیس لگی۔

"تم حد سے بڑھکر باتیں کر رہے ہو،" میریا نے ابروؤں پر بل ڈالکر کہا۔ "شاید تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ اِس وقت میں آرلینا کی ناکتخدا میریا نہیں بلکہ فرانس کی ملکہ ہوں۔"

"ہاں ہاں ملکہ میریا،" ہمفری نے طنزاً کہا۔ "بڑے بادشاہ کی ملکہ۔ کیسا عظیم الشان بادشاہ! اعلیٰحضرت احمق شاہ! جس کے پاس نہ تاج ہے اور نہ تخت! نہ فوج ہے اور نہ ایک جری سپاہی کی تلوار جو اس کے کام آسکے! نہ سارے فرانس میں ایک شہر یا ایک قریہ جو اسے پناہ دے سکے۔"

میریا کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ آخر اس نے گھبرا کر کہا۔ "میں تمہاری مہمل باتیں، تمہاری پہیلیاں نہیں سمجھتی۔"

"نہیں سمجھتی؟" ہمفری نے اکڑ کر جواب دیا۔ "باتیں تو بہت صاف ہیں۔ گریالٹ کو شکست ہو گئی ہے۔ اس کی فوجیں ہر جگہ مغلوب ہو چکی ہیں۔ بارہ گھنٹوں کے اندر ہماری کامیاب فوجیں پیرس میں داخل ہو جائینگی۔ اعلیٰحضرت احمق شاہ اب بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ کیونکہ اُن کی گرفتاری کے لئے تعاقب کیا جا رہا ہے۔ فرانس میں ایک شخص بھی ان کا مددگار نہیں۔ امراء کی کونسل کا بھی یہی حشر ہے۔ اب میرے والد ڈیوک برگنڈی اس کونسل کا اجلاس منعقد کر رہے ہیں۔ یہیں۔ خود گریالٹ کے محل میں۔ کہو اب تو سمجھ گئیں؟ کیسی خوشخبری ہے؟"

"میں دغا، فریب اور سازش کی خبر کو خوشخبری نہیں سمجھتی،" میریا نے دلیری سے جواب دیا۔ "کیا برگنڈی کی حکمرانی سے فرانس زیادہ خوشحال ہو جائیگا!"

"فرانس!" ہمفری نے ہنسکر کہا۔ "جب ہم تم ایک دوسرے سے مل گئے تو فرانس کی کیا پروا؟ لیکن اگر تم فرانس کی ملکہ ہی رہنا چاہتی ہو تو اس کی صورت بھی موجود ہے۔ میں فرانس کا بادشاہ ہونے والا ہوں اور تم .... میری ملکہ"

میریا ہنس پڑی لیکن اس کی ہنسی میں نفرت اور غصہ کے پہلو صاف نمایاں تھے۔ اس سے پہلے میریا کے خواب و خیال میں ہمفری ایک ہیرو تھا۔ لیکن جو اصلیت پر نظر پڑی تو وہ ایک مغرور، پھیکا اور غیر مخلص آدمی نکلا۔ میریا اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ گریالٹ کے خیالات نے اب اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ وہ اس کے بھاگنے کی اور دشمنوں کے تعاقب کی خبر سُنکر پریشان ہو گئی تھی۔

* * * * * * * *

میریا نے جس وقت گنبد والے کمرے میں قدم رکھا، اس کا دھڑکتا ہوا دل گہرے شکوک اور شبہات کا مسکن بنا ہوا تھا۔ آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑیوں کے شعلے کمرے میں دھندلکے کا عالم پیدا کر رہے تھے۔ ایک وزنی سیاہ گول میز کے چاروں طرف ڈیوک برگنڈی اور دس بارہ امراء بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے بہت سے کاغذات اور نقشے کھلے ہوئے تھے۔ ڈچز آرلینا بھی اس مشورہ میں شریک تھی، اس کے اشارے پر ڈیوک برگنڈی نے کرسی سے اٹھکر ملکہ میریا کا استقبال کیا۔

"تمہارا آنا ہمارے ارادوں کی کامیابی کے لئے فال نیک ہے۔" برگنڈی نے ایک مصنوعی نرم لہجہ میں کہا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ سرزمین فرانس کو اس بے مغز کمزور اور نالائق 'احمق شاہ' سے پاک کر کے یہاں کی سرپری رعایا پر ایک مضبوط حکومت قائم کریں۔"

میریا خاموشی کے ساتھ اپنی ماں کے بغل میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ اس ظالم لارڈ کی طرف جس کا ظاہر بھی باطن کی طرح نفرت انگیز تھا۔ ظاہری دوستی کا ہاتھ بھی نہ بڑھا سکی۔ وہ فرانس کے اُن رؤسا کو یہاں بیٹھے

ہوئے دیکھکر جلی جاتی تھی جن پر گریالٹ کو اعتماد تھا اور جو آج برگنڈی کے ساتھ ملکر اپنے پہلے بادشاہ کا مضحکہ اُڑا رہے تھے، میریا نے ان سب کے تبسم اور سلام کے جواب میں انتہائی خاموشی اور سرد مہری اختیار کرلی اور تلخی کے ساتھ سوچنے لگی کہ سب کے سب ایسے دغا بازانہ اور غدار ہیں جن کا قلب اور جن کے ضمیر کی آواز خاموش ہوچکی ہے۔ ان میں سے ایک بھی اتنا دلیر، اتنا مہربان، اتنا وفادار اور اتنا شریف النفس نہیں ہے جتنا کہ گریالٹ، وہی گریالٹ جو اپنی بدنصیبی کے باعث ان کی ملامتوں کا نشانہ بنا ہوا ہے۔

میریا دعا کر رہی تھی کہ فرانس کے اِن دغابازوں پر خدا کا قہر نازل ہو۔ اور سب سے زیادہ لعنت وہ ڈیوک ٹولوز پر بھیج رہی تھی، جس نے اس کی شادی کے روز بھی گریالٹ سے مستقل محبت اور وفاداری کا اظہار کیا تھا لیکن جب میریا ٹولوز کی طرف گرم نگاہ سے دیکھتی تو وہ آنکھیں بچا کر اپنے بغل والے آدمی سے باتیں کرنے لگتا۔ یعنی ٹولوز کا چچا کاونٹ چیلیو، جس کی سیاہ عینک، لمبی داڑھی اور سبز مخمل کا بڑا اور ڈھیلا لبادہ وقار کا متلاشی معلوم ہوتا تھا۔ کاونٹ چیلیو سب کی باتیں غور سے سُنتا تھا اور خود بہت کم باتیں کرتا تھا۔ میریا نے اسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ یہی سب سے پُرانا گرگِ باراں دیدہ ہے۔

میریا کے تلخ محسوسات کو اس کے چہرے پر نمایاں دیکھکر اس کی ماں ڈچز آرلینا نے آہستہ سے کہا۔ "لڑکی! تجھے کیا ہوگیا ہے؟ کیا ہمارے حلیف یعنی برگنڈی کے دوست ایسے ہی کھٹے منہ اور کڑوی نگاہوں کے مستحق ہیں؟"

"دوست؟" میریا نے نفرت آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ "کس کے دوست؟ کل گریالٹ کے۔ آج برگنڈی۔ اور آئندہ معلوم نہیں کس کے۔ اماں جان۔ میں آپ کے دوستوں کو پسند نہیں کرتی۔ اور نہ ان کی غداری کو۔"

"چپ رہ بیوقوف" ڈچز نے تلخی سے کہا۔ "اور یاد رکھ کہ اگر آج میں ایسے دوست نہ رکھتی تو تُو بھی 'احمق شاہ' کے ساتھ کہیں بھاگی بھاگی پھرتی"

"کاش ایسا ہی ہوتا۔ آج میں اپنے شوہر کی مصیبتوں کی شریک ہوتی۔ نہ کہ ان جھوٹے غداروں کے درمیان بیٹھی ہوتی" میریا نے بیباکی سے جواب دیا۔

ڈچز آرلینا کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا، لیکن دل سے ایک سخت جنگ کرنے کے بعد اس نے اپنے جذبات کو دبایا اور میریا کے شانے پر ہاتھ رکھکر آہستگی اور نرمی سے کہا۔ "سنو۔ بیٹی۔ سنو۔ یا تو تم نے اپنے حواس کھو دئے ہیں یا معاملہ نہیں سمجھتیں۔ اس انقلاب سے تمہارا کوئی نقصان نہیں۔ تم اب بھی فرانس کی ملکہ رہوگی۔ چند گھنٹوں میں ہمفری سے تمہاری شادی ہوجائے گی اور گریالٹ کی جگہ ہمفری کی بادشاہت کا اعلان کردیا جائیگا۔ بس اب اپنے جھگڑوں اور شکووں کا دفتر لپیٹ دو۔ میں کہہ دیتی ہوں کہ میری خوشی اسی میں ہے۔ میرا غصہ تمہارے لئے بہت بُرا ہوگا۔"

ساری عمر اس جابر ماں کی فرمانبرداری کرتے کرتے میریا کی عادت میں تحمل کا حصہ اسقدر داخل ہوگیا تھا کہ اسے چپ ہوجانا پڑا، لیکن وہ عمداً ہر موقع پر ہمفری سے نظر بچا رہی تھی جو اس کمرے میں پہنچکر اور ایک کرسی پر بیٹھ کر میریا کو گھور رہا تھا۔ میریا کا دل غم و غصہ سے لبریز تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی ماں اسے شطرنج کے ایک مُہرے کی طرح اس خطرناک کھیل میں استعمال کرنا چاہتی ہے۔

تھوڑی دیر تک اپنے ساتھیوں سے سرگوشیاں کرنے کے بعد ڈیوک برگنڈی نے کہا۔ "اب ہمیں صرف شہر پیرس کے اندر داخل ہونا باقی رہگیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں چونکہ سنا گیا ہے کہ پیرس کے بدمعاش باشندے اور بازاری آدمی اب تک 'احمق شاہ' کی حمایت کرتے ہیں، اس لئے جبتک وہاں 'احمق شاہ' کی لاش پہلے سے نہ بھیج دی جائے ہمارا داخلہ کسی حدتک غیر محفوظ ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ میں 'احمق شاہ' کے قتل پر زور دے رہا ہوں۔"

"مائی لارڈ ڈیوک" ہمفری نے کہا۔ "یہ قتل جہاں تک جلد ہو بہتر ہے کیونکہ جبتک گریالٹ کی بیوی بیوہ نہیں ہوتی مجھے اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔"

اس پر لوگوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور برگنڈی نے ایک تبسم کے ساتھ اپنے فرزند ارجمند کے اظہارِ شوق کا جواب دیا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ وائکاؤنٹ (ہمفری) کو تخت سے زیادہ ملکہ کی چاہ ہے۔ بہر حال یہ شباب کا قصور ہے جس پر ہم سے بڈھے رشک کرتے ہیں (ارؤسا کو مخاطب کرکے) لیکن سچ یہ ہے کہ اب مذاق یا تاخیر کا وقت باقی نہیں رہا۔ اگر گریالٹ زندہ رہا تو ہمیشہ باغیوں کا ایک مرکز موجود رہیگا۔ اگر گریالٹ مرگیا تو فرانس پر ہماری گرفت مکمل ہوجائے گی۔ اور بغاوت کا راستہ مسدود ہوجائیگا۔ اب فیصلہ آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ کہئے! احمق شاہ کے لئے حیات یا فوری موت؟"

"موت! موت!! موت!!!" یہی خوفناک صدا ہر زبان سے نکلی

اور کمرے میں ہر طرف گونج اُٹھی۔ برگنڈی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"ہر طرف سے ایک ہی جواب ملتا ہے!" برگنڈی نے پُرزور آواز میں کہا۔ "اور چونکہ سب لوگ متفق ہیں اس لئے میں حکم دیتا ہوں کہ ...."

"نہیں!" یہ کہکر میریا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کا چہرہ زرد تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور ہمت و وقار بلند پیشانی اور اونچی نگاہوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ڈیوک برگنڈی میز کی دوسری طرف اس کے آمنے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میریا نے اس کے مقابلہ میں دلیری سے کہا۔ "نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا!"

برگنڈی نے حیرت سے منہ کھولدیا اور اُس کی آنکھیں اپنے حلقوں میں پھر پھر کر میریا کی طرف دیکھنے لگیں۔

"گریمالٹ قتل نہیں کیا جائیگا!" میریا نے پھر زور دیکر۔ "حضرت! فعل نہایت ہی ذلیل، وحشیانہ اور شیطنت پر مبنی ہوگا۔ گریمالٹ قتل کا سزاوار نہیں۔ وہ شخص جس نے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی ہے۔ جس نے فرانس کی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے جس نے مفلس اور نادار رعایا کو ہمیشہ آرام پہنچایا ہے۔ جس نے ...."

"خاموش، خاموش!" برگنڈی نے بات کاٹکر بے صبری سے کہا۔ "ڈچز آرلینا! ہم یہاں پر تمہاری پاگل لڑکی کی مجنونانہ بکواس سننے کو جمع نہیں ہوئے ہیں۔"

ڈچز آرلینا خود بھی غصہ میں اس طرح آپے سے باہر ہو رہی تھی کہ اُس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ اس نے زور سے میریا کی آستین پکڑ کر کھینچی، لیکن میریا نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"میں فرانس کی ملکہ کی حیثیت سے بولتی ہوں" میریا نے پوری طاقت جمع کرکے کہا۔ "اور اسی حیثیت سے اپیل کرتی ہوں کہ وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں اور جو کل گریمالٹ کے دوست اور خیرخواہ تھے آج اس خطرناک انجام سے اسے بچائیں۔ اس بربریت، اس ظالمانہ سازش سے اسے نجات دلائیں!"

"قسم ہے مقدس رُوح کی کہ تمہاری اپیل بالکل بیکار ہے۔" برگنڈی نے مزید خفگی سے جواب دیا۔ "فرانس کی ملکہ اب کوئی بھی نہیں جبتک ہمفری کے سر پر فرانس کا تاج نہ رکھا جائے۔ ملکہ صاحبہ! بہتر ہے تم یہ ہذیان بندکرو ورنہ تمہارے لئے جو مستقبل ہم نے سوچ رکھا ہے اس سے بھی ہاتھ اُٹھانا پڑیگا۔"

"میں اور میرا مستقبل؟" میریا نے حقارت سے کہا۔ "آپ سخت غلطی پر ہیں اگر آپ نے یہ خیال کرلیا ہے کہ میں اس خونیں اور قاتلانہ سازش میں آپ کا ہاتھ بٹاؤنگی۔ میں بزور اعلان کرتی ہوں کہ میں، میریا، ملکہ فرانس، بادشاہ فرانس گریمالٹ کی خادمہ اور مددگار رہوں۔ کیا یہاں کوئی شخص نہیں جو میری مدد کو اُٹھ کھڑا ہو؟ کوئی نہیں؟"

میریا نے اپیل کے طور پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے لیکن ایک شخص نے بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کی کسی کے چہرے سے ہمدردی ظاہر نہ ہوئی۔

"خیر یہی سہی" میریا نے جذبات سے مغلوب ہوکر کہا۔ "اگر اس مجمع میں ہر شخص جھوٹا اور غدار ہے تو میں پیرس کو جاتی ہوں اور وہاں اُن دوستوں سے اپیل کرونگی جو ...."

برگنڈی کے حمایتوں کے لئے میریا کا طرزِ عمل اب ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے احتجاجی شور میں اس کی آواز دبادی اور ہمفری نے اس کا بازو پکڑ کر اسے میز سے پیچھے کھینچ لیا۔

"توبہ۔ توبہ" ہمفری نے کہا۔ "کیسی دیوانی ہوگئی ہو! کیا میں یقین کر لوں کہ تم بھی احمق ملکہ ہو۔ اسی احمق شاہ کی طرح۔"

"چپ رہو!" میریا نے ڈانٹ کر کہا۔ "میری شادی ایک عالی مرتبہ انسان سے ہوئی ہے۔ تمہاری حیثیت ایک اُلّو یا گیدڑ سے زیادہ نہیں۔"

ہمفری کا چہرہ غصہ سے لال ہوگیا اور اپنی اس تذلیل و تحقیر کا بدلہ لینے کے لئے اس نے میریا کے چہرے پر ایک طمانچہ مارنا چاہا لیکن اس نے جونہی ہاتھ اٹھایا کاؤنٹ چیلیو جو دیر سے خاموش بیٹھا یہ سب تماشے دیکھ رہا تھا اور ڈیوک ٹولوز سے سرگوشیاں کر رہا تھا دفعتاً اُٹھ کھڑا ہوا اور ہمفری کو اپنے مضبوط ہاتھوں سے پکڑ کر میریا سے الگ کردیا۔

"کیسے دلیر ہو کہ عورت سے جنگ کر رہے ہو؟" کاؤنٹ چیلیو نے کہا۔ پھر ڈچز آرلینا کی طرف مخاطب ہوا۔ "آپ کی عقل کہاں کھوئی گئی تھی کہ اپنی لڑکی کو اس مجمع میں لے آئیں؟"

"ہاں اس مکارہ کو یہاں سے لیجاؤ" ہمفری نے ایک وحشیانہ انداز سے کہا۔ "اور جبتک یہ اپنے ہوش میں نہ آئے اسے کوڑے لگاؤ۔"

"کوڑے لگانے کا نام نہ لو۔" کاؤنٹ چیلیو نے دفعتاً تشدد کے لہجے میں کہا۔ "ورنہ اپنی دوا کا مزا آپ ہی کو چکھنا پڑیگا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہاری شوخی اور بدتمیزی کوئی اس حد تک برداشت کرسکتا ہے تو ......"

کاؤنٹ چیلیو یکایک خاموش ہوگیا۔ اس کا جسم غصہ سے تھرتھرا رہا تھا اور اُنگلیاں لمبی داڑھی پر چل رہی تھیں۔ میریا اس غیر متوقع امداد سے حیرت زدہ ہوکر اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی کہ یکایک اس کے رنگ کے تغیر نے میریا کو دہشت اور استعجاب میں ڈال دیا۔ ایک

برقی سرعت کے ساتھ میریا نے اُس شخص کو پہچان لیا، اور اپنے بے قابو ہونے والے جذبات کو چھپانے کیلئے اُس نے نگاہ پھیر لی۔ تاکہ ایسا نہ ہو کوئی دوسرا بھی پہچان جائے۔ لیکن میریا کی یہ امید دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ ہمفری کو بھی کاؤنٹ چیلیو پر کچھ شبہ سا ہو چکا تھا اور اس نے فوراً ہی اُس کا لبادہ کھینچ کھینچنا شروع کیا۔

"جاسوس! جاسوس! دغا! دغا!"

کاؤنٹ چیلیو کو بھی اب تاب نہ رہی تھی۔ اس نے اپنے طاقتور ہاتھوں کی تیز حرکت سے بیک وقت اپنا لبادہ، عینک اور نقلی ڈاڑھی یہ تینوں چیزیں اُتار پھینکیں۔ تمام حاضرین کی انتہائی حیرت، اور دہشت کے درمیان ڈچز آرلینا چیخ اُٹھی۔

"گریمالٹ! گریمالٹ!!"

"ہاں میں!" گریمالٹ نے کہا۔ "ڈچز صاحبہ! میں۔ ڈیوک برگنڈی! میں"

"آہ۔ یہ بڑی دغابازی ہے" ڈیوک برگنڈی نے جواب دیا۔

"نہیں مائی لارڈ" گریمالٹ نے کہا۔ "یہ نسخہ تو میں نے آپ ہی سے حاصل کیا ہے۔ آپ کو تو ایسی چیزوں میں کمال حاصل ہے۔ کاؤنٹ چیلیو کا بھیس اختیار کر کے میں اپنے مہربان اور سچے دوست ڈیوک ڈولوز کے ہمراہ آپ کے حمائتیوں اور آپ کی فوج کے ساتھ ہو گیا تھا، تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ میرا دوست کون ہے، اور دشمن کون ہے۔ اور میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ میری خوشدامن صاحبہ (ڈچز آرلینا) میرے محل میں آپ کی میزبانی کا حق کس طرح ادا کرتی ہیں"

"بس۔ سُن چکا" ڈیوک برگنڈی نے دفعتاً کھڑے ہو کر اپنے ساتھیوں سے کہا "گریمالٹ اور ڈولوز دونوں کو گرفتار کر لو"

"ہا ہا ہا ہا" گریمالٹ نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "مائی لارڈ ڈیوک اب تک دھوکے میں ہیں۔ اس کمرے سے باہر تشریف لیجا کر بالاخانہ سے دیکھئے کہ فرانس پر کس کی حکومت ہے۔ میری یا آپکی؟ چلیئے میں آپ کو دکھاؤں"

ڈیوک برگنڈی بادل ناخواستہ کمرے سے نکلکر گریمالٹ، ڈولوز، ڈچز آرلینا، میریا وغیرہ کے ساتھ بالاخانے پر آئے۔ ایک عجیب منظر سامنے تھا۔ قلعہ کی فصیل کے نیچے دستے پر دستہ اور فوج پر فوج آگے بڑھی آ رہی تھی۔ اور اس عظیم الشان لشکر کے ہزاروں جلتے ہوئے مشعلوں کی روشنی فضائے آسمانی کو سرخ کر رہی تھی۔

"یہ ہے اُن ناداروں اور مفلسوں کی فوج جن کی میں ہمیشہ خدمت کرتا رہا ہوں" گریمالٹ نے فخر سے کہا۔ پھر کمرے کے اندر آ کر تین بار تالیاں بجائیں۔ فوراً پچاس مسلح جوان داخل ہوئے۔

"ان تمام باغیوں کو گرفتار کر لو!" گریمالٹ نے حکم دیا۔ (ڈچز آرلینا سے مخاطب ہو کر) آپ کے متعلق میں اپنے محترم دوست ڈیوک ڈولوز سے مشورہ کرونگا)۔ (میریا سے) مجھے امید ہے میری دلیر اور وفادار ملکہ اپنے احمق شاہ کو معاف کریگی۔ میں اتنی سازشوں میں گھرا ہوا تھا کہ تم پر بھی اُس وقت اعتماد نہ کر سکتا تھا"

"آہ میرے سرتاج" حسین میریا نے اپنی شرمیلی آنکھیں جھکا کر جواب دیا۔ "معافی کی طلبگار تو میں ہوں۔ میری عقل کھوئی گئی تھی۔ میں اندھی تھی۔"

"آج کے بعد معافی کا لفظ میرے تمہارے درمیان نہیں آئے گا"

گریمالٹ نے پیار سے جواب دیا اور دونوں ہاتھ سے ہاتھ ملائے ہوئے محل کی طرف روانہ ہو گئے۔

سید ابن الحسن فکر ایم۔ اے

غزل

رازِ ہستی ہے عقدۂ مشکل
عشق میرا ابھی نہیں کامل

وہ سمندر ہے موجزن دل میں
ہائے جس کا کوئی نہیں ساحل

جا رہا ہوں کہاں خدا جانے
پوچھتا ہوں ہر ایک سے منزل

میری ہستی ہے وجہ ناکامی
ورنہ ہے کون بیچ میں حائل

کامیابی ہے عین ناکامی
میرا حاصل ہے ماتمِ حاصل

ایک افسانہ رہ گیا جاذب
اب نہ لیلا ہے اور نہ ہے محمل

جاذب دہلوی

ایک جہاز کو دیکھکر

جو بندرگاہ سے رخصت ہو رہا ہے

خدا رکھے تجھے محفوظ طوفانی ہواؤں سے
سمندر کی چٹانوں سے سمندر کی بلاؤں سے

تجھے چھوڑا ہی بوڑھی ماؤں نے موجوں کے دھارے پر
بخیر و عافیت اِک دن پہنچ جائے کنارے پر

ترے دم سے ہیں وابستہ امیدیں ناتوانوں کی
لئے جاتا ہی ساتھ اپنے امانت خستہ جانوں کی

رہے محفوظ تیرا قصرِ عالی شان پانی پر
تری رفتار غالب ہو سمندر کی روانی پر

عجب عبرت فزا منظر ہے زیرِ آسماں پیدا
فضا میں چار جانب ہے دعاؤں کا سماں پیدا

جواں بیٹے جدا ہوتے ہیں حسرتناک ماؤں سے
جگر خوں ہیں "خدا حافظ" کی غم پرور صداؤں سے

کہاں لے آئی ہے تقدیر اِس آفت کے مارے کو
کیا ہے باپ نے رخصت ضعیفی کے سہارے کو

ڈھلے ہیں نور کے سانچے میں چاندی سی بدن جنکے
بہارِ خلد سے رنگین تر ہیں پیرہن جن کے

قریب آ پہنچیں لمبی ساعتیں دردِ جدائی کی
وہ حالت ہی کہ صورت دیکھتا ہے بھائی بھائی کی

مگر اِس غم کے پردے میں مسرت مسکراتی ہے
اُمید کشور آرائی دلوں کو گدگداتی ہے

جوانانِ وطن اپنے وطن سے دور ہوتے ہیں
ستارے دامنِ چرخِ کہن سے دور ہوتے ہیں

چلے ہیں غیر ملکوں میں تجارت کی گدائی کو
بڑھینگے ہاتھ اِن کے ایک دن کشور کشائی کو

پڑیں گے تختِ کیکاؤس و دارا پر قدم اِن کے
گڑیں گے مشرقی رنگیں فضاؤں میں علم اِن کے

جھکیں گی اِن کے در پر گردنیں مغرور شاہوں کی
غلامی سے بدل جائے گی نخوت کج کلاہوں کی

جگہ دیگی زمینِ ایشیا اِن میہمانوں کو
کریگی پیش شاہانِ گزشتہ کے خزانوں کو

وطن کو ناز ہے ایسے بہادر نوجوانوں پر
کہ جو راہِ طلب میں کھیل جائیں اپنی جانوں پر

خدا جب قوم کی تقدیر کو اقبال دیتا ہے
تو اس کے دل میں شوق ملک گیری ڈال دیتا ہے

فاخرؔ (ہریانوی)

اکبر اعظم اور بیرم خاں

جب کسی ملک میں بدامنی پھیلتی ہے تو حکومت کو سخت گیری سے کام لینا پڑتا ہے۔ بغیر اس کے امن وامان قائم کرنا اور ملک کو دشمنوں اور مفسدوں سے پاک کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن جب بغاوتیں فرد ہو جائیں۔ فسادات مٹ جائیں۔ غنیم کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ رعایا میں امن وسکون اور ملک بیرونی خطروں سے محفوظ ہو جائے تو حکومت کو چاہیئے کہ اپنے اس اصول کو بدل کر رعایا سے نرمی کا سلوک کرے۔

اکبر کی کمسنی اور بیرم خاں کی اتالیقی کے زمانے میں ہندوستان کی یہی حالت تھی۔ بیرم نے سختی سے کام لیکر اُن تمام خطروں کو رفع کیا جو حکومت کو کمزور کر رہے تھے۔ اب جبکہ مرکزی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ نرمی کا برتاؤ ضروری تھا لیکن بیرم اس اصول سے ناواقف تھا۔ وہ اپنے جابرانہ طریقہ ہی پر کاربند رہا۔ اس غیر مدبرانہ طرز سے لوگوں میں بددلی پھیلنے لگی اور وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر مخالفت کیلئے تیار ہو گئے۔ اس رنگ کو دیکھتے ہوئے بیرم نے سختی میں اور اضافہ کیا تاکہ فتنے دب جائیں۔

ابوالمعالی ایک مدبر اور بہادر شخص نے ...... ہمایوں کے زمانے میں خاص اعزاز حاصل کیا تھا۔ اسے اپنی ذہانت اور شجاعت پر اعتماد اور شاہی عزت و وقار پر ناز تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بیرم خاں کا ہم پلہ خیال کرتا تھا۔ بیرم خاں کو برابری کا دعویٰ بُرا معلوم ہوا۔ اکبر کی تخت نشینی کے ساتھ ہی جب اس کو کل اختیارات حاصل ہو گئے تو فوراً اسکے قتل کا ارادہ کیا لیکن اکبر نے اس سے اتفاق نہ کیا، کیونکہ وہ خونی کارناموں سے اپنی سلطنت کے دور کا آغاز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی ابوالمعالی کو بیرم نے قید کر دیا۔

تردی بیگ کو بھی جو اکبر کی تخت نشینی کے وقت سپہ سالار تھا۔ بیرم خاں کی ہمسری کا دعویٰ تھا۔ چونکہ تمام شاہی لشکر اس کے قبضہ میں تھا۔ اس لئے بیرم کو اس سے زیادہ اندیشہ تھا۔

ہیمو کے حملے کے وقت اس نے پیر محمدؒ کو خفیہ طور پر تردی بیگ کے استقامات میں خلل ڈالنے کے لئے روانہ کیا۔ میدانِ جنگ میں پیر محمد ہی پہلا شخص تھا جو وہاں سے فرار ہوا۔ اس کو دیکھ کر دوسرے سرداروں نے بھی تقلید کی۔ اور یہی تردی بیگ کی شکست کا خاص سبب ہوا۔ بیرم خاں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر بغیر بادشاہ کی اجازت کے اس کو قتل کروا دیا اور لکھ بھیجا۔ "چونکہ یہ بدنیت اور فریبی تھا اس لئے اس کا قتل کیا جانا نہایت ضروری تھا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔" اکبر کو یہ سخت ناگوار گذرا، لیکن مصلحت وقت نے اس کو زبان ہلانے کی اجازت نہ دی۔

مصاحب بیگ اپنے سابق حقوق کا لحاظ کرتے ہوئے نہایت مغرور ہو چلا تھا۔ اور بیرم خاں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ بھلا بیرم کو یہ کہاں گوارا تھا۔ فوراً کسی نہ کسی ترکیب سے اس کو بھی قتل کر دیا گیا۔

خواجہ جلال الدین نہایت بیباک اور صاف گو امیر تھا۔ یہ بیرم خاں سے نفرت کرتا تھا، اسی وجہ سے یہ بھی قتل کیا گیا۔ اس قسم کی باتوں کا اثر رفتہ رفتہ ہر طبقے پر پڑنے لگا۔ سب سے پہلے امراء متاثر ہوئے کیونکہ بیرم انہیں کی ٹوہ میں تھا۔ جو امراء پہلے ہی سے بیرم کے خلاف تھے وہ رعایا کو اس سے بدظن کرنے کی کوشش کرنے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ کامیاب ہو گئے۔ امن کی متلاشی رعایا اس جابرانہ حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے ہمہ تن مصروف ہوئی۔ بادشاہ ظاہری حالات کو دیکھ رہا تھا اور آئندہ خطرات کا اندازہ کر رہا تھا لیکن ابھی اکبر بیرم کی علانیہ مخالفت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک طبقہ امراء کا بیرم کی مخالفت پر باضابطہ کمر بستہ ہُوا۔ ایک طرف یہ رعایا کو اس کے خلاف کرنے کی کوشش کرتا دوسری طرف بادشاہ کے کان بھرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ بھی دن بدن بیرم سے بدظن ہونے لگا۔

مغلوں کے زمانے میں صدر الصدور کے عہدہ کی خاص اہمیت تھی۔ رعایا میں چونکہ سنیوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے ہمیشہ اس عہدہ پر سُنی کا تقرر ہوتا تھا۔ لوگ مذہبی رواداری کے قائل نہ تھے۔ تنگ خیال یا متعصب تھے۔ ایسی نازک حالت میں بیرم نے ایک شیخ گدائی کو اس عہدہ پر فائز کیا۔ سُنی رعایا اب بیرم کی کھلی مخالفت کے لئے تیار ہو گئی۔

اس سخت گیری کے علاوہ بیرم عاقبت نا اندیش بھی تھا۔ رعایا تو اس سے بددل ہو ہی چکی تھی۔ اس کو چاہیئے تھا کہ بادشاہ کو ملا کر رکھتا

لیکن بیرم نے اُس کی بھی پروا نہ کی۔ اکبر کے ذاتی اخراجات کیلئے اس نے کوئی رقم مخصوص نہ کی۔ اس کے خاص ملازمین کو قلیل تنخواہیں دی جاتی تھیں اور ان کے ساتھ بُرا سلوک کیا جاتا تھا۔ برخلاف اس کے خانخاناں کے ملازمین خوشحال تھے۔ اکبر ان سب واقعات کو دیکھتا تھا لیکن بیرم کے احترام کی وجہ سے ان چھوٹی باتوں میں دخل دینا نہیں چاہتا تھا۔

ان سب کے علاوہ ہاتھیوں کے قصے نے معاملہ کو اور بھی نازک کر دیا۔ اکبر کو شروع ہی سے ہاتھیوں کی کشتی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ مان کوٹ میں ایک ہاتھی لڑتا ہوا اتفاق سے بیرم خاں کے خیمہ تک پہنچ گیا۔ اسی بے ہنگامی میں دو تین خیمے گر پڑے۔ بیرم خاں پریشان ہوا اور اکبر کے پاس کہلا بھیجا کہ اس سے کون سا قصور سرزد ہوا جسکی سزا میں یہ ہاتھی اس کے خیمے پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اکبر نے یقین دلایا کہ یہ محض اتفاقی امر تھا اور مزید اطمینان کیلئے اپنے فیلبان کو اس کے پاس بھجوا دیا کہ اگر وہ مناسب سمجھتا ہے تو اسے سزا دے۔ بیرم نے تمام ہاتھیوں کو فیل خانے سے نکلوا کر امراء میں تقسیم کروا دیا۔ لازمی طور پر اکبر کو اس کا رنج ہوا ہوگا۔

دوسرے موقع پر اکبر کا ایک ہاتھی مہاوت کے قابو سے نکل گیا اور بیرم کے فیلخانے میں گھس پڑا۔ یہاں اس نے ایک ہاتھی کو ہلاک کر دیا۔ بیرم غصے سے آگ بگولا ہوگیا اور فوراً شاہی فیلبان کو قتل کروا دیا۔ یہ حرکت شاہی ادب اور اخلاق کے خلاف تصور کی گئی۔

ایک اور دفعہ بیرم ندی کے کنارے کشتی پر تفریح کر رہا تھا۔ یکایک ایک مست ہاتھی نے اس کی کشتی کا رُخ کیا۔ لیکن فیلبان موقع پر پہنچ گیا اور بمشکل تمام ہاتھی کو قابو میں کیا۔ جب اکبر کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے فیلبان کو بیرم کے پاس بھجوایا۔ بیرم تو ہاتھیوں کو اپنی جان کا دشمن سمجھتا ہی تھا اس واقعہ سے اور بھی متاثر ہو کر فوراً اس فیلبان کو بھی قتل کرنے کا حکم دیا۔

انہیں واقعات سے سیاسی اختلافات کے ساتھ ساتھ ذاتی رنجش بھی پیدا ہوگئی۔ اس کے علاوہ اکبر کی عمر اس وقت اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی اور قدرتی طور پر اس کے دل میں حکومت کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ مہا ماتنگا۔ ادھم خاں شرف حسین اور شہاب الدین وغیرہ نے بادشاہ کے کان بھرنے شروع کئے۔ بالآخر اکبر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لینے کیلئے راضی ہوگیا۔ اور شکار کے بہانے سے دہلی پہنچا جہاں سب کچھ پہلے سے ٹھیک ٹھاک ہو چکا تھا۔ اکبر اپنے ساتھ کامران کے بیٹے ابوالقاسم کو بھی لے گیا۔ (اس واقعہ کو بطور ثبوت کے پیش کیا جاتا ہے کہ جو سازش بیرم خاں کے خلاف تھی اس سے اکبر شروع ہی سے واقف تھا اور اس کو ہمراہ لے جانے کا سبب یہی تھا کہ کہیں بیرم خاں موقع پا کر اکبر کی غیبت میں اپنی تخت نشینی کا اعلان نہ کر دے)

"دہلی پہنچنے کے بعد اس نے بیرم خاں کو خط لکھا کہ اس کی والدہ کی طبیعت ناساز ہے اور اس کے یہاں آنے میں ادہم خاں، شہاب الدین اور مہا ماتنگا وغیرہ کا کوئی دخل نہیں۔ اس خط کو پہنچتے ہی ہر طرف یہ افواہ پھیل گئی......کہ اکبر نے بیرم خاں کو معزول کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔"

بیرم خاں نے اُس کے جواب میں خط لکھا اور اپنے ہمراز پیر محمد خاں کو اکبر کی خدمت میں یہ پیغام دیکر روانہ کیا کہ اس خیرخواہ کے دل میں بادشاہ کے نیک خواہوں کی طرف سے بدی کیونکر آسکتی ہے لیکن اس پیغام کا کچھ اثر نہ ہوا۔ دہلی میں سب انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ خط کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ اور جو پیغام لیکر آئے تھے اُنہیں وہیں روک لیا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ کی طرف سے خاص خاص معتبر امراء اور عہدہ داروں کو فرمان روانہ کئے گئے۔ جن کا مضمون یہ تھا۔

"بیرم خاں نے مشاغل کے سبب سے راہِ راست سے انحراف کیا۔ اس لئے وہ ہماری نظر سے گر گیا۔ ہم دہلی چلے آئے۔ جو شخص کہ ہم سے اخلاص رکھتا ہے یا معاملہ فہم ہے اور اپنی نجات چاہتا ہے یا اپنا مقصد حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ اس فرمان کو دیکھتے ہی ہماری خدمت میں حاضر ہو جائے تاکہ ہر شخص کو مراتب والا اور مناصب گرامی سے ہم سرفراز فرمائیں کیونکہ یہ ہمارے زمانۂ حکومت کا آغاز ہے۔"

اس فرمان کے پہنچتے ہی قریب قریب سب ممتاز عہدہ دار۔ امراء اور منصبدار بیرم خاں سے جُدا ہو کر اکبر سے مل گئے۔ اُن میں سے شمس الدین وکیل اور حاکم پنجاب مقرر ہوا جو بیرم خاں کا قائم مقام سمجھا گیا۔ ان واقعات کے بعد بیرم خاں نے اپنے چند ہمراز اور مخلص دوستوں کو بادشاہ کی خدمت میں معافی حاصل کرنے کی غرض سے بھیجا لیکن یہ پہنچے تو دہلی کا رنگ دیکھکر دنگ رہ گئے اور زبان تک نہ ہلا سکے۔ انہیں بھی واپس ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس طریقہ سے بیرم کے سب رفیق و ساتھی جدا ہوگئے تو خود اس نے دربار میں حاضر ہو کر معافی مانگنے کی اجازت چاہی۔ اکبر کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اُس نے اس ارادہ سے منع کیا اور ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ اب بیرم نے مجبور ہو کر مکہ معظمہ جانے کا قصد ظاہر کیا۔ اور گوالیار سے اپنے خاندان والوں کو ساتھ لیکر پنجاب کا رُخ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس

نے چلتے چلتے حاکموں - جاگیرداروں اور زمینداروں میں شورش پیدا کرنے کی کوشش کی - اس موقع پر اکبرؔ نے ایک فرمان اس کے نام روانہ کیا۔

"چند لوگوں کے مشورے پر جو حقیقت میں تمہارے درپے آزار ہیں تم نے ہمارے بعض علاقوں میں بغاوت پیدا کرنے کی کوشش کی ...... خیال کرو کہ چالیس سال تک تو تم نے مراعات - عنایات - عزت و دولت حاصل کی اور ہمارے سبب ہی سے تمہارا نام عالم میں چمکا اور اب تم خود ہماری مخالفت پر آمادہ ہو - تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم آنی چاہیئے - بہتر ہے کہ تم عازم مکہ معظمہ ہو جاؤ - اب بھی ہم تم کو عزیز رکھتے ہیں اور تمہاری واپسی پر حسب سابق تم کو سرفراز فرمائیں گے"

بیرمؔ خاں نے اس فرمان کا کچھ بھی خیال نہیں کیا اور پنجاب کی طرف روانہ ہوا - ادہم خاں اور پیر محمد اس کا راستہ روکنے کیلئے بادشاہ کی طرف روانہ کئے گئے - بیرمؔ نے مکہ معظمہ جانے کا وعدہ کیا اور سامانِ امارت واپس کر دیا - اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی کہ وہ اب دنیا سے تنگ آ گیا ہے اور کوئی دنیاوی مرتبہ حاصل کرنے کا دوبارہ خواہشمند نہیں ہے -

لیکن اس کے ساتھیوں نے سمجھانا شروع کیا کہ خواہ کچھ ہو آخری مرتبہ پھر قسمت آزمائی کر لینی چاہیئے - اور معاملے کو بغیر ختم کئے چھوڑ دینا حماقت ہے - جب باغی ہی ٹھیرے تو ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے میں کیا مضائقہ ہے - آخر کار بیرمؔ کو راضی کر ہی لیا - جب اکبرؔ کو خبر ہوئی تو اس نے پھر ایک فرمان روانہ کیا -

"ہمیں توقع تھی کہ جب تم ہماری حکومت کی خبر سنو گے تو مسرور ہو گے اور تسلیم و رضا میں ثابت قدم رہو گے لیکن تم چالیس سالہ احسانات کو فراموش کر کے ان مفسدوں کے کہنے میں آ گئے - لہذا اگر اب تم اپنے ارادہ سے باز نہ آئے تو ہمارا لشکر تمہارے درپے آزار ہو گا - تمہارے ادبار اور ہمارے اقبال کا زمانہ ہے - اس لئے ہمیں یقین ہے کہ ہماری فتح ہو گی اور تم شرمسار ہو گے -"

خانخاناں پر اس فرمان کا بھی کچھ اثر نہ ہوا اور اپنی جدوجہد میں مشغول رہا - بالآخر بیرمؔ اور اکبرؔ کی فوج کا جالندھر کے قریب مقابلہ ہوا - بیرمؔ نے شکست کھائی - اکبرؔ بھی اب موقع پر پہنچ گیا تھا ...... اس لئے بیرمؔ نے اپنے معتمد کو بادشاہ کی خدمت میں بھیجکر معافی چاہی - اکبرؔ نے اپنے سپہ سالار منعم خاں کی معرفت، جس پر بیرمؔ کو بھی اعتماد تھا، اس کا قصور معاف کیا اور ہر طرح سے اس کو اطمینان دلایا -

۲۶ محرم ۹۶۸ھ کو بیرمؔ اکبرؔ کی خدمت میں سرنگوں حاضر ہوا - عذر و معذرت کی اور گریہ و زاری کرنے لگا تو اکبرؔ نے خود اس کو اپنے ہاتھ سے اٹھایا اور حسب سابق اپنے پاس بٹھایا - خلعت فاخرہ عطا کی اور خوشی سے سفر حجاز کی اجازت دی - پچاس ہزار روپیہ نقد اور سامان سفر عنایت فرمایا - اب بیرمؔ خاں نے ساحل کا رُخ کیا - راستہ میں نہروالہ کے مقام پر قیام کیا - یہاں کا گورنر ایک افغانی امیر تھا - جو بیرمؔ کے ساتھ نہایت خاطر و مدارت سے پیش آیا - اس کا وقت یہاں اکثر باغات کی سیر و تفریح میں گذرتا تھا - ایک دن جنوری ۱۵۶۱ء میں وہ جھیل کی تفریح سے واپس ہو رہا تھا کہ چند افغانوں نے اس پر حملہ کیا - ایک چھوٹی سی جماعت کا سردار مبارک خاں تھا جس کا باپ بیرمؔ کی سپہ سالاری میں ۱۵۵۵ء کی ایک جنگ میں مارا گیا تھا - اس حملہ میں بیرمؔ قتل ہوا - کہا جاتا ہے کہ کئی دن تک اس کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی - چند فقرا نے آخر اس کی تجہیز و تکفین کی -

بیرمؔ کی بیوی سلیمہ بیگم جو اکبرؔ کی قرابت دار تھی دربار میں لائی گئی - اکبرؔ نے اس کے ساتھ نہایت عزت و احترام کا برتاؤ کیا - چند سال بعد یہ اکبرؔ کے حرم میں داخل کر دی گئی - اسکے چار سالہ لڑکے عبدالرحیم کی تعلیم و تربیت کا اکبرؔ نے خاص اہتمام کیا - یہی لڑکا آگے چلکر خانخاناں ہوا اور اکبرؔ کے بعد جہانگیر کے زمانہ میں بھی خاص عہدہ پر فائز رہا -

سیّد بادشاہ حسن حیدرآبادی

انفعال

(انگریزی افسانوں میں شاہ آرتھر کی وہی حیثیت ہے جو الف لیلہ میں خلیفہ ہارون رشید کی ہے، گوئینیور اُس کی ملکہ ہے اور سر ماڈریڈ بھتیجا، سر لانسیلاٹ اس کے دربار کا ایک معزز سردار ہے، اور کیملاٹ الف لیلہ کے بغداد کی طرح پائے تخت ہے۔ گوئینیور اور لانسیلاٹ کے متعلق ہر شخص کو اختیار ہے کہ خواہ موافق رائے قائم کرے یا مخالف، افسانہ اس بارہ میں خاموش ہے۔)

ایک تو جاڑے کی راتیں ستم، اُس پر ژالہ باری قطرہ اور پھر باد تند کے طوفان خیز جھونکے اور قیامت، کوچہ و بازار میں سناٹا تھا، لوگ اپنے اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے اور امراء آتش دانوں اور انگیٹھیوں کے پاس دنیا اور اہل دنیا سے بے خبر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے، آمسبری کی بڑی خانقاہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مقدس کنواریاں اور باخدا راہب عبادت نیم شبی کے بعد خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ مگر اس چار دیواری کے مشرقی حصہ میں ایک جلتی ہوئی شمع اس بات کا ثبوت دے رہی تھی کہ اس مکان میں کم از کم ایک متنفس ضرور بیدار ہے۔

ملکہ گوئینیور جو آرتھر کے زمانہ اقبال میں اس کی مونس و شریک زندگی رہی تھی اُس وقت ایک سنسان مقام میں کرسی پر بیٹھی ہوئی، اشک مسلسل کی دو لڑیاں اس کی آنکھوں سے جاری تھیں اور ایک مومی شمع اس کے سامنے جل رہی تھی۔

اس تاریک شب میں، اس اجڑے مقام پر اس کی جلیس صرف ایک عورت تھی جو اس وقت بھی اس کے پاس بیٹھی ہوئی آنسوؤں کو گرتے دیکھ رہی تھی مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ گوئینیور سے اس کا سبب دریافت کرے۔

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ گوئینیور جو کسی زمانہ میں کیملاٹ کی ہر دلعزیز ملکہ تھی اور جس کی پیشانی نازک پر گرہ پڑنے سے اوراق حکومت تہ و بالا ہو جاتے تھے اس وقت آمسبری کی خانقاہ میں کیوں اقامت پذیر ہے اس کی وہ ہر دلعزیزی کہاں گئی۔ اس کے شوہر نے اس سے کیوں بے اعتنائی کی اور خود اس نے کیملاٹ کے شاہی دربار سے کیوں قطع تعلق کر لیا۔

ابتدائے آفرینش سے سرداری ایک معزز عہدہ سمجھا گیا ہے اور اس کے حصول کے واسطے ہر شخص کوشش کرتا ہے، اور اس سلسلہ میں روپیہ، پیسہ حتیٰ کہ عزت تک دینے میں دریغ نہیں کرتا، عزیزوں کا گلا کاٹتا اور ان کے عہدہ پر قابض ہونا چاہتا ہے۔

آرتھر کے دربار میں سر ماڈریڈ کا شمار بھی اسی قسم کے لوگوں میں تھا۔ بظاہر تو وہ بہت خیر خواہ اور سنجیدہ معلوم ہوتا تھا لیکن درحقیقت خبث باطن میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ گوئینیور اور لانسیلاٹ سے تو اسے للّٰہی بغض تھا اور وہ ہمیشہ اس بات میں کوشاں رہتا کہ ان دونوں کی شکایت کسی ایسے طریقہ سے کی جائے کہ بادشاہ کو ان سے سوء ظن پیدا ہو جائے۔

ایک دن جب آرتھر صبح سے شکار کو گیا ہوا تھا اور ملکہ اپنی جلیس ایلینڈ کے ساتھ باغ میں بیٹھی ہوئی تھی، ماڈریڈ پوشیدہ طور پر وہاں گھس آیا، تاکہ لانسیلاٹ اور گوئینیور کی پوشیدہ گفتگو سن سکے لیکن یہ دیکھ کر کہ سر لانسیلاٹ وہاں موجود نہیں ہے، باہر نکل آیا۔

سر لانسیلاٹ جو خود ماڈریڈ کا دشمن تھا اُس وقت باغ کے قریب ہی موجود تھا۔ اس نے اپنے دیرینہ مخالف کو آتے دیکھا تو آگے بڑھ کر چند ایسے ہاتھ رسید کئے کہ شہزادے کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا لیکن اس نے کمال بے حیائی سے سر لانسیلاٹ کی بعید از فہم طاقت اور بہادری کی تعریف کرتے ہوئے اپنے قصور کی معافی چاہی اور چل دیا۔

لیکن جس طرح انسان کی پرانی بیماریاں از سر نو عود کر آتی ہیں اسی طرح ماڈریڈ کی خباثت نے چند روز کے بعد پھر رنگ لانا شروع کیا۔ سر لانسیلاٹ اس کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگا اور گوئینیور جو بادشاہ کو اس کے مکر و فریب سے آگاہ کرتی رہتی تھی اس کے خیال میں سد راہ حکومت ہو گئی۔

آخر اس نے اس خار کو اپنے راہ سے دور کرنے کی یہ ترکیب سوچی کہ بادشاہ پر ان دونوں کا باہمی ارتباط اس طریقہ سے ظاہر کیا جائے کہ [illegible] کا دشمن ہو جائے۔ چنانچہ ایک روز اس نے دربار کی تمام سربرآوردہ امراء کو اپنی چرب زبانی سے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ آرتھر سے تخلیہ میں ملکہ اور ان کے خفیہ تعلق و ارتباط کا ذکر اس پیرایہ میں کریں کہ بادشاہ دونوں سے بدظن ہو جائے۔

اِدھر سر لانسیلاٹ ماڈریڈ کو نیچا دکھا کر باغ میں گیا اور گوئینیور سے اس کا واقعہ کا ذکر کیا۔ ملکہ جو اس بد ذات کی سرشت سے اچھی طرح واقف تھی یہ سنکر بہت متفکر ہوئی اور کہنے لگی " اب بہتر یہ ہے کہ تم کیملاٹ سے چلے جاؤ ورنہ یہ بدخو ضرور بادشاہ سے تمہاری شکایت کریگا۔ اور ممکن ہے کہ سادہ لوح بادشاہ امرا کے کہنے سے تمہیں قتل کرا دے یا کوئی سزا دے۔"

لانسیلاٹ نے اس کو منظور نہ کیا اور گوئینیور کے دل میں ہر وقت یہ خدشہ رہنے لگا کہ دیکھئے اس پر کونسی مصیبت نازل ہوتی ہے۔ انسان اپنے متعلق کبھی بُری رائے قائم نہیں کرتا، گوئینیور نے لانسیلاٹ کے متعلق تو خیال کیا کہ شاید ماڈریڈ اسے نقصان پہنچائے مگر خود اپنے اس قسم کا گمان بھی نہ کیا حالانکہ سر ماڈریڈ وہ چال چل رہا تھا کہ لانسیلاٹ کو تو اس سے بچنے کی امید بھی ہو سکتی تھی لیکن ملکہ اپنے دامن عصمت سے اس داغ کو کسی طرح نہ چھڑا سکتی تھی۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو گئے اور اب رفتہ رفتہ تمام ملک میں یہ خبر مشتہر ہو گئی کہ شاہ آرتھر کی حسین و ہر دلعزیز ملکہ فرانسیسی نائٹ سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن جس طرح روشن شمع کے نیچے تاریکی ہوتی ہے اسی طرح خود لانسیلاٹ اور گوئینیور اس سے بے خبر تھے۔ آخر جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ تمام امراء اور خود بادشاہ ان سے کشیدہ رہنے لگا تو گوئینیور نے موقع پا کر لانسیلاٹ سے کہا۔ " آخر وہی ہوا جو میرا خیال تھا۔ ماڈریڈ نے نہ صرف تم کو بدنام کیا بلکہ مجھے بھی برباد کر دیا۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ۔ ورنہ ہم دونوں کی ملاقاتیں افواہ کو یقین کے درجہ تک پہنچا دیں گی۔"

لانسیلاٹ ابھی کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ کمینہ خصلت سر ماڈریڈ اپنے چاپلوس دوستوں کے ساتھ وہاں آ گیا اور چلایا۔ " ملزم لانسیلاٹ اور گناہگار ملکہ (اپنے ساتھیوں سے) یہ دونوں مجرم ہیں ان کو گرفتار کر لو!"

جس طرح بپھرا ہوا شیر ایک وار میں دو تین کو لب گور پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح فرانسیسی نائٹ نے بھی ایک ہی حملہ میں ساری جماعت کو منتشر کر دیا۔ اور ماڈریڈ کو اس شرط پر رہائی دی گئی کہ آئندہ اُن دونوں سے تعرض نہ کرے۔

گوئینیور نے پھر کہا۔ " اب واقعات کی صورت بدل گئی۔ ماڈریڈ اور اس کے ہمراہیوں نے ہم کو ایک جگہ دیکھ لیا ہے۔ اور اب میرے واسطے بجز فرار کے چارہ نہیں (ٹھہر کر) اچھا تم اپنے وطن کی راہ لو اور میں جہاں ممکن ہوا چلی جاؤنگی۔"

لانسیلاٹ نے جواب دیا۔" عالیجاہ ملکہ قصور مجھ سے سرزد ہوا ہے۔ اس کی پاداش میں بھگتوں گا۔ آپ ناکردہ گناہ کیوں مُتہم کی جائیں۔"

لیکن گوئینیور نے منظور نہ کیا۔ " گناہگار دل اعضا و عناصر کو کمزور کر دیتا ہے۔ میری رُوح گناہگار تھی، بہرحال جو کچھ ہونا تھا ہو گیا لیکن اب ہم کو روانہ ہو جانا چاہئے ورنہ تھوڑی دیر راہ فرار بھی مسدود ہو جائے گی۔"

لانسیلاٹ نے پھر کہا۔" اگر آپ نے فرار کا ارادہ ہی کر لیا ہے تو میرے ساتھ فرانس چلئے، وہاں میرے عالیشان محل آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔ میری زمین آپ کا خیر مقدم کریگی، میرے نوکر آپ کی خدمت کرینگے اور خود میں آپ کا بندۂ بے دام بنکر رہوں گا۔"

گوئینیور " یہ ممکن ہے اور میرے واسطے باعث آسائش بھی ہوگا لیکن اس صورت میں عوام کو بھی یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ ملکہ ایک نائٹ کے ساتھ چلی گئی اور اس وقت ان لوگوں کو بھی جو اس خبر کو محض افواہ اور افترا پردازی سمجھتے ہیں یقین ہو جائیگا کہ میں دراصل اس گناہ کی مرتکب ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں میں ابھی خفت مٹانے کے واسطے ایک ناکردہ گناہ شریف نائٹ کو مورد الزام نہ ہونے دونگی۔ اگر دیکھا جائے تو گناہگار میں ہی ہوں میں ایک شخص کی بیوی، ایک بادشاہ کی ملکہ، ایک دل کی بلاشرکت غیر واحد مالک اور ایک ملک کی ہر دلعزیز سلطانہ تھی۔ مجھے اپنی رعایا کے سامنے ایک نظیر بنکر رہنا چاہئے تھی مگر آہ ماڈریڈ اور میری قسمت ——"

الفاظ اس کے منہ سے نہ نکل سکے، وہ تھوڑی دیر خاموش کھڑی ہوئی اس عالیشان محل کو دیکھتی رہی جو اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے چھوٹنے والا تھا۔ اس نے پھر اپنے خیالات کو مجتمع کیا اور کہا۔" مگر تم مجرد ہو اور تمہیں کوئی گناہگار نہیں کہہ سکتا۔ (رک کر) اب توقف بیکار ہے۔ جاؤ اصطبل سے دو گھوڑے لے آؤ۔ ایک پر تم اپنے ملک کو چلے جانا اور ایک پر میں ——"

ابھی تک گوئینیور نے اپنے متعلق کوئی رائے قائم نہ کی تھی مگر اس وقت اسے خیال پیدا ہوا کہ مجھے کہاں جانا چاہئے۔ باپ کے پاس جانا تو باعث تذلیل تھا اور لانسیلاٹ کے ہمراہ وہ جا نہ سکتی تھی، آخر بڑی دیر کے غور و خوض کے بعد یہ رائے قائم کی کہ اگر آمسبری کی بڑی خانقاہ پناہ دے سکے تو وہ مدت العمر وہیں رہیگی۔

آمسبری کا راستہ چونکہ کیملاٹ سے ہی جدا ہو گیا تھا اس لئے لانسیلاٹ نے ملکہ سے اجازت چاہی اور اپنے راستہ چلا گیا۔ گوئینیور کو اس وقت اپنی بے کسی اور کس مپرسی کا اندازہ ہوا۔ گذشتہ کی یاد نے رہ رہ کر اس کے

دماغ پر اثرات قائم کرنے شروع کئے اور اس کے وہ خیالات جو آمسبری کی خانقاہ کے متعلق تھے بدلنے لگے۔ آرتھر کی محبت اور دائمی خجالت نے آپس میں تکرار شروع کی، کیملاٹ کے محلات اور باغات کی یاد نے دل میں ایک تازہ داغ دیا اور قریب تھا کہ وہ واپس ہو جائے مگر ماڈریڈ کی یاد نے اس خیال کو مسترد کر دیا اور وہ ہر چہ بادا باد کہکر آمسبری کی خانقاہ کی طرف بڑھنے لگی۔

تاریک شب میں، سنسان جنگل کی رہرو، ملکہ گوئینیور جو ایک جلیل القدر فرماں روائی ناز پروردہ لڑکی، ایک عالیجاہ شہنشاہ کی نازآفریں ملکہ اور ایک بہادر قوم کی عالی مرتبت سلطانہ تھی، خاموش چلی جا رہی تھی، ستارے دزدیدہ نگاہی سے اس ناکردہ گناہ کو دیکھ رہے تھے اور دریائے اسک اپنی ملکہ کے استقبال کے واسطے ساکت کھڑا تھا۔

جب دامن شب چاک ہوا تو گوئینیور بھی اپنے واماندہ مرکب سے اُتری اور فرش زمین پر بیٹھ گئی۔ مرغان سحری نغمہ طرازی کر رہے تھے۔ اور وہ آنسو بہا رہی تھی۔ جب شدت تاثر کم ہوا تو ایک بلبل آشفتہ نوا نے پھر اس کے دل میں شورش پیدا کر دی۔ ملکہ نے خیال کیا کہ پرندہ "پشیمانی پشیمانی" کہکر اُس کو خجل کر رہا ہے مگر یہ خیال محض بے بنیاد ثابت ہوا کیونکہ جب اُس نے دوسرے پرندوں کی آواز پر غور کیا تو اسے اپنے اس خیال پر خود ہنسی آگئی۔

آمسبری بڑے گرجا میں صبح کی نماز ختم ہو رہی تھی، مقدس کنواریاں اور با خدا راہب کلیسہ سے نکل کر خانقاہ کی طرف جا رہے تھے، لاٹ پادری ابھی تک قربانگاہ کے پاس کھڑا تھا اور چند لوگ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے۔ ایک نن جس کا نام سینٹ میری تھا اور جو اس خانقاہ میں سب سے سربرآوردہ تھی اپنے حجرہ میں بیٹھی ہوئی آئندہ ہفتہ کا حساب بنا رہی تھی کہ خادمہ نے آکر ایک مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔

نن نے تعجب سے پوچھا۔ "میرا مہمان، میں تو عرصہ سے کسی کو جانتی بھی نہیں۔ کیا وہ کوئی بوڑھی نن ہے یا خانقاہ کی مجاور؟ اور وہ آئی کہاں سے ہے۔"

خادمہ نے کہا۔ "نہ وہ کوئی نن ہے اور نہ مجاور، نہ بوڑھی ہے اور نہ خانقاہ سے کوئی تعلق رکھتی ہے۔ اس کے جسم پر ایک خوبصورت ریشمین لباس ہے اور اس کا چہرہ بدر کامل کو خجل کر رہا ہے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہے اور آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

سینٹ میری اس ناخواندہ مہمان کا حلیہ سنکر بہت متعجب ہوئی۔ مگر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ خود جا کر دریافت کرے۔ سینٹ میری کی نورانی صورت دیکھتے ہی ملکہ گھوڑے سے اُتر کر سرو قد کھڑی ہو گئی۔

دو منٹ کی خاموشی کے بعد جب دونوں ایک دوسرے کی صورت کو اچھی طرح دیکھ چکیں ملکہ نے لحہ بہ لحہ کم ہونے والی آواز میں کہا "مقدس راہبہ میں آپسے مدد کی خواستگار ہوں، مسیح کے لئے مجھے ناامید نہ کیجئے۔ میرے متعاقبین بہت طاقتور ہیں اور میں ایک کمزور عورت ہوں مقدس ماں، میں بے گناہ ہوں مگر اہل دنیا مجھ کو گنہگار سمجھتے ہیں، میں پاکباز ہوں مگر وہ میری پاکبازی کا یقین نہیں کرتے۔"

سینٹ میری نے دریافت کیا۔ "بیٹی تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے اور وہ لوگ کون ہیں جو تمہارا تعاقب کر رہے ہیں۔"

ملکہ گوئینیور نے کچھ دیر پس و پیش کیا اور پھر کہنے لگی۔ "محترم خاتون دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جن کے متعلق کسی کو علم نہیں کہ وہ کون ہیں، میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک خود قضا و قدر اس راز کو ظاہر نہ کرے میں اپنے متعلق کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہونگی۔"

سینٹ میری نے دریافت کیا۔ "اس حالت میں تمہاری کیا مدد کی جا سکتی ہے؟"

ملکہ نے کہا۔ "بس یہی کہ آپ مجھے خانقاہ میں داخل کر کے دشمنوں سے پناہ دیں۔"

سینٹ میری سوچنے لگی کہ آیا ایسی مشتبہ عورت کو خانقاہ میں داخل کرنا چاہیئے یا نہیں مگر اس کی ظاہری شرافت اور حسن کامل نے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے خلوت خانہ کو نووارد کے وجود سے زینت دے۔

ملکہ کو آمسبری کی خانقاہ میں داخل ہوئے دو مہینہ ہو گئے مگر اس عرصہ میں نہ تو اس نے کسی نن سے بات چیت کی اور نہ خانقاہ سے باہر نکلی جب بہت جی گھبراتا تو ایک نوجوان عورت سے جو حال ہی میں خانقاہ میں داخل ہوئی تھی اور پہلے ہی دن سے ملکہ سے مانوس ہو گئی تھی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر لیتی مگر پھر رنج و الم کی تصویر بن جاتی۔

مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ ملکہ کے نام پر بدنامی کا داغ لگا، گھر چھوٹا، شوہر چھوٹا۔ اور تنہائی، رنج و غم ان سب کے بدلے حصہ میں آیا، لیکن آج یہ سنکر کہ سر ماڈریڈ نے ارتھر کے خلاف بغاوت کر دی ہے اس کو بیحد تشویش ہو گئی۔ آج کا دن اس نے گریہ وزاری اور دعا میں گذار دیا۔ اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ کیوں کیملاٹ سے چلی آئی اور کیوں لانسیلاٹ کو فرار ہونے کی صلاح دی۔

شام کا وقت تھا، آفتاب غروب ہو چکا تھا، کیملاٹ کے شاہی محلوں پر چاندکی کرنیں ضیا پاشی کر کے عجب حسرتناک سین پیش کر رہی تھیں اور آمسبری کی بڑی خانقاہ میں گوئینیور جوش گریہ سے درماندہ ہو کر سر در گریبان بیٹھی تھی۔ زمانہ گذشتہ کی یاد جس میں نا معلوم کیا کیا حسرتیں مضمر تھیں، اس کے دل سے ایک لمحہ کے لئے محو نہ ہوتی تھی۔ نازبردار شوہر کے مصائب نے اس کے لئے ایک نیا کوہ گراں بنا کر کھڑا کیا تھا اور ماڈریڈ کی بغاوت کی خبر اس کے حق میں سم قاتل بن گئی تھی۔ اور گول میز کے سورماؤں کی کم ظرفی سے اس کے دل میں ناسور پڑ گئے تھے۔

اس وقت وہ نوجوان عورت بھی آ گئی اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ جس کو گوئینیور ایک گونہ ناگواری کے ساتھ سنتی رہی۔ عورت نے پوچھا۔ "آپ نے لانسیلاٹ کی بغاوت کا حال سنا؟"

گوئینیور نے تعجب سے پوچھا۔ "لانسیلاٹ یا ماڈریڈ؟ صبح تو تم نے ماڈریڈ کہا تھا؟"

عورت نے جواب دیا۔ "ہاں۔ صبح مجھے پورا حال معلوم نہ تھا۔ مگر اس وقت سینٹ میری کی زبانی معلوم ہوا کہ لانسیلاٹ بادشاہ کے محل سے گوئینیور کو لے گیا۔ اور پھر فرانس میں جا کر لوگوں کو بادشاہ کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ اس خبر کو سنکر شہنشاہ اعظم فرانس تشریف لے گئے تاکہ اس دغاباز کی سرکوبی کی جائے اور یہاں سر ماڈریڈ نے موقع پا کر علم بغاوت بلند کر دیا۔ خدا ہمارے بادشاہ کی مدد کرے اور یہ دونوں دغاباز داخل جہنم ہوں۔"

گوئینیور اپنی بدنامی، لانسیلاٹ کی بغاوت، آرتھر کی محبت اور اس کی پریشانی کا خیال کر کے بے اختیار رونے لگی اور نوجوان عورت جس کو ان باتوں کا وہم و گمان بھی نہ تھا سمجھانے لگی۔ "ہر شخص کو اپنے ملک اور بادشاہ سے محبت ہونا لازمی ہے لیکن یہ رونے کا وقت نہیں بلکہ دعا کا وقت ہے شاہ آرتھر فرانس گئے ہیں تاکہ لانسیلاٹ کو گوئینیور کے اغوا کی پاداش میں جہنم واصل کریں اور اپنی ملکہ کو اگر وہ باعصمت ثابت ہو واپس لے آئیں۔ ہمارے بادشاہ کے مصائب کا خیال کیجئے، پہلے اس کی ملکہ چلی گئی پھر لانسیلاٹ نے بغاوت کی اور اب ماڈریڈ نے اس کی مملکت پر قبضہ کر لیا ہے۔ دیکھئے آئندہ خدا کیا دکھاتا ہے۔ (سوچکر) یہ سب خرابیاں اصل میں ملکہ کی پھیلائی ہوئی ہیں نہ وہ بیوفائی کرتی اور نہ یہ نوبت آتی۔

اس وقت گوئینیور کی حالت کا اندازہ کرنا احاطہ امکان سے باہر ہے اس کی پیشانی عرق انفعال سے تر تھی۔ اس کی نیچی نظریں اور جھکی ہوئی پلکیں کہہ رہی تھیں کہ مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں۔ اس کے چہرے کا اترا ہوا رنگ بتا رہا تھا کہ اسے اس خبر سے کوئی خاص تعلق ضرور ہے۔ وہ دل میں کہہ رہی تھی "کیا یہ لڑکی مجھے اپنی سادہ باتوں سے ہلاک کر دیگی۔ (بآواز) افسوس! خدا اس دغاباز کو غارت کرے اور شاہ ـــ شاہ (اس کے خشک لبوں سے "آرتھر" نہ نکل سکا) پھر اپنے موروثی تخت پر جلوہ افروز ہو۔"

نوجوان عورت نے کہا۔ "آمین، ہم سب عورتوں کو متأسف ہونا چاہیئے کہ ہماری ہی ہم جنس گوئینیور ان امور کا باعث ہوئی۔ نہ وہ لانسیلاٹ سے تعلق پیدا کرتی اور نہ یہ نوبت آتی اور ابھی تو روز اوّل ہے آئندہ دیکھئے کیا ہونا ہے۔"

یہ الفاظ نہ تھے تیر و نشتر تھے کہ دل میں پیوست ہو گئے۔ لڑکی برابر کہہ رہی تھی۔ "دنیا میں کسی کا اعتبار نہیں جب خود ملکہ نے بیوفائی کی، جب لانسیلاٹ جیسا شریف نائٹ باوجود قول و قرار کے منحرف ہو گیا۔ جب بادشاہ کے بھتیجے نے بغاوت کر دی تو پھر کس سے امید کی جا سکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ فرانسیسی نائٹ آرتھر کا عزیز ترین دوست تھا؟"

ملکہ نے دفع الوقتی کے لئے کہا۔ "ہاں سر لانسیلاٹ بڑا شریف آدمی تھا اس کا برتاؤ عورتوں سے بہت اچھا تھا۔ بہادری میں بھی کوئی اس کا ثانی نہ تھا۔ اور بادشاہ سے اسے بیحد محبت تھی۔"

نوجوان عورت "ہاں وہ شریف تھا مگر اس کی ساری شرافت اس کمینہ حرکت کی نذر ہو گئی۔"

اب گوئینیور سے ضبط نہ ہو سکا اور جھلا کر کہنے لگی "تمہیں کیا معلوم کہ آرتھر کے دربار میں کون شریف تھا اور کون رذیل۔ سر لانسیلاٹ سے آج تک کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ اور یہی اس کی پاکدامنی کا کافی ثبوت ہے۔"

نوجوان عورت ملکہ کے غصہ کو مطلق نہ سمجھ سکی اور کہنے لگی۔ "کاش لانسیلاٹ ہوتا، مگر اس وقت تو آپ نے اس کی ایسی تعریف کی گویا آپ ہی ملکہ ہیں۔ ان الفاظ کو سنکر گوئینیور اچھل پڑی اور معاً اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ لڑکی میرے پیچھے بطور جاسوس کے لگی ہوئی ہے۔ غصہ کے زبردست بھوت نے اس کو بے قابو کر دیا اور چلا اٹھی۔ "نمک حرام عورت تو جاسوس بنکر آئی ہے، خبردار آج سے میں تیری صورت اس چہار دیواری میں نہ دیکھوں۔"

غریب عورت مطلق نہ سمجھ سکی کہ ان الفاظ کا کیا مطلب ہے اور کیوں اس پر عتاب نازل ہوا ہے۔ مگر اس نے اس وقت باہر چلا جانا ہی مناسب سمجھا۔ گوئینیور کچھ دیر تو خاموش بیٹھی رہی پھر کہنے لگی۔ "افسوس، میری گرانباریِ گناہ نہ معلوم کیا کیا کرائیگی۔ بھلا میں نے اس وقت اس کو کیوں

حصہ سادہ غریب لڑکی ان معاملات کو کیا جانے اُس نے تو ویسی ہی ایک بات کہہ دی اے میرے خدا! تو اپنی کریمی سے میرے گناہوں کو معاف کر دے میں تجھ سے عفو کی طالب ہوں اور عہد کرتی ہوں کہ آج سے حتی الامکان کوئی گناہ نہ کرونگی۔"

اس دوران میں اس کو ان سنہری ایام کا خیال آیا جب اس نے پہلی بار سر لانسیلاٹ کو دیکھا تھا، مئی کا خوشگوار مہینہ اور بہار کا موسم تھا، اس وقت آرتھر کا فرستادہ نائٹ سر لانسیلاٹ نوجوان و حسین کیوپڈ کی طرح پہنچا اور گوئینیور کے باپ سے آرتھر کا پیغام کہا ملکہ نیک ساعت میں رخصت کر دی گئی اور دونوں کیملاٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ لوگ آپس میں باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اور آئندہ واقعات سے مطلق بے خبر تھے۔ نہ لانسیلاٹ جانتا تھا کہ اس کو آرتھر کے دربار سے بدنام ہو کر فرار ہونا پڑیگا اور نہ دوشیزہ ملکہ کو ہی خیال تھا کہ اس کے گلے میں بیوفائی اور گناہگاری کا دائمی طوق پڑ جائیگا۔ آخر یہ سفر ختم ہوا اور وہ کیملاٹ کے محلات کے سامنے پہنچ گئے۔

پھر اسے آرتھر سے پہلی ملاقات کا خیال آیا جب وہ لوگ شہر میں داخل ہوئے تو ہر طرف غلغلہ شادمانی بلند ہوا۔ اور اس کا نازبردار شوہر بنفس نفیس اس کی پیشوائی کو آیا۔ بادشاہ نے خود بڑھکر گوئینیور کو اُتارا اور محل میں لے گیا جہاں اس کی دلبستگی کے واسطے سیکڑوں خوبصورت کنیزیں اور امراء کی بیگمات موجود تھیں۔

ابھی وہ اپنی خیالات میں مستغرق تھی، کہ دروازہ پر گھوڑوں کی ٹاپوں نے اس کو چونکا دیا۔ پھر سینٹ میری کی آواز یہ کہتے سنائی دی "یہ عالیجاہ بادشاہ وہ عورت اس کمرے میں ہے"۔

گوئینیور سوچنے لگی کہ آخر وہ کون شخص ہے جسے سینٹ میری نے بادشاہ کے لقب سے یاد کیا اور کس عورت سے ملنا چاہتا ہے۔ لیکن ابھی وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچی تھی کہ دروازہ کھلا اور طویل القامت شخص سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق رات کی تاریکی میں اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ گوئینیور اس کی صورت دیکھ رہی تھی اور وہ شخص ملکہ کو گھور رہا تھا۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ اس نے ملکہ کو پہچان لیا کیونکہ اس کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے "افسوس تم اس کَ [illegible] ہمپرسی کے عالم میں ہو، تم اس شخص کی چشم و چراغ ہو جس سے مجھے بیح [illegible] کی زندگی ایسا باغ [illegible] تھی۔ کاش تم اس کے ہم قدم چلتی اور ہم دونوں [illegible] ہیں خزاں کا کبھی گذر نہ ہوتا۔" اتنا کہہ کر و [illegible] گیا مگر یہ دیکھکر کہ گوئینیور خاموش بیٹھی ہے پھر

کہنا شروع کیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ورنہ آئندہ آنے والی نسلیں تمہارے ساتھ مجھے بھی برائی سے یاد کرتیں۔ دیکھو دنیا خاموش رہ کر نہیں، تم سے اولاد ہوئی اور وہ کیا تھی، جنگ، طوائف الملوکی، خونریزی، بغاوت اور قانون شکنی، افسوس میری سی سالہ محنت برباد ہوگئی، میرے بہادر نائٹ جدا ہو گئے۔ اور شیرازہ مملکت بکھر گیا۔ سر لانسیلاٹ جو میری سلطنت کا فخر اور گول میز کا زیور تھا تمہاری وجہ سے بھاگ گیا اور میرے خلاف لوگوں کو بھڑکانا شروع کیا۔ چنانچہ میں اس کی سرکوبی کے واسطے فرانس گیا اور آج ہی واپس آیا ہوں۔

آرتھر خاموش ہوگیا، گوئینیور شرم سے زمین میں گڑی جاتی تھی۔ اس نے خیال کیا کہ معافی مانگ لے مگر پھر یہ سوچکر کہ غصہ میں انکار نہ کر دے خاموش رہی۔ آرتھر نے پھر کہنا شروع کیا۔ "مگر لانسیلاٹ نے میرے خلاف اسلحہ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ آہ اب وقت گزر چکا تھا اور میرے اکثر سورما مارے جا چکے تھے۔ اس لئے میں واپس چلا آیا اور اس بقیہ فوج سے ماڈریڈ پر حملہ کرنے جا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہاں کی زمین میرے خون کی پیاسی ہے وہاں کا آسمان میری بربادی کے درپے ہے، وہاں کا رئیس باغی ہوگیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میری سلطنت کا زمانہ ختم ہوگیا، میری زندگی قریب الاختتام ہے لیکن قبل اس کے کہ میں اس دنیا سے رخصت ہوں تمہاری حفاظت کے لئے اپنے چند چیدہ نائٹ چھوڑے جاتا ہوں۔ تاکہ اگر خدانخواستہ سر ماڈریڈ میرے بعد بادشاہ ہو تو وہ تم سے تعرض نہ کر سکے۔ اس وقت یہ نائٹ تمہارا ساتھ دیں گے اور جہاں تمہارا پسینہ بہے گا اپنا لہو بہائیں گے۔"

گوئینیور دل میں کہنے لگی "افسوس میں کتنی بے حیا ہوں، میرا نازبردار شوہر میرے سامنے کھڑا ہے اور آخر وقت میں بھی اس کو میرا کتنا خیال ہے۔" اس نے پھر سوچا کہ معافی مانگ لے مگر وہی گناہگاری کا شیطان سد راہ ہوا اور وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

آرتھر نے کہا۔ "آہ! گوئینیور تم نے میری زندگی کو اپنی بے وفائی سے بے لذت بنا دیا، میں ۔ ۔ ۔ ۔ بادشاہ ہونے کے، باوجود دنیا کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے زندگی کو عزیز نہیں رکھتا اور یہ آخری وقت ہے کہ تم مجھ کو باتیں کرتا دیکھ رہی ہو، افسوس میری محنت بیکار گئی، میرے وہ نائٹ جن پر زمانہ فخر کرتا تھا اور جن کی یک جہتی مشہور تھی ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے اور کیوں؟ صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے میرے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ انہوں نے امراء کی بیگمات سے تعلق پیدا

گیا جس کی پہلی مثال، اے گوئینیور، تم اور لانسیلاٹ تھے، پھر سر ٹرسٹرم اور آئی سولٹ نے تمہاری تقلید کی اور اس کے بعد تو سب ایک ہی رنگ میں نظر آنے لگے۔

گوئینیور نے پھر قصور معاف کرانے کا خیال کیا مگر اس کی شرم اور آرتھر کی خشمگین آنکھیں، جو تاریکی میں چمک رہی تھیں مانع آئیں اور اس دفعہ بھی اس کے منہ سے کوئی کلمہ نہ نکلا۔

آرتھر نے اپنے کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اب مجھے خود سلطنت کی خواہش نہیں بلکہ زندگی بھی عزیز نہیں، نہیں عزیز رکھکر مجھے کیا پھل ملا۔ یہی کہ میری بیوی مجھ سے بے وفائی کر کے چلی گئی۔ اور میرے بھتیجے نے میرے خلاف بغاوت کر دی۔ گوئینیور تم نے میرے ننگ و ناموس پر بٹا لگایا مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا شوہر بھی ایسا کمینہ ہے۔ اس کے دل میں تمہاری محبت بدستور ہے اور آخر وقت تک رہیگی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ نہیں کر سکتا کہ تمہیں اپنی عزت پر مقدم رکھے۔ گوئینیور، میری گوئینیور، مگر اب تم میری کہاں! آہ ایک وقت مجھ کو اس بات کا فخر تھا کہ میں تمہارا شوہر ہوں ——"

ملکہ حالت بے اختیاری میں ایک قدم آگے بڑھی اور اپنے ہاتھ اس کے پاؤں میں حائل کر دیئے۔ لیکن لبوں پر اب بھی مہر خاموشی لگی تھی۔ اتنے میں دور سے بگل کی آواز آئی اور آرتھر کا گھوڑا ایک خاص وضع سے ہنہنایا گویا اپنے آقا کو خبردار کر رہا تھا کہ دشمن قریب آگیا ہے۔ لیکن بادشاہ نے کچھ خیال نہ کیا اور کہا۔ "گوئینیور، تم خیال کرتی ہوگی کہ میں تمہیں طعن و تشنیع کرنے آیا ہوں مگر نہیں میرا دل، جو کبھی ان سنہری زلفوں کا شیدا تھا اس کا شاہد ہے کہ میں اس غرض سے یہاں نہیں آیا بلکہ یہ کہنے آیا ہوں کہ جو کچھ ہو گیا اس پر افسوس کرنا فضول ہے۔ گناہ نامۂ اعمال میں لکھا جا چکا اور اب دنیا کی کوئی طاقت اس کو مٹا نہیں سکتی۔ میں سچے دل سے تمکو معاف کرتا ہوں (کیونکہ) موت سے قبل انسان اپنے اعزا سے رخصت ہوتا ہے لہذا میں بھی تم سے ملنے کے واسطے چلا آیا۔ گوئینیور، ملکہ گوئینیور، تم میری محبت اور اپنے گناہ کا موازنہ کرو۔ اور میری نصیحت پر کاربند ہوکر تا حین حیات خدا کی عبادت میں مشغول رہو تا کہ قیامت کے دن جب نامہ اعمال سنائے جا رہے ہوں تم بجائے لانسیلاٹ کے میرے پہلو میں آ کھڑی ہو اور کہو کہ میرا اصلی شوہر یہ ہے۔ گوئینیور، صدائے مرگ آ رہی ہے اور میں میدان جنگ میں طلب کیا جا رہا ہوں جہاں میں ماڈریڈ کو قتل کرونگا اور پھر خود بھی اس دنیا سے چلا جاؤنگا۔ تمہیں لڑائی کے حالات معلوم ہو جائیں گے۔ البتہ میں یہاں کبھی نہ آؤنگا اور تم کبھی مجھے نہ دیکھ سکوگی۔ خدا حافظ"

یہ کہہ کر آرتھر بلا انتظار جواب باہر نکل گیا اور گوئینیور بدستور اپنے خیالات میں مستغرق رہی، تھوڑی دیر کے بعد اس کو خیال آیا کہ لاؤ دور سے اس کی صورت ہی دیکھ لوں اور اس خیال سے باہر نکل آئی۔ آرتھر گھوڑے پر بیٹھا سینٹ میری سے باتیں کر رہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں غائب ہو گیا۔ لیکن چونکہ اس طرف اس کی پشت تھی لہذا وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔

اب گوئینیور کو ہوش آیا اور اندازہ ہوا کہ اس سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہوا ہے اور اس کا کیا نتیجہ نکل رہا ہے۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ آرتھر میدانِ جنگ کو جا چکا تھا اور ملکہ نے معافی حاصل کرنے کی زریں موقع کو ہاتھ سے کھو دیا تھا۔

ملکہ کی وہ محبت جو اس وقت تک دل کے گوشہ میں نہاں تھی عود کر آئی اور وہ یہ کہتے ہوئی دوڑی "آرتھر، پیارے آرتھر، تم کہاں ہو۔ آؤ اور اپنی گوئینیور کو تسلی دو"

مگر آرتھر جا چکا تھا اور رات کا عالمگیر سکوت ہر طرف بھیانک اشکال پیش کر رہا تھا۔ آخر اس نے کہا "افسوس اب وہ کہاں۔ مگر انہوں نے مجھ کو معاف کر دیا اور میں، افسوس، میں اسی طرح بیٹھی رہی، میری زبان پر مہر تھی اور لب بند مگر میرا دل اس سے محبت کرتا ہے۔ تو اب میں کیا کروں، خودکشی کر لوں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے گناہ کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔ یہ دھبا کسی طرح نہیں دھویا جا سکتا۔ پھر کیا کروں۔ (سوچکر) اچھا مجھے اپنے پیارے شوہر کی نصیحت پر کاربند ہونا چاہئے کیونکہ صرف عبادت ہی میرے گناہ کو دھو سکتی ہے اور عبادت ہی کے ذریعہ سے میں اپنے شوہر کی روح تک رسائی پا سکتی ہوں"

اتنا کہکر وہ دوزانو جھک گئی اور خدا سے دعا مانگنے لگی۔ رات چند لموں کی طرح گذر گئی اور ابھی اس نے دعا سے فراغت بھی نہ پائی تھی کہ دروازہ کھلا، اور خانقاہ کی تمام ننیں کمرے میں داخل ہو گئیں۔ بیچاری ملکہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی لیکن مقدس کنواریوں نے کہا۔ "مقدس خاتون، اس وقت سینٹ میری کسی خاص جذبہ سے متاثر ہو کر جنت الفردوس کو سدھار گئیں اور لاٹ پادری نے ان کی جگہ آپ کو مقرر کیا ہے"

پہلے تو گوئینیور کو یقین نہ آیا گویا جس نے اس عہدہ کو بطیب خاطر منظور ... خاموش ہو ... نے متواتر یہی بات کہی تو اس ... خانقاہ کے بڑے کمرے میں

نظم مسلسل

مسدس

عرضداشت درباب رہائی اسیر بے گناہ بجناب جلالتمآب مہاراجہ سورج ملنسی جو ایک زمانہ ہوا لکھی گئی تھی

مشہور ادبی نقاد پروفیسر بیخود موہانی ایم۔ اے کی مسدس کی صورت میں ایک مسلسل نظم شائع کیجاتی ہے۔ اسے پڑھ کر حضرت بیخود کے شاداب تخیل کی حیرت کاریوں کا اندازہ ہوسکے گا۔ (ایڈیٹر)

اے شہِ خورشید منظر اے شہِ گردوں سریر
سرکشوں کے سرشکن بے دست و پا کے دستگیر
ہم سے مجبوروں کے والی تاج داروں کے امیر
تو زمانے کے لئے ہے سایۂ ربِ قدیر
کچھ سمجھ کر تجھ کو ایسی قدرتیں دیدی گئیں
ہاتھ میں تیرے ہماری قسمتیں دیدی گئیں

بھول سکتا ہے کہیں تیرے بزرگوں کا چلن
ساری سج دھج بھیم کی ارجن کا سارا بانکپن
بزم یاراں میں سرو ہی جن کی۔ چوکھی کی دولہن
دشمنوں کا خون تھا جس کا عروسی پیرہن
بیگناہ کے خون سے رنگیں نہ ہو ڈرتا یہی
اُن کی تلواروں کا سب سے بڑھ کے جوہر تھا یہی

تو اُنہیں کی آنکھ کا تارا۔ اُنہیں کا نونہال
تیرے ہوتے بے گناہوں پر یہ سختی۔ یہ جلال
بوئے گل سے ہو رہا ہے مست ہر دل ہر خیال
آہ یہ جوشِ بہار اور یہ اسیری کا ملال
کیا کہوں میرا جو دوہرے دشمنوں میں حال ہے
کشتیٔ طوفاں زدہ ہے یا دلِ پامال ہے

یہ تو مانا۔ ہے خیال انساں کا وہ جادو اثر
گھر کو جو زنداں بنا سکتا ہے اور زنداں کو گھر
کیوں نہ تڑپوں جب تصوّر میں رہے پیشِ نظر
اُترا اُترا چہرہ بچوں کا اور اُن کی چشمِ تر

جو تڑپ کر نالۂ جانکاہ کر سکتی نہیں
اُٹھ رہی ہے ہوک دل میں آہ کر سکتی نہیں

میرے بچے۔ میری دُنیا میری امیدوں کی کشت — جن کا چھُٹنا ہے جہنم جن کا ملنا ہے بہشت
چین پیشانی میں جب یہ بے نیازِ خوب و زشت — بڑھتے ہیں پڑھتے ہوئے میری اور اپنی سرنوشت

شوق میں بڑھتا ہوں اور دُکھ سہکے رہجاتا ہوں میں
بیخودی میں پیار سے کچھ کہکے رہجاتا ہوں میں

دل کی اِن بیتابیوں میں بھی اگر نیند آ گئی — ڈبڈبائی آنکھ اِن کی اور دل تڑپا گئی ؛ ؛
ایسے جینے سے تو میری روح اب گھبرا گئی — میرے ہوتے اِن کے چہروں پر یتیمی چھا گئی

یہ برنگِ گل یہی اک پیرہن پہنے رہیں ؟
میرے بچے جیتے جی کب تک کفن پہنے رہیں ؟

رحم کر شاید ابھی باقی ہو کچھ جائے رفو ؛ — آچلی ہے ہر نفس میں خونِ زخم دل کی بو
آنکھ میں بیخوابیوں کا رنگ ہے بے گفتگو — پہلے تھی ہلکی سی سُرخی اب برستا ہے لہو

لب تک آتی ہیں اب آہیں خون میں ڈوبی ہوئی
اب نکلتی ہیں نگاہیں خون میں ڈوبی ہوئی

حیف زندانِ رجا میں مجھ کو رہنا ہی پڑا ؛ — یعنی اِن مجبوریوں کا جبر سہنا ہی پڑا ؛
آبلوں کو دل کے آخر پھوٹ بہنا ہی پڑا — میں نہ کہنا چاہتا تھا آہ کہنا ہی پڑا ؛

کیوں ستم توڑا گیا یہ مجھ پہ اور کن کے لیئے
جانِ دیگر کی تھی خدمت کیا اسی دن کیلئے

یاں کی اُٹھتی کونپلوں میں ہے مرا سب رنگ و بو — اب محبت ہے سرشت اِن کی وفا ہے اِن کی خو
یہ گرائیں گے پسینے پر نہ رے اپنا لہو — اپنے دل سے پوچھ ہے کچھ اس میں جائے گفتگو

اہلِ دل اِس طرح تعزیرِ وفا دیتے نہیں
جانثارِ دل کو نظر سے یوں گرا دیتے نہیں

اے سراپا اختیار اب مَیں ہوں بالکل پا بگل — رحم کر اب بیگناہی سے نہ کر مجھ کو خجل
وقت کی رفتار سے ہو ہو کے دل میں منفعل — بیگناہی سے کہیں توبہ کر لیں اہلِ دل
امن کی دنیا کہیں دنیائے آفت ہو نہ جائے
دیکھتے ہی دیکھتے برپا قیامت ہو نہ جائے

ہے گواہِ بیگناہی میرے دل کا ہر خیال — شاہدِ عادل ہے اس پر علمِ ربِّ ذوالجلال
اب بھی رد ہو جائیگا میری رہائی کا سوال — ہو چکی میرے حریفوں کی شہادت پائمال
شاد ہیں جشنِ طرب میں سب مجھے بھی شاد کر
ان کی آزادی کا صدقہ اب مجھے آزاد کر

رحم کر مجھ پر مرے دستِ دعا کا واسطہ — رحم کر مجھ پر دلِ حسرت نوا کا واسطہ
اہلِ دل کا واسطہ اہلِ وفا کا واسطہ — تجھ کو اپنا واسطہ اپنے خدا کا واسطہ
رحم کر جانیں برستی ہیں کہیں افلاک سے
رحم کر پیدا نہیں ہوتے کبھی دل خاک سے

عرش تک اب ہمرہِ دستِ دعا جاتا ہوں مَیں — اب تو مژدہ پر رہائی کے مٹا جاتا ہوں مَیں
رہروؤں کے پاؤں کی آہٹ جو پا جاتا ہوں مَیں — شوق میں بڑھ کر درِ زنداں تک آ جاتا ہوں مَیں
رحم کر شوکت تری حدِ تمنا تک رہے
یہ شہنشاہی رہے اور رہتی دنیا تک رہے

بیخودؔ موہانی

انگلستان کا ایک پریس

گول میز کانفرنس کے متعلق ایک مسلسل مضمون ادبی دنیا میں شائع ہوتا رہا ہے۔ سید انعام اللہ شاہ صاحب ایڈیٹر اخبار دور جدید نے مکرمی چودھری ظفراللہ خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا نمائندہ کانفرنس کے روزنامچہ لندن سے کچھ اقتباسات لیکر وہ مضمون ترتیب دیا تھا۔ اس مضمون کا باقی حصہ شاہ صاحب نے اپنے اخبار دور جدید میں شائع کر دیا اور اس طرح ادبی دنیا ایک مفید مضمون سے محروم ہوگیا۔ چودھری صاحب قبلہ کے روزنامچے میں کانفرنس اور اس کے نمائندوں کی کارگذاریوں کی تفاصیل تاریخوار درج ہیں۔ ذیل میں لندن کے ایک پریس کی سیر کا حال درج کیا جاتا ہے۔ اس سے یورپ کی صحافتی و طباعتی ترقیوں کا کچھ اندازہ ہوسکیگا۔ تاجور

ہم ۱۳ دسمبر کو جریدہ "نیوز آف دی ورلڈ" کا پریس دیکھنے کے لئے نووری سٹریٹ گئے۔ مسز مورلسی، مس جادرس لنیم اور بڑے پوری کو ساتھ لیکر موٹر میں گئیں، اور ہم لوگ ریل سے گئے۔ مسٹر ٹامکس نے اس کا بخوبی انتظام کر دیا تھا کہ ہمیں پریس اچھی طرح سے دکھایا جائے۔ چنانچہ جوں ہی ہم پہنچے مسٹر کرافٹر جو پریس کے ایک حصہ کے مینجر معلوم ہوتے تھے آموجود ہوئے اور ہمیں اپنے ساتھ لے چلے۔ سب سے پہلے ہم ایڈیٹوریل کمرہ میں گئے۔ یہاں تین، چار مشینیں لگی ہوئی تھیں جن پر مختلف خبر رساں ایجنسیوں کی طرف سے خبریں خود بخود آکر ٹائپ ہوتی جاتی تھیں۔ یہ ٹائپ کئے کاغذ کے ورق کمرے کے ایک کونے میں تار کے بڑے بڑے کلپوں (Clips) میں لگا دئے جاتے تھے۔ یہ کلپ ایک نظام کے ماتحت خود بخود تاروں پر چلتے ہوئے مختلف ایڈیٹروں کی میزوں سے گذرتے ہیں۔ اور جو کاغذ جس ایڈیٹر سے متعلق ہوتا ہے وہ اُسے کلپ میں سے نکال لیتا ہے اور اس میں حسب ضرورت ترمیم و اصلاح کر کے کسی بعد میں آنے والے کلپ میں چپکا دیتا ہے۔ یہ کلپ کاغذ کے پرزوں کو ایڈیٹروں کی میزوں سے دوسرے کمرے میں لیجا کر ایک میز پر رکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس میز پر جو آدمی کام کرتا ہے وہ ان کو کمپوزیٹروں کے درمیان تقسیم کر دیتا ہے۔

کمپوزیٹری کا کام اس پریس میں لینو ٹائپ (Linotype) مشینوں پر کیا جاتا ہے۔ اس مشین کا اصول یہ ہے کہ کمپوزیٹر ایک کیبورڈ پر جو ٹائپ رائٹر کے کیبورڈ سے مشابہت رکھتا ہے حروف کو دباتا جاتا ہے اور پیتل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جن کے اوپر کے سرے پر ہر حرف کے مطابق علیحدہ شکل بنی رہتی ہے۔ ایک لائن میں کمپوز ہوتے جاتے ہیں۔ جب ایک سطر مکمل ہو جاتی ہے تو یہ سطر کی سطر مشین کے ایک اور حصہ میں پہنچ جاتی ہے، جہاں سیسہ، جست اور سرمہ کا دھلا ہوا مرکب مشین کے ایک اور حصہ سے اس سطر پر آگرتا ہے اور فوراً منجمد ہوکر ایک مکمل سطر بن جاتا ہے۔ اس سطر کے حروف معکوس ہوتے ہیں۔ پیتل کے ٹکڑے پھر اُسی حصہ مشین میں چلے جاتے ہیں جہاں اُن کا ذخیرہ جمع رہتا ہے۔ ہر ٹکڑا اپنے اصل خانہ میں پہنچ جاتا ہے اور پھر کسی سطر مابعد کے کمپوز کرنے کے کام آتا ہے۔

ایک آدمی اس طریق سے اوسطاً سات سطریں ایک منٹ میں کمپوز کر لیتا ہے۔ اِن سطور کی پلیٹیں بھی ساتھ ہی ساتھ تیار ہوتی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک کمپوزیٹر نے ہماری موجودگی میں علاوہ چند سطور کمپوز کرنے کے بعد میرا نام دریافت کیا اور جیسے جیسے میں حروف بتاتا گیا وہ کمپوز کرتا گیا اور جونہی میں نے آخری حرف اسے بتایا، اُس نے تیار شدہ پلیٹ میرے حوالے کر دی جو میں یادگار کے طور پر اپنے ساتھ لے آیا۔

اس پریس میں دو درجن لینو ٹائپ مشینیں ہیں۔ اس طرح سطر سطر کی پلیٹ تیار کی جاتی ہے۔ لیکن اخبار کی چھپائی اس پلیٹ سے نہیں ہوتی۔ اس پلیٹ سے ایک مولڈ (سانچہ) تیار کیا جاتا ہے جو ردی کاغذ اور جاذب (Blotting paper) سے بنا ہوتا ہے۔ نمی کی حالت میں یہ مولڈ پلیٹ پر رکھ دیا جاتا ہے۔ پھر اسے مشین میں دبایا اور خشک کیا جاتا ہے۔ اس پلیٹ کے تمام حروف اور تصاویر گہرے چھپ جاتے ہیں۔ اس سانچہ سے پھر وہ آخری پلیٹ تیار کی جاتی ہے جس سے اخبار چھپتا ہے۔ یہ پلیٹ ایک ایسی بھٹی میں تیار کی جاتی ہے جس میں ۶۵۰ درجہ کی حرارت ہوتی ہے۔ مولڈ کو ایک گول سلنڈر کے گرد رکھ دیا جاتا ہے۔ اور ان دونوں کے خلا میں سیسہ جست اور سرمہ کا ایک پگھلا ہوا مرکب ڈال دیا جاتا ہے جس سے آخری پلیٹ

تیار ہو جاتی ہے۔ اور اس مشین کے اندر اسقدر تیز حرارت کے باوجود مولڈ کو کسی قسم کی آنچ نہیں آتی جب پلیٹ اس مشین سے نکالی جاتی ہے تو وہ بہت گرم ہوتی ہے۔ اس کے بعد اسے ایک ایسے خراد پر چڑھایا جاتا ہے جو اس کی موٹائی کو ایک یکساں معیار پر لے آتا ہے۔ پھر اسے ٹھنڈے پانی میں سے نکال کر ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ اب یہ چھپائی کی مشین پر چڑھانے کے قابل ہو جاتی ہے۔

چھپائی کی مشینوں والا کمرہ بہت اعجوبہ زا تھا مشینوں کی چوڑائی کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ کاغذ جو اس اخبار کی چھپائی کے لئے استعمال ہوتا ہے وہ ۶۹،۱ انچ چوڑا ہے اور ہر گھنٹہ میں قریباً پانچ میل لمبا کاغذ چھپ جاتا ہے جب مشین پورے زور سے چلتی ہے تو اس کاغذ کی دونوں طرف چھپائی سترہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوتی ہے۔ اور جب یہ کاغذ پوری رفتار کے ساتھ ایک طرف پوری رفتار سے مشین میں داخل ہوتا ہے اور دوسری طرف سے دونوں رُخ پر چھپا ہوا کاغذ بڑی تیزی کے ساتھ چھت کی طرف چڑھتا چلا جاتا ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔ چھت کے قریب پہنچ کر یہ کاغذ ایک اور حصہ مشین سے گزرتا ہے۔ پھر کاغذ اس حصے سے دوبارہ برآمد نہیں ہوتا بلکہ تہ شدہ تیار اخبار ہی نکلتا ہے۔ ایک منٹ میں ساٹھ اخبار برآمد ہوتے ہیں۔ ہر چھبیس [۲۶] اخباروں کے بعد ایک اخبار ذرا ہٹ کر گزرتا ہے اس لئے جو آدمی اس جگہ اخبار جمع کرتا ہے اسے گننے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ گویا مشین ہی گنتی کا کام بھی انجام دیتی ہے۔

یہ شخص ۲۵-۲۵ اخباروں کے بنڈل اٹھا کر ایک جگہ جمع کرتا جاتا ہے پھر سو سو پرچے چھت کی طرف چڑھنے جاتے ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر اخبار ایسی میزوں پر پہنچتے ہیں جن کا درمیانی حصہ متحرک ہوتا ہے۔ پیکر بنڈل باندھنے جاتے ہیں۔ پھر یہ بنڈل کھڑکی کی طرف حرکت کرتے چلے جاتے ہیں۔ کھڑکی کے باہر موٹر چھکڑا کھڑا رہتا ہے۔ بنڈل اس میں گرتے جاتے ہیں اور ایک آدمی اُن کو قرینے سے ترتیب دیتا جاتا ہے۔ جونہی یہ چھکڑا بھر جاتا ہے وہ فوراً ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیتا ہے اور دوسرا چھکڑا اُس کی جگہ آکھڑا ہوتا ہے۔

یہ پریس ہفتہ بھر میں صرف ایک رات چلایا جاتا ہے۔ جس میں چالیس لاکھ اخبار چھاپے جاتے ہیں۔ بنڈلوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار ہوتی ہے۔ ہر ایک بنڈل کی لمبائی پانچ میل ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک رات میں ساڑھے سات ہزار میل لمبا کاغذ چھپ کر صبح تک اپنے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ ایک رات میں دو سو من سیاہی استعمال ہوتی ہے۔ ایک مشین گھنٹہ بھر میں ۷۲ ہزار پرچہ چھاپتی ہے۔ رخصت ہونے سے قبل مسٹر کرافرڈ نے ہماری پارٹی میں سے ہر ایک کو اخبار کا ایک ایک تازہ چھپا ہوا پرچہ بطور یادگار دیا۔ گویا ہمیں یہ اخبار اشاعت سے ایک رات پہلے مل گیا۔ مسٹر کرافرڈ نے ہمارے سامنے ہر چیز کی تفصیل نہایت عمدگی سے بیان کی۔

(از روزنامچہ چودھری ظفر اللہ خاں صاحب
بار ایٹ لا نمائندہ کانفرنس)

عزمِ آہنیں

سُنا ہے مستقل عزمی بدل دیتی ہے قسمت کو
ہزیمت کر نہیں سکتی ہراساں جوشِ ہمت کو

جو استقلال سے ہر کام کا آغاز کرتے ہیں
وہی اپنی تمناؤں کو سرافرازنہ کرتے ہیں!

جوانمردوں کی خوش اسلوب اور مضبوط تدبیریں
وہ تدبیریں قدم جن کے لیا کرتی ہیں تقدیریں

مصائب پر حریفانہ روش سے مسکراتی ہیں
قیامت خانۂ آلام کا در کھٹکھٹاتی ہیں!

انہیں روکیں گے کیا آلام ہیبتناک کے پردے
پڑے ہوں جن کے دل پر جرأتِ بیباک کے پردے

شکستوں سے کبھی ذوقِ عمل گھائل نہیں ہوتا
جوانمردوں کا دل عورت کا نازک دل نہیں ہوتا

کبھی خفت کا منہ دیکھا نہیں کلفت پسندوں نے
کیا تبدیل تقدیروں کو تدبیروں کے بندوں نے

عدم

غلط فہمی

ایک ایکٹ کا ڈراما

افراد۔

کملا ۔۔۔ بیمہ کمپنی کی ایجنٹ ۔
روشن لال ۔۔۔ ایک کامیاب تاجر ۔
لجیا ۔۔۔ روشن لال کی بیوی ۔

لجیا اپنے کمرے میں بیٹھی ہے۔ کملا آتی ہے۔

کملا۔ تسلیم عرض کرتی ہوں۔
لجیا۔ خوش رہو۔ آؤ۔ کیسے آنا ہوا۔
کملا۔ میں سیٹھ صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔
لجیا۔ سیٹھ صاحب! وہ تو باہر گئے ہیں۔
کملا۔ او ہو کب تک واپس آئیں گے؟
لجیا۔ کوئی گھنٹے تک۔
کملا۔ اچھا میں پھر حاضر ہونگی۔
لجیا۔ بیٹھو تو سہی۔ گرمی میں باہر سے گھبرائی ہوئی آئی ہو۔ کچھ دیر آرام کرو۔ ہاں پانی! کیا ہوگی؟ کیا نام ہے آپ کا؟
کملا۔ مہربانی! (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) سادہ پانی کا ایک گلاس عنایت کیجئے۔ میرا نام کملا ہے
لجیا۔ اگر میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی خدمت کر سکوں۔ تو بے تکلف کہئے۔
کملا۔ نہیں! (کچھ سوچ کر) میں صرف سیٹھ صاحب سے ملنا چاہتی تھی۔
لجیا۔ ایسا کیا کام ہے۔
کملا۔ وہ صرف انہی سے متعلق ہے۔
لجیا۔ (شبہ کی نظروں سے کملا کی طرف دیکھکر) انہی سے متعلق ہے ...... خوب!
کملا۔ (اپنی کاروباری پوزیشن کا خیال کرتے ہوئے) بہت سے کام دنیا میں ایسے ہوتے ہیں!
لجیا۔ (بدظن ہوکر) ہونگے! میرا خیال ہے آپ اگر یہیں آرام کریں تو بہتر ہے۔ سیٹھ صاحب آیا چاہتے ہیں۔
کملا۔ میں اس عرصے میں ایک اور کام انجام دے لونگی سیٹھ صاحب کے آنے پر حاضر ہونگی ...... (چلی جاتی ہے۔)
لجیا۔ کچھ بڑبڑاتی ہوئی کملا کو جاتے دیکھتی ہے۔ پھر سنبھل کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور کہتی ہے:۔

یہ ہے کون موئی؟ ذرا دیدوں میں پیٹھنا دیکھو۔ کیسی دلیری سے میرے منہ پہ کہے چلی گئی۔ (منہ بنا کر) "میں صرف سیٹھ صاحب سے ملنا چاہتی تھی"

خدا غارت کرے ان پڑھی لکھی لڑکیوں کو کیسی دیدہ دلیر اور منہ پھٹ ہیں۔ ذرا آئیں آج سیٹھ صاحب۔ بہت وہ بھی فیشن پہ مرتے ہیں۔ ہیں! دیکھو تو خدا جانے کس کس کو کہاں کہاں سے لگا لاتے ہیں۔ پھر نہ لحاظ نہ شرم۔ گھر نہ ہوا مسافر خانہ ہوا۔ (سیٹھ صاحب داخل ہوتے ہیں)

روشن لال۔ کیا بڑبڑا رہی ہو۔
لجیا۔ خاک!
روشن لال۔ ہیں! دماغ تو ٹھکانے ہے؟
لجیا۔ بھلا میرا دماغ کہاں ٹھکانے ہوگا!
روشن لال۔ یہ آج تمہیں ہوا کیا؟
لجیا۔ بچا رہے آن جان۔ دل اپنا جل رہا ہے اور دماغ میرا پھٹ رہا ہے
روشن لال۔ آخر کوئی بات بھی!
لجیا۔ بس مجھے زیادہ نہ بناؤ۔
روشن لال۔ خدا خیر کرے!

لجیّا - دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے - نہ مردوں میں شرم نہ عورتوں کو لحاظ -
آخر یہ میری چھاتی پر کیوں مونگ دلی جاتی ہے - ابھی تین مہینے
نہیں گذرے کہ تم نے عہد کیا تھا - اب پھر وہی وطیرہ اختیار کرلیا -

روشن لال - (حیرت سے) شرم .... لحاظ! چھاتی پر مونگ
.... تین مہینے .... عہد .... یہ معمہ کیا ہے -

لجیّا - بس بس باتیں نہ بناؤ - ایسے ہی بیچارے بھولے - اے ذرا دیکھنا
کس سادگی سے کہہ رہے ہیں - شرم .... لحاظ .... مہینے
.... عہد اور آگے نہیں سوچتے کملا ....!

روشن لال - خدا کے لئے کچھ صاف صاف تو کہو -

لجیّا - کہوں کیا - مہربانی کرکے مجھے میرے گھر بھجوا دیجیے

روشن لال - گھر یوں جایا کرتے ہیں ؟

لجیّا - ہاں - یونہی اور ابھی!

روشن لال - پھر اتنے ہیر پھیر کی کیا ضرورت تھی - صاف کہو - کہ
میکے جانا ہے - الٰہی پناہ تیری -

لجیّا - (غصے سے جل کر) ہاں جانا ہے اور ابھی؟

روشن لال - اچھا اور یہ تم نے "کملا" کیا کہا تھا -

لجیّا - میرا دل نہ جلاؤ - مجھے میکے بھجوا دو -

روشن لال - اچھا میکے بھجوانا تو میں سمجھ گیا - لیکن یہ جل بھن کر میکے
جانا کیا معنی ؟

لجیّا - میری مرضی - میں ضرور جاؤنگی اور ابھی جاؤنگی -

(کملا آتی ہے - لجیّا غصے کے مارے اندر چلی جاتی ہے)

روشن لال - (کملا کی طرف مخاطب ہوکر) آئیے! ارشاد!

کملا - میں علیحدگی میں کچھ بات کرنا چاہتی ہوں -

(روشن لال اور کملا الگ کمرے میں چلے جاتے ہیں
لجیّا کڑھتی ہے - اور بڑبڑاتی ہے)

کملا - میں آفتاب بیمہ کمپنی کی ایجنٹ ہوں اور اس لئے آپ کے
پاس حاضر ہوئی ہوں کہ آپ سے کمپنی میں بیمہ کرانے کے لئے عرض
کروں - یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بیمہ انسانی زندگی کے لئے اور صاحب
اولاد بھائیوں کے لئے کتنی ضروری چیز ہے - نہ یہ بتانے کی
ضرورت ہے کہ آفتاب بیمہ کمپنی کسقدر کامیاب کمپنی ہے - اس کے
دس لاکھ سے زیادہ پالیسی ہولڈر ہیں - ہر ملک میں اسکی شاخیں
ہیں - آپ خدا کے فضل سے صاحب حیثیت ہیں آپ کو کم از کم
بیس ہزار کا بیمہ کرانا چاہیئے -

روشن لال - (ساری باتیں سنکر) آپ کی تکلیف کا شکریہ، میں تو بیمہ
کرا چکا ہوں - پریم بیمہ کمپنی میں اپنا اور اپنی بیوی دونوں کا لیکن
میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ تمہیں یہ بات کہنے کے لئے تخلیہ
کی ضرورت کیوں ہوئی -

کملا - میں اس کمپنی میں نئی نئی ملازم ہوں - مجھے منیجر نے علاوہ اور
ہدایات کے سختی سے اس ہدایت پر عمل کرنے کو کہا ہے کہ میں
ہر شخص سے اپنے کاروبار کے متعلق علیحدگی میں بات کروں -

روشن لال - (ہنس کر) تو کیا بیوی بچوں سے علیحدہ کرنے کی ضرورت
ہے - منیجر صاحب کی ہدایت کا مطلب تو یہ ہے کہ کاروباری آدمیوں
سے اس قسم کی بات علیحدگی میں کی جائے -

کملا - اچھا تو آپ کا ارادہ ....

روشن لال - فی الحال تو نہیں -

(کملا کمرے سے نکل جاتی ہے لجیّا آتی ہے -)

لجیّا - کیوں اب بھی یہ بات معمہ رہی - ذرا اب تو آنکھیں اوپر کرو -

روشن لال - آنکھیں اوپر کرو کیا مطلب ؟

لجیّا - کون تھی یہ ؟ اب بھی کملا کو سمجھے یا نہیں ؟

روشن لال - میں اب بھی نہیں سمجھا تم کیا کہہ رہی ہو - یہ تو بیمہ کمپنی کی
ایجنٹ تھی - نئی ملازم ہے - منیجر نے کہیں کہدیا کہ کاروباری آدمیوں
سے ہر ایک کے سامنے بات نہ کرنا وہ اتنی محتاط ہے کہ بیوی بچوں
سے بھی الگ بات کرتی ہے -

لجیّا - بیمہ کمپنی کے ایجنٹ تو ہمارے ہاں کئی مرتبہ آئے - پھر لگے مجھے
بنانے یا الٰہی مردوں کے فریب کی بھی کوئی انتہا ہے - یہ سفید
جھوٹ -

روشن لال - خدایا عورتوں کی غلط فہمی کی بھی کوئی حد ہے
یہ الزام!

(دونوں ایک دوسرے کے منہ
کو دیکھتے ہیں -)

وقار (انبالوی)

ہنگامۂ خیال

اختر! تری خموشی گو ہے شکیب ساماں
لیکن تری نظر ہے غمازِ سوزِ پنہاں

چھائی ہوئی ہیں دل پر کالی گھٹائیں غم کی
سینہ بنا ہوا ہے گہوارۂ تجلی؛

کچھ جوش زن ہیں نغمے، کچھ مضطرب ہیں نالے
اک بیقرار دنیا پنہاں ہے دل میں تیرے

حدِّ جنوں کو پہنچا ذوقِ نیاز تیرا!
لیکن کبھی زباں پر اک حرف تک نہ آیا

ہے مختصر فسانہ شاعر کی زندگی کا
اوروں کے غم میں گھلنا، وقفِ نیاز رہنا!

لیکن یہ تیرا سودا اب ضبط کا ہے شاکی
لازم ہے اب رہائی زندانیٔ بلا کی؛

لیلائے آرزو ہے خواہانِ بے نقابی
اس تنگ محملی سے بہتر ہے بے حجابی

ضبطِ فغاں سے دل میں اک آگ سی لگی ہے
اس حفظِ غم کو تو نے سمجھا ہے زندگی ہے؟

گو جل چکا ہے سینہ، ساکت ہیں تیرے نالے
خوددار کیوں ہے اتنا در پردہ جلنے والے

کیوں پردۂ صدف میں اک گوہرِ تپاں ہے؟
کیوں منہ نہیں دکھاتا؟ کیوں غافل زباں ہے؟

وہ نالہ ہی نہیں جو لب سے نہ آشنا ہو!
وہ بھی کوئی شرر ہے جو سنگ میں چھپا ہو!

غافل! ربابِ دل کو مضراب آشنا کر!
خاموش شورشوں کو ہنگامۂ نوا کر!

سینے کے داغ کو اب لیلائے بزم کر دے
شمعِ غیورِ دل کو رسوائے بزم کر دے

کب تک ہو سوزِ دل کی دل پر ہی شعلہ باری
ہے لطف جب کہ محفل ہو جائے گرم ساری

جلتا ہے آپ ہی کیا، کل بزم کو جلا دے
تاریکیٔ افق تک اس آگ کو بڑھا دے

ہو تیرا داغ روشن مثلِ چراغِ ساغر
خورشید بن کے چمکے مدت کے آسماں پر

ہاں آہِ نارسا بھی تیری جنوں چکاں ہو!
عشق و وفا کی مے میں ڈوبی ہوئی فغاں ہو

اغیار کو جلا دے تیرے جگر کی حدت
تجھ سے رواج پائے یہ آتشیں محبت

اختر انصاری دہلوی

اُس کے دوست کی بیوی

(عہدِ حاضر کے مشہور روسی افسانہ نگار بورلیس لیفان کا تازہ ترین شاہکار)

حال میں ایک موقر امریکن رسالہ کے مدیر نے سیاحت روس کے دوران میں اُن ممتاز افسانہ نگاروں کے شاہکار حاصل کئے ہیں جو روسی علم ادب اور فنِ افسانہ نگاری میں طرزِ نو کے موجد ہیں۔ ان کا اسلوبِ بیان اور تخیّل یاس وحسرت اور رنج والم کے ان تاریک عناصر سے یکسر مبرا ہے۔ جو انقلاب سے پہلے روسی ادب کی نمایاں خصوصیت تھے۔ روس کا جدید ادبی انقلاب فی الحقیقت اس کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب کا آئینہ دار ہے۔ اس لئے روس کے مجلسی حالات معلوم کرنے کا ایک نہایت دلچسپ طریق یہ ہے۔ کہ ان افسانوں کا مطالعہ کیا جائے۔ جن کی پہلی قسط "ماسکو کا راگی" ناظرین ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

بورلیس لیفان کا یہ افسانہ روس کے انقلاب انگیز ازدواجی تعلقات کی ایک جاذبِ توجہ تصویر ہے۔ مدیر موصوف کے الفاظ میں یہ افسانہ جس واقعہ کی بنا پر لکھا گیا ہے۔ وہ آج روس کے سوا دنیا کے کسی اور ملک میں رونما نہیں ہو سکتا۔ افسانہ کا ہیرو پالوف فلسفۂ مارکس کا پیرو ہے جو دنیا کو صرف اقتصادی عینک سے دیکھتا ہے۔ اس کی اپنی بیوی اس کی نگاہ میں اقتصادیاتِ روس کا ایک معمولی ورق ہے۔ اس لئے وہ اپنی بیوی کی طرف سے اس کے ایک پرانے ہم مکتب کے نام خط لکھنے میں کوئی عار نہیں سمجھتا۔ اس ... سے حالات ایسی پیچیدہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جس پر خاوند کو قابو نہیں رہتا۔ افسانہ کا انجام ازبس سبق آموز ہے۔ (ادارہ)

میری پیاری صوفیہ!

یہ تین الفاظ لکھنے سے پیشتر میں عجیب خیالات میں مستغرق رہا۔ جن کا اظہار میں کسی دوسرے طریق پر نہیں کر سکتا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے کل پورا ہفتہ ہو جائیگا۔ یہاں آتے ہی مسافرخانہ میں اُترا جو شہر سے ۱۴ میل میرے کارخانہ میں واقع ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا علاقہ کسی عظیم زلزلہ کے زیر اثر درہم برہم ہے۔ ہر جگہ بڑے بڑے گڑھے ریت کے ٹیلے، مٹی کے ڈھیر اور اینٹوں اور لوہے کے انبار ہیں۔ تعمیر زور شور سے جاری ہے۔ برقی ہتھوڑوں کی ضربوں، انجنوں کی سیٹیوں اور آہنی آلات کی جھنکار سے فضا گونج رہی ہے۔ ایک فیکٹری بن رہی ہے۔ یہاں پہلے ایک ویرانہ تھا۔ اب وہ ورکشاپیں تیار ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ایک نصف میل لمبی ہے۔ میں تنہا رہتا ہوں۔ باقی انجنیئر شہر میں رہتے ہیں۔ صبح سویرے کام پر آتا ہوں اور دن ڈھلے گھر واپس آجاتا ہوں بمشکل سے ساڑھے تین گھنٹے کی فرصت ملتی ہے اور اس دوران میں چائے اور سگرٹ پیتا ہوں اور اپنے کمرہ میں ٹہلتا ہوں۔

میں نے آتے ہی اپنی بیوی کو لکھ دیا تھا کہ اب میں تمہارے پاس نہیں آؤنگا۔ بات یہ ہے کہ ہم دونو میں کوئی چیز قدرِ مشترک نہ تھی ہماری طبائع کا رجحان جداگانہ تھا۔ ہمارے لئے واحد وسیلۂ اتحاد ایک لڑکا تھا جو مر گیا۔ اب تو قع اُٹھ گئی ہے۔ اور سینہ ہزاروں آرزوؤں کا مدفن ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ میں اپنے کام میں مگن رہتا ہوں۔

تمہاری تصویر جس میں تم نے سکول کی وردی پہن رکھی ہے اور تمہاری دراز سنہری لٹیں بائیں شانہ پر معلق ہیں ابھی تک میرے پاس ہے تمہیں یاد ہوگا میں نے یہ تصویر تمہارے بھائی سے ایک چاقو اور غزلوں کی کتاب کے عوض حاصل کی تھی۔ اس وقت یہ میری میز پر پڑی ہے۔ اور جب میں سگرٹ کا پیکٹ اٹھاتا ہوں اسے دیکھ لیتا ہوں۔ اس سے دل میں ایک حرارت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ میری صوفیہ۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ مجھے تمہارا پتہ مل گیا۔ میں یہاں آتے ہوئے کازلف سٹیشن پر گاڑی بدلنے کی غرض سے اُترا کہ میرا پرانا ہم سبق رالف جو اپنی لانبی ٹانگوں موٹی عینک اور اپنی لکنت کے باعث نشانۂ تضحیک بنا رہتا تھا مل گیا۔ وہ اب ڈاکٹر ہے۔ اُس نے دورانِ گفتگو میں بتایا کہ تم ماسکو میں رہتی ہو اور تم نے شادی کر لی ہے۔ تمہیں خط لکھنے کو جی تو نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ جب میں محاذِ جنگ پر تھا۔ تم نے میرے ایک خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن مجبور ہوں، تمہیں خواب میں دیکھتا ہوں، پیاری صوفیہ تمہارا خط میرے لئے انتہائی مسرت کا موجب ہوگا

تمہارا صادق ۔ گرین

خط سننے کے بعد پالوَف نے چائے پینے کے دوران میں اپنی بیوی سے پوچھا۔ "کیا تم اس کا جواب دوگی؟"

"نہیں" اس کی بیوی نے کہا "میں خط و کتابت سے گھبراتی ہوں۔ یہ عہدِ قدیم کے تذکرے ہیں اور اب مجھے گورین سے کوئی دلچسپی نہیں"۔

پروفیسر پالوف جانتا تھا کہ میری بیوی کی انشا صرف و نحو کے ہر مسلمہ قاعدہ کے لئے ایک مستقل چیلنج ہے۔ اِس لئے اس نے کہا:-

"تم ضرور جواب لکھو میں تمہاری غلطیاں درست کر دونگا۔ اور یہ شخص ہے کون؟"

صوفیہ نے جواب دیا کہ میرے بھائی کا ہم جماعت تھا۔ ہم تینوں ایک ہی مدرسہ میں پڑھا کرتے تھے۔ اسے مجھ سے محبت تھی، ایک مرتبہ وہ میری خاطر پانی کے دس گلاس پی گیا۔

"کیا لغو حرکت کی اُس نے" پروفیسر پالوَف نے کہا۔ اور چائے کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے اس نے اپنی عینک کی کمانی درست کرتے ہوئے پوچھا "کیوں؟ پانی کے دس گلاس"۔

بیوی نے جواب دیا۔ "میں نے کہا نہیں کہ اسے مجھ سے محبت تھی۔ ایک مرتبہ وہ ہمارے گھر آیا۔ میرا بھائی موجود نہ تھا۔ میں نے دروزہ کھولا۔ گورین نے گھبرا کر مجھ سے پانی مانگا۔ میں گلاس میں پانی لائی وہ پانی پیتا ہوا میری طرف دیکھتا رہا۔ گلاس ختم کرنے پر اس نے اور پانی مانگا۔ اِسی طرح وہ میرے سامنے دس گلاس سرد پانی کے پی گیا۔ محض اِس لئے کہ وہ اسے مجھے دیکھنے کا کسی قدر موقع مل جائے۔ اس کے علاوہ میں اس سے عمر میں بڑی اور اس سے اعلےٰ جماعت میں پڑھتی تھی اور یونیورسٹی کے طلبا میرے چاہنے والوں میں سے تھے"۔

پروفیسر پالوف نے عاجزانہ انداز سے کہا: "عہدِ رفتہ کی یاد میں تمہیں ضرور خط لکھنا چاہیئے۔ یہ شخص کیا نام...... گورین تعمیری کام میں غرق ہے اور تنہائی میں افسردہ خاطر۔ تمہارا خط اس کے لئے پیغامِ راحت ہوگا۔ ہمیں اس کی دلجوئی کرنا چاہیئے۔

بیوی۔ "فضول باتیں، میں کیا لکھوں۔ نہیں۔ اگر تمہیں اس سے ہمدردی ہے تو تم خط لکھو"۔

(۲)

پالوَف کی میز پر خط پڑا رہا۔ اس نے ایک مرتبہ اسے خود پڑھا اور گورین کے ساتھ اس کی ہمدردی بڑھ گئی۔ اُس نے چشمِ تخیل سے دیکھا کہ عظیم کارخانہ میں برقی روشنی کا سیل موجزن ہے، فولادی کلوں کے شور اور سٹیم انجنوں کی سیٹیوں سے ایک ہنگامہ برپا ہے۔ ایک بد وضع لیکن بلند قامت قوی ہیکل انجنیئر نیلی ڈانگری پہنے چوبی اور فولادی شہتیروں کے انباروں میں گھوم رہا ہے۔ اس کے ہاتھ تیل اور کوئلہ کے ذرّوں سے سیاہ ہو رہے ہیں۔ منہ کالی خاکستر سے آلودہ ہے۔ اور وہ بھاری آواز میں مزدوروں اور معماروں کو ڈانٹ دے رہا ہے۔ یہ انجنیئر یہ احمق انجنیئر محبّت میں مبتلا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ صوفیہ اب ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہے کم از کم ۱۹۰ پونڈ وزنی۔ اس کے رخسار ڈھلکے ہوئے ہیں جن پر پاؤڈر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے دراز گیسو افسانۂ ماضی بن چکے ہیں۔ اس کے تبسّم میں کوئی دلکشی باقی نہیں رہی۔ پالوف نے دل میں کہا۔ "کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس بیوقوف کو حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے۔ لیکن ایسا کرنا کہیں خلاف مصلحت نہ ہو۔ نہیں۔ میں اسے فریبِ محبّت میں مبتلا رکھنا چاہتا ہوں۔ مبادا وہ بددل ہو کر تعمیری کام سے منہ موڑ لے۔ میں اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا۔ اس قسم کے لوگ شکستہ دل ہو کر اپنے فرضِ منصبی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ میں خود اسے خط لکھونگا۔ محبّت میں ڈوبا ہوا خط وہ اسے پڑھکر اور تیزی سے کام کریگا"۔ پروفیسر پالوف نے تین دن کے بعد خط لکھا۔

پیارے گورین!

میں تمہارے خط کا فوراً جواب نہ دے سکی۔ تمہارے محبّت نامہ نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ ہمیں ایک دوسرے کو دیکھے ہوئے چودہ برس گزر چکے ہیں۔ چودہ برس! اِس طویل مدت میں زمانہ نے ہزاروں رنگ بدلے۔ انقلاب نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ (پروفیسر پالوف نے خیالی طور پر اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "انقلاب نے تمہیں خاک سکھایا ہے۔ تم ویسی اُجڈ ہو جیسے پہلے تھیں") تمہارے خط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم زندگی کا لطف اُٹھا رہے ہو۔ مجھے تمہاری حالت پر رشک آتا ہے۔ تم اعلیٰ اور مفید کاموں میں مصروف ہو۔ لیکن میں گھر کی لونڈی ہوں۔ تمہاری طرح میرا دل بھی کتابیں پڑھنے کو چاہتا ہے۔ (پالوف نے کہا "خاک چاہتا ہے۔ تم میں تو اخبار پڑھنے کی بھی قابلیت نہیں") ہر شخص کسی نہ کسی مفید کام میں مشغول ہے۔ میرا خاوند پالوف پروفیسر ہے۔ مجھے کئی کئی روز اس کی صورت تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتی۔ وہ لیکچر دیتا ہے، وہ کانفرنسوں، جلسوں، مناظروں اور مباحثوں میں لگاتار شریک رہتا ہے اور اگر میں کسی معاملہ پر اس سے بات چیت کروں تو وہ اپنے ہاتھ کی ایک حقارت آمیز حرکت سے مجھے ساکت کر دیتا ہے۔

اسے مجھ سے محبت ہے۔ لیکن بے سود۔ آجکل محبت کے یہ معنی ہیں کہ خاوند بیوی کے لئے روٹی اور کپڑا مہیا کر دے اور بس۔ اس معاملہ میں تمہاری کیا رائے ہے۔ کیا بیوی محض لباس و طعام پر قانع رہ سکتی ہے۔ میں نے اپنا دل تمہارے سامنے کھول کر رکھدیا ہے۔ اس لئے کہ تم میری حالت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہو۔ اب میں اس نالہ و فریاد کو بند کرتی ہوں۔ مجھے بار بار خط لکھو۔ میں کمال مسرت سے ان کا جواب دونگی۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ آئندہ تم مجھے پوسٹ ماسٹر کی معرفت خط لکھو۔ تمہیں بارہا محبت سے یاد کرنے والی۔

صوفیہ

تیسرے دن نیلگوں لفافہ میں گورین کا خط موصول ہوا:۔

میری جان سے پیاری صوفیہ!

مجھے وہم و گمان سے برتر خوشی ہوئی۔ تمہارا خط ایسے وقت پر ملا جب میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ یہ کام میرے لئے سراسر شادمانی بن گیا۔ دن بھر تھکن محسوس نہیں ہوئی۔ تم نے کتنا پیارا اور کسقدر فلسفیانہ خط لکھا ہے یہاں سب اپنے اپنے کاموں میں اسدرجہ مستغرق ہیں کہ میں کسی کے پاس اپنی قلبی کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔ امریکہ سے خراد کی نئی مشینیں آ گئی ہیں، آئندہ ہفتہ تک ان پر کام شروع ہو جائیگا۔ میں نے آج دس آدمیوں کا کام کیا ہے۔ مجھے اس بات سے رنج ہوا کہ تمہیں سارا دن گھر کے کام کاج سے فرصت نہیں ملتی۔ یہ کیا لغویت ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تمہارا خاوند تمہیں آزاد کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ (پروفیسر نے یہ پڑھکر دل میں کہا "ایلو یالوف تمہارا رقیب تم سے بیزار بھی ہو گیا") تمہیں مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اور اس کے لئے تمہیں ماسکو میں یقیناً کافی موقع مل سکتا ہے۔

بہرحال مجھے تم سے انتہائی ہمدردی ہے اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ابھی تمہاری ذہنی تربیت کے لئے کافی وقت ہے۔ تم گھر کی باندی نہیں رہ سکتیں۔ مجھے یاد ہے تم نے راگ سیکھنا شروع کیا تھا۔ کیا تمہارا شوق بدستور قائم ہے؟ اپنے متعلق مفصل لکھا کرو۔ تمہیں آزاد ہونا چاہیئے۔ میں تمہارے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہوں۔ آئندہ خط کی امید کب تک رکھوں۔

بے قرار۔ گورین

(پروفیسر نے دل میں کہا۔ "بیٹا۔ فکر نہ کرو۔ تمہیں آج ہی خط لکھونگا") وہ اس وعدہ کو پورا نہ کر سکا۔ گھر آ کر اس نے گورین کا خط دراز میں بند کیا اور کہا۔ "بیٹا گورین ذرا صبر کرو۔ عاشقوں کے لئے صبر ایک دوا ہے"۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ اور جب یالوف دوسرے ہفتہ ڈاک خانہ میں پہنچا تو وہاں دو چٹھیاں اس کی بیوی کے نام موجود تھیں۔ پہلی چٹھی میں لکھا تھا:۔

صوفیہ میری پیاری صوفیہ!

کیا ہو گیا تم نے ابھی تک خط نہیں لکھا۔ آخر اس خاموشی کے کیا معنی۔ تمہاری پہلی چٹھی کا طرب افزا اثر ہنوز باقی ہے۔ لیکن میں کسی قدر اداس ہو گیا ہوں۔ یہاں سخت سردی پڑ رہی ہے، جو تعمیری کام میں سدِ راہ ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں بھی مشکل سے ملتی ہیں۔ مثلاً سگرٹ کی صرف ایک ڈبیا میرے حصہ میں آتی ہے، جو ناکافی ہے۔ کھانے کا کمرہ بہت غلیظ ہے جو میرے ایسے صفائی پسند کے لئے سوہانِ روح ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ تم خط نہیں لکھتیں۔ میں پاگل ہوا جاتا ہوں کل رات میں ایک رفیق کار کے مکان پر گیا۔ وہاں رقص و سرود کا انتظام تھا۔ غم غلط کرنے کو شراب کا دور بھی تھا۔ اور جب ایک شخص نے "لبِ دریا پر اکیلا رہ گیا" والا راگ سنایا تو میں تمہیں یاد کر کے بہت رویا۔ یہ وہی نغمہ تھا جو تم مدرسہ میں گایا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ مجھ پر ایسا سرور طاری ہوا کہ اگر تم مجھے چھٹی منزل سے کود پڑنے کا حکم دیتیں تو میں فوراً سرِ تسلیم خم کر دیتا۔ یہ راگ سننے کے بعد میں محفلِ احباب سے واپس آ گیا اور شہر میں گھومنے لگا۔ سردی سخت تھی۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ہلکی شراب بادِ زمہریر اور تمہاری محبت نے ملکر دل کو تڑپا دیا۔ میں اندھیری رات میں بہت رویا، گھر واپس آ کر مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ ایک دفعہ ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے دروازہ پر دستک دی ہے میں نے چارپائی سے اٹھکر دروازہ کھولا۔ میرا خیال تھا شائد تم آئی ہو۔ لیکن تم تو ماسکو میں تھیں مجھے اس وقت ماسکو ہزاروں میل دور نظر آنے لگا۔ میں نے تصور میں تمہارے خاوند کو دیکھا، خاوند تمہارا ایک لائق اور مہذب آدمی ہے۔ لیکن اپنے کاموں میں غرق، تمہارے لئے اس کے پاس کوئی وقت نہیں۔ تم گھر میں خادمہ کی طرح رہتی ہو۔ رات کافی گزر گئی ہے میں کل کام پر جانا نہیں چاہتا۔ میں صرف تم سے ملنا چاہتا ہوں۔

صادق گورین

دوسرا خط بہت مختصر تھا:۔

پیاری صوفیہ!

تمہیں خط کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آخری خط میں بہت سی فضول باتیں لکھ گیا۔ بات یہ ہے کہ نشۂ شراب میں وہ خط لکھا گیا تھا۔ معافی کا خواستگار ہوں۔ اپنے

کام پر بدستور جاتا ہوں۔ اب تمہیں خط لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمہیں اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اچھا خوش رہو۔

گورین۔

جب پالوف نے یہ خط پڑھے تو اس نے سوچا "بہتر تھا کہ اس سلسلے کو شروع نہ کیا جاتا۔ اب تو اسے تسلی آمیز خط لکھنا میرا فرض ہے۔ مبادا عالم اضطراب میں وہ شراب کا عادی ہو جائے۔" پالوف نے بلا تاخیر خط لکھا:۔

پیارے گورین!

میں بیمار تھی اور دردِ معدہ سے لاچار اس لئے جواب نہ دے سکی۔ لیکن ذرا سی خاموشی پر تمہارا اس طرح بیقرار ہو جانا بھی مزا دے گیا۔ تم نے آخری سے پہلے خط میں میرے جذبات کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اگر مجھے اس رسل و پیام میں دلچسپی نہ ہوتی تو تمہارا پہلا خط موصول ہونے پر چپ رہتی۔ اس کے بعد تم سے لڑنا چاہتی ہوں میرا خیال تھا کہ تم مضبوط کیرکٹر کے مالک ہو۔ اب معلوم ہوا تم پر کبھی کبھی ایک عجیب کیف طاری ہو جاتا ہے۔ حالات کی ذرا سی ناساز گاری تمہارے دماغی توازن کو بگاڑ دیتی ہے۔ تمہارے پہلے خط سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ تم اپنے کام پر اتنے شوق سے جاتے ہو۔ گویا وہ محاذِ جنگ ہے۔ مجھے تم پر فخر تھا میں تمہاری آخری چٹھیوں سے بہت بیزار ہوں۔ آئندہ شراب نہ پینا۔ میں تمہیں حکم دیتی ہوں، سُن لیا۔ خبردار جو کبھی پی۔ ہم ایک نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ اب ذمہ داری اور ولولۂ عمل کی ضرورت ہے۔ خود شیطان کو پتہ نہیں کہ ہمارا مستقبل کن حالات کا حامل ہے۔ میں تمہیں سگرٹ بھیجونگی۔ مجھے خط کا جواب دو۔ مکرر تاکید کہ آئندہ شراب کو مت چھونا۔ (صوفیہ)

میری ننھی پیاری صوفیہ!

تہ دل سے معذرت چاہتا ہوں۔ قصور سراسر میرا تھا۔ میں واقعی پلید ہوں۔ میں نے یکایک سمجھ لیا کہ شاید تم مجھے خط نہ لکھو اس خیال سے میں کچھ دیوانہ سا ہوگیا۔ اب تمہارا کیا حال ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھو۔ یہ دردِ معدہ ہمارے تعمیری پروگرام میں ایک سدِ عظیم ہے۔ ہمیں بیمار پڑنے کی فرصت کہاں۔ اکتوبر تک امریکہ سے نئے ہل آ رہے ہیں پچیس ہزار۔ کاشت کے لئے، ہمارے یہاں کئی امریکن انجنیئر ہیں میں انہیں پسند نہیں کرسکتا۔ انہیں صرف ڈالروں سے واسطہ ہے۔ وہ ہم سے علیحدہ رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک کے ساتھ میرا جھگڑا ہوگیا۔ صوفیہ یہ کیا بات ہے کہ اب تم اپنے خط میں اپنے متعلق بہت کم لکھتی ہو۔ ماسکو میں کیا صورت حال ہے تم اپنا دل کیونکر بہلاتی ہو۔ کیا تھیئٹر دیکھنے جاتی ہو۔ سگرٹوں کے لئے متشکر ہونگا۔ میرے لئے ایک سویٹر بھی خرید لینا میں اس کی قیمت فوراً بھیج دونگا۔ اگر تمہیں تکلیف ہو تو سویٹر لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ شرط لازمی ہے۔ اپنا حال لکھو مفصل۔ اور خوش و خرم رہو۔ تمہارے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہوں۔

تمہارا ...... گورین

پروفیسر پالوف نے اس خط کا فوراً جواب دیا:۔

پیارے گورین!

تم دیکھو تمہارے خط کا کتنی جلدی جواب دے رہی ہوں۔ مجھے اس امر سے گونہ صدمہ ہوا کہ تم اور تمہارے رفقائے کار امریکن ماہرینِ خصوصی سے علیحدہ رہتے ہیں۔ بلکہ تمہیں چاہیئے کہ جو کچھ ان سے سیکھ سکتے ہو سیکھ لو، اور جتنی جلدی ہو سکے سیکھ لو۔ میں کل سگرٹ اور سویٹر بھیج دونگی۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ (پالوف نے دل میں کہا ضرور تکلیف ہوگی۔ دو کانوں کا چکر کاٹنا اور پارسل بنا کر ڈاک خانہ جانا مفت کا دردِ سر۔ لیکن خود کردہ را علاجے نیست) میں اپنا حال کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں، تم سب کچھ جانتے ہو۔ ہاں تھیئٹر جانے کا اتفاق ہوتا ہے کبھی کبھی۔ تم نے ایک خط میں دریا والے نغمہ کا ذکر کیا ہے۔ میں تو اسے بھول چکی تھی۔ لیکن ایک معمولی سے واقعہ کی یاد تمہارے دماغ میں محفوظ رہی۔ تم اپنے گذشتہ زمانہ کا حال کیوں نہیں لکھتے۔ میرے خیال میں وہ دلچسپ ہوگا۔ چند دنوں کا ذکر ہے۔ میں نوجوانوں کے مجمع میں شامل ہوئی اور میں نئی نسل کے لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھ کر حیرت میں آگئی۔ انہیں کھلے میدان میں ورزش اور کھیل کود کا قابلِ تعریف اشتیاق ہے۔ وہ فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتیں۔ جب ہم ان کی عمر کے تھے تو ہمیں بے معنی شرارت احمقانہ ترانوں اور باہم آنکھیں لڑانے سے واسطہ تھا۔ یہ لڑکیاں اور لڑکے تعمیری کام کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ لمبا خط اس لئے نہیں لکھتی کہ خواہ مخواہ تمہارا وقت ضائع ہوگا۔ تم باقاعدہ سو کر صبح تازہ دم اپنے کام پر جانے کی عادت ڈالو۔ میں تمہاری کامیابی کے لئے دعا گو ہوں، میں ایک ایسی بات کرنے والی ہوں جس سے تم محوِ حیرت ہو جاؤ گے۔ (صوفیہ)

(۴)

گورین نے اس خط کا فوراً جواب دیا:۔

پیاری صوفیہ!

سگرٹ اور سویٹر پہنچ گئے ہیں۔ میں کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔ سویٹر سے میرے جسم میں ایک نئی حرارت پیدا ہو رہی ہے اور تمہارے خطوط میرے لئے روحانی لذت کا مستقل سرمایہ ہیں۔ امریکنوں سے اشتراکِ عمل کرنے کے متعلق تمہاری نصیحت کو میرے تمام دوستوں نے بے حد پسند کیا۔ تم میری سابقہ زندگی کے متعلق پڑھنا چاہتی ہو۔ یہ بہت مختصر اور ازلبس غیر دلچسپ ہے۔ ۱۹۲۱ء تک میں سرخ فوج میں ملازم رہا۔ اسی سال ہماری رجمنٹ منتشر کر دی گئی۔ اور میں لینن گراڈ کے سرکاری صنعتی کالج میں داخل ہو گیا۔ میں نے شادی کی لیکن دل خوش نہ ہوا۔ ایک لڑکا تھا ہمارے اتحاد کا ذریعہ۔ اس کی موت پر میری ازدواجی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ تم نے کہا تھا کہ مجھے تمہارے متعلق معمولی واقعات بھی یاد ہیں۔ اس کی وجہ؟ آہ! تمہیں معلوم نہیں کہ میں تم سے بچپن تک محبت کرتا ہوں، طالب علمی کے زمانہ سے لیکر اب تک تمہاری تصویر میرے لوحِ قلب پر منقوش ہے، تم مجھے اپنی نئی تصویر بھیجو۔ میں بھی اپنا فوٹو تمہیں بھیجونگا۔ شاید میری شکل و صورت تمہاری یاد سے محو ہو گئی ہے۔ تمہارے خط کا آخری فقرہ میرے لئے معمہ ہے۔ مجھے حیرت زدہ کرنے والی حرکت سے کیا مراد ہے۔

تمہارا گورین

پالوف نے اس خط کا جواب دیا:۔

گورین۔ تمہارے خط نے مجھے کسی قدر ہراساں کر دیا ہے معلوم ہوتا ہے تم ابھی تک کامل اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنے کام میں مصروف نہیں ہو۔ میرے ذہن میں تمہاری شکل و شباہت حسب ذیل ہے:۔

تم اونچے بوٹ پہنتے ہو، اور چمڑے کی جیکٹ، تمہارے ساتھ چربی سے آلودہ رہتے ہیں۔ اور تمہارا چہرہ کوئلہ کی گرد سے سیاہ۔ تمہاری چال سے مستقل مزاجی پائی جاتی ہے۔ انجنوں کے متعلق کوئی بات نہیں جو تمہیں معلوم نہ ہو۔ تم ان دیوہیکل مشینوں کو فرمانبردار غلام بنا لیتے ہو۔ ممکن ہے بعض لوگ تمہارا مضحکہ اڑاتے ہوں، لیکن تمہیں ان کی پروا نہیں۔ میں بہت جلد اپنا فوٹو بھیجونگی اس کے عوض میں تم بھی اپنا فوٹو بھیجنا۔ جلدی۔ کل میں نے تمہارا خط بار بار پڑھا۔ معلوم نہیں میری اُداسی کیوں بڑھ رہی ہے۔ دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی ہے۔ (پالوف نے دل میں کہا: "اس آخری فقرہ سے گورین انجنیر پھڑک اُٹھیگا۔ اس کے ریشِ دل کے لئے یہ خیال مرہم کا کام دیگا) تم ہمیشہ ہمت اور حوصلہ سے کام میں لگے رہو۔ اگر میں بھی انجنیر ہوتی تو میری مسرت کا کیا ٹھکانہ تھا۔ خط کا جواب جلدی دو۔ صوفیہ

گورین نے عجلت سے جواب دیا:۔

صوفیہ! صوفیہ!! صوفیہ!!!

تمہارے خط سے میرا دل محشرستان بن گیا ہے۔ میری حسین صوفیہ۔ میں تمہیں اپنا فوٹو بھیج رہا ہوں، اور تمہارے فوٹو کا منتظر ہوں۔ میرے متعلق تمہاری خیالی تصویر کے بعض خط و خال درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ میرے ہاتھ اور چہرے پر سیاہی اور تیل اور چربی کا اتحادِ ثلاثہ قائم رہتا ہے۔ میں اونچے بوٹ بھی پہنتا ہوں، لیکن میرا جیکٹ چمڑے کا نہیں۔ میں ہر روز خود اپنی حجامت بناتا ہوں۔ میں تمہارے خطوط کی ہر سطر سے اندازہ لگا سکتا ہوں کہ انسانی زندگی کے نشیب و فراز سے تم کسقدر واقف ہو۔ تمہارے خیالات میں پختگی اور ندرت ہے۔ خوش رہو۔

گورین

پروفیسر پالوف نے یہ خط پڑھکر چند روز خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔ پھر ایک ہفتہ کے بعد اسے مندرجہ ذیل خط موصول ہوا:۔

صوفیہ! میری حسین صوفیہ۔

یہ خاموشی کس لئے، میں فکر و غم سے دیوانہ ہوا جاتا ہوں اور تمہیں ملنے کے لئے بیتاب ہوں، ایک ضروری مشین نصب کرنے کے صلہ میں مجھے دس دن کی رخصت ملی ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارے پاس آ جاؤں۔ خواہ کچھ ہو ہمیں ضرور ملنا چاہئیے۔ صوفیہ مجھے اپنے پاس آنے کی اجازت دو۔ موسمِ بہار کی آمد آمد ہے۔ کل دھوپ نکلی۔ رات میں نے کمرہ کی کھڑکیوں کو کھلا رکھا۔ اور آسمان پر بڑے بڑے رنگین اور چمکدار ستاروں کو تیرتے دیکھا۔ اور میں نے تمہارے خطوط کو بار بار پڑھا۔ میں ساری رات سو نہ سکا۔ اب مجھ سے یہ عذاب برداشت نہیں ہو سکتا۔ مجھے اپنے پاس آنے دو۔ کیا تمہارے لئے یہ لکھ دینا مشکل ہے کہ "آجاؤ" ان دو الفاظ میں میری زندگی کا راز مضمر ہے۔ مجھے آج کل تمہارا وہ معروف راگ یاد آ رہا ہے، جو تم گایا کرتی تھیں۔ "آئیگا وہ بہاریں"۔ اب یہ کارخانے جہاں میں کام کرتا ہوں میری نگاہ میں بے معنی ہیں۔ اب میں دنیا بھر میں سب سے ضروری چیز تمہیں سمجھتا ہوں۔ تمہیں تمہیں تمہیں۔ مجھے اپنے پاس آنے دو۔ میں تمہارے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہوں۔

صرف تمہارا گورین

یہ خط پڑھنے کے بعد پروفیسر پالوف سخت ہراساں ہوا۔ وہ اپنی حرکت پر نادم تھا۔ کہ میں نے ایک معمولی خط لکھ کر ایک طوفان برپا کر دیا۔ اس نے سوچا "اب قرینِ مصلحت یہ امر ہے کہ میں اس احمق انجنیر پر ساری

بات ظاہر کردوں۔ مَیں اسے سمجھادوں کہ تم جسے حسین صوفیہ کہتے ہو۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔" اسی شام کو پالوف نے یہ خط رقم کیا:۔

کامریڈ گورین!

مَیں ایک ضروری امر کی طرف آپ کی فوری توجہ منعطف کرنا چاہتا ہوں، جب میری بیوی صوفیہ کو آپ کی چٹھی موصول ہوئی تو وہ اس نے مجھے پڑھنے کو دے دی۔ عام طور پر مَیں اپنی بیوی کے خطوط پڑھنے کا عادی نہیں ہوں۔ یہ خط پڑھنے کے بعد مَیں نے اسے جواب لکھنے کے لئے مشورہ دیا، بلکہ اصرار کیا۔ کیونکہ مجھے آپ سے ایک گونہ ہمدردی پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن صوفیہ ایک متلوّن مزاج عورت ہے۔ اس نے میرے مشورے کو رد کردیا۔ لہذا مَیں نے جواب لکھنے کا فیصلہ کرلیا اور اس فیصلہ کو صیغہ راز میں رکھا۔ آپ اسے ایک غیر شریفانہ فریب دہی سے تعبیر کریں گے۔ اور حق یہ ہے کہ مَیں خود بھی اپنی حرکت پر بار بار نادم ہوا ہوں مَیں اس کے جواز میں صرف یہ عذر پیش کرسکتا ہوں کہ قومی تعمیر کے کام میں آپ ایسے انجنیئروں کا دم غنیمت ہے۔ مَیں نہیں چاہتا تھا کہ آپ شکستہ دل ہوکر اپنے کام کو چھوڑ دیں۔ میرا ضمیر اس معاملہ میں سراسر بے لوث ہے۔ جہانتک میری بیوی کا تعلق ہے مَیں بتادوں کہ وہ ابھی تک جاہل محض ہے۔ اسے اخبار پڑھنا بھی نہیں آتا، ہماری شادی کو دس سال گذر رہا ہے۔ اس دوران میں اس نے کچھ نہ سیکھا۔ اسے گھریلو کام کاج کا شوق ہے۔ اس کا لطیف اور چھریرا بدن بھاری بھرکم ہوگیا ہے وہ اپنے بالوں کو رنگتی ہے مجھے جس بات سے خاص چڑ ہے وہ اس کا بخل ہے، جو غالباً بہ تقاضائے عمر ہے، وہ آئے دن گوالن سے لڑتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ پورے پیمانہ کے مطابق دودھ نہیں دیتی۔ اگر مَیں اُسے لڑنے جھگڑنے سے روکوں تو وہ رونے لگ جاتی ہے۔ مَیں آپ کو اس کی تصویر بھیج رہا ہوں۔ اس کی جھرّیاں نمایاں ہیں۔ اور اس کی ٹھوڑی تہ در تہ ہے۔ وہ اب طالب علمی کے زمانہ کی صوفیہ نہیں ہے۔ آپ کی "حسین لڑکی" کا وزن ۱۹۰ پونڈ ہے۔ ہاں اس کی ایک بات ہے جس میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اس کی بلند آہنگی ہے۔ جب وہ گاتی ہے مَیں اسے منت سماجت سے اُسے چپ کراتا ہوں۔ وہ ان جذبات کی مستحق ہے جن کا اظہار آپ نے کیا ہے۔ آپ کو ایک مضبوط جوان اور چالاک رفیق حیات کی ضرورت ہے۔ ایک ایسی عورت نہیں جس کی جوانی تمام ہوچکی اور جس کے لبوں پر مصنوعی سُرخی ہے۔ امید ہے ہمارے دوستانہ تعلقات قائم رہیں گے۔ آپ اپنے کام میں بدستور مصروف رہیں۔ (پالوف)

دوسرے دن پروفیسر پالوف کو ایک علمی کانفرنس میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں اُسے دو ہفتے لگ گئے۔ وہ واپس آیا اور سب سے پہلے حمام میں گیا، غسل کے بعد اس نے نیا لباس پہنا۔ قہوہ پیا اور گھر کا رستہ لیا۔ ایک دکان سے کچھ مٹھائی بھی خریدی۔ حق یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں نادم تھا۔ گھر تک آتے ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ "مَیں نے صوفیہ کے ساتھ سخت ناانصافی سے کام لیا ہے۔ وہ اتنی بُری نہیں جتنا مَیں نے گورین کو خط لکھتے ہوئے ظاہر کیا۔ وہ ایک بھلی چنگی گھریلو عورت ہے"۔ وہ اپنی بیوی کے لئے کوئی تحفہ لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ دوکان میں داخل ہوکر واپس آگیا۔ اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اس تحفہ کی قیمت صوفیہ کو نقد دے دونگا وہ گھر پر پہنچا، باہر کا دروازہ مقفل تھا۔ وہ اسے کھول کر مکان میں داخل ہوا اور سب سے پہلے اپنے خاص کمرہ میں گیا۔ اس کی نظر میز پر ایک کاغذ پر پڑی۔ جس میں لکھا تھا:۔

پالوف! مَیں گورین کے ساتھ جارہی ہوں۔ مَیں اس کے پاس نہایت خوش و خرّم رہونگی۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ گورین کو اب ایک اور کارخانہ میں کام مل گیا ہے۔ اور مَیں اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔ میں اس کا ہاتھ بٹاؤنگی اور اس کے صلہ میں اس سے کچھ سیکھ بھی لونگی۔ تمہارے خطوط پڑھ کر میرے غصہ کی کوئی حد نہ رہی۔ مَیں بہت روئی، چلائی، خیر۔ اب مَیں تم سے ناراض نہیں ہوں، صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم نے بعض باتوں میں مبالغہ سے کام لیا۔ تمہیں بخوبی معلوم ہے میرا وزن ۱۹۰ پونڈ نہیں، اور میرے چہرہ پر کوئی بہت زیادہ جھرّیاں بھی نہیں۔ (صوفیہ)

پروفیسر پالوف کا رنگ قرمزی ہوگیا اور اس کے کان تمتما اُٹھے۔ اس نے اپنی عینک اُتار کر میز پر رکھدی اور اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں کو ہاتھوں سے ملتے ہوئے کہا:۔

"یہ کیا ہوگیا یہ کیا ہوگیا؟"

کوئی جواب نہ پاکر اس نے ایک بچّہ کی طرح چلانا شروع کیا۔ "صوفیہ! صوفیہ!!" کسی نے جواب نہ دیا۔ ہُو کا عالم تھا۔

"ع غ"

دیوانِ غالب

اندوہِ وفا

(یعنی غالب کی آٹھویں غزل پر شرح)

۱۔ دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا (بیان)

۲۔ سبزۂ خط سے ترے کاکلِ سرکش نہ دبی
یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا (استعارہ)

۳۔ مَیں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا (بیان)

۴۔ دل گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَسِ جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا (شاعری)

۵۔ ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منّت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا (وضعداری)

۶۔ کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا (زبان)

۷۔ مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا (بیان)

تمہید:۔ اِس غزل میں بہ اعتبار اصطلاحِ عشق صفتِ "وفا" پر شاعرانہ انداز میں تنقید کی گئی ہے۔ اور اِس طرح ایک پوشیدہ پہلو لے کر معاشرت و اخلاق پر بھی ایک قسم کا طنز کیا گیا ہے۔ مفہوم مسلسل ہے۔

مفہوم:۔ ۱۔ دنیا میں عموماً وفا کا بدلہ جفا ہے۔

"اے ہوائے سرد چل۔ زور سے چل۔ تو اتنی نامہربان نہیں جتنی کہ انسان کی ناشکری اور بے وفائی" (شیکسپیر)

۲۔ حسنِ شعور بھی بے وفاؤں کی بے وفائی نہیں روک سکتا۔

۳۔ بے وفائی اور زبردستی کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ مرنے بھی نہیں دیتے۔ خودکشی حرام ہے۔

۴۔ رندی اور پرہیزگاری میں محض ایک خیالی اختلاف ہے۔

۵۔ بے وفاؤں کی تسلی بے معنی ہے ایسی تسلیوں کا احسان نہ لینا ہی خوشی کا سبب ہے۔ ع

"مجھ پہ احسان نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا"

۶۔ ع "آہ یہ موت بھی جذبات کی پابند نہیں"

۷۔ وہ ناتوانی مبارک ہے جو کسی احسان سے بچائے۔

تشریح: نقشِ وفا یعنی "احسان"۔ وجہِ تسلّی یعنی باعثِ اطمینان۔ شرمندۂ معنی نہ ہوا، یعنی بے معنی رہا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کے ساتھ احسان کرنا باعثِ اطمینان نہیں کیونکہ دنیا میں نیکی کا بدلہ ہمیشہ بدی ہے اور "وفا" کا لفظ بالکل مہمل اور بے معنی ہے۔

۲۔ سبزۂ خط کو زمرّد سے تشبیہ دی ہے اور زلف کو افعی سے۔ یعنی خط نکل آنے پر بھی زلفوں کی دلفریبی میں کمی نہ ہوئی۔ ع

"خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا" (میرؔ)

کہا جاتا ہے کہ زمرّد سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے مگر سبزۂ خط سے زلف کا نہ دبنا گویا زمرّد سے افعی کا اندھا نہ ہونا ہے۔

(صنعتِ لف و نشر مرتب مع استعارہ)

۳۔ اندوہِ وفا "یعنی وفاداری کا خیال" وفاداری سے مطلب شاید اس شعر میں عبادت ہے بمصداق "ما خلقت الجنّ والانس الّا لیعبدون"۔ مطلب یہ ہے کہ روزہ نماز کی پابندی سے بچنے کے لئے جی میں تو یہ ہے کہ خودکشی ہی کر لوں مگر خودکشی بھی بے وفائی ہے کیونکہ شرعاً حرام ہے۔ اس شعر سے شاعر کی آزادہ روی کا اظہار ہوتا ہے! اور اس کے آگے والا شعر اس کی دلیل ہے۔

(۴) جادہ بمعنی گزرگاہ۔ تقویٰ یعنی پرہیزگاری۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم سے عبادت و پرہیزگاری نہیں ہو سکتی تو اس کی ضد یعنی رندی و خوش مستی ہی سہی۔ بمصداق "اگر خدا نہیں خوش تو شیطان ہی سہی"۔ گویا مرزا صاحب کے نزدیک دوست دشمن سب برابر ہیں۔ ع

"بڑے آئے یہ آزادی کے پتلے"

(۵) گوش بمعنی کان۔ منّت کش یعنی احسان مند، گلبانگ یعنی آواز

مطلب یہ ہے کہ تمہارا وصل کا وعدہ نہ کرنا میرے لئے خوشی کا باعث ہے۔ بَلا سے مفت کا احسان تو نہیں کیونکہ وعدہ وفائی کی امید خیالِ خام ہے۔ اِس شعر سے شاعرانہ وضعداری کا اظہار ہوتا ہے۔

۶۔ یہ شعر صاف ہے۔ ملاحظہ ہو مفہوم نمبر ۶۔

۷۔ حریف کے معنی مدِّ مقابل کے ہیں مگر یہاں اس کے معنی "منت کش" یا "احسان مند" ہونے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نے ابھی "قم" کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ ناتوانی سے میرا خاتمہ ہوگیا اس طرح ان کی مسیحائی کے احسان سے بچ گیا۔ اِس شعر میں بھی شاعری کی وضعداری کا شائبہ ہے۔

خلاصہ: وفاداری کے بدلہ میں وفاداری کی امید رکھنا حماقت ہے اِس لئے خودداری کا تقاضا یہ ہے کہ زبانی وعدوں کا احسان بھی نہ لے۔

ماخذ: ہمت نخورد نیشتر "لا" و "نعم" را (عرفی)

زبان: بہ اعتبار زبان یہ شعر نہایت صاف ہے اور بطور ضرب المثل ایک خاص جذبہ کے اظہار کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔ شعر

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

کاوشِ مژگاں

(یعنی غالب کی نویں غزل پر شرح)

بلبل از گل بگذرد چوں در چمن بیند مرا
بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا

۱۔ ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا (بیان)

۲۔ بیان کیا کیجئے بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا (تشبیہ)

۳۔ نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا (مبالغہ)

۴۔ دکھاؤنگا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا (زبان)

۵۔ کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا (تشبیہ)

۶۔ مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا (فلسفہ)

۷۔ اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشہ کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا (بیان)

۸۔ خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں مَیں بے زباں گورِ غریباں کا (بیان)

۹۔ ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا (تشبیہ)

۱۰۔ بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسمہائے پنہاں کا (بیان)

۱۱۔ نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیرے مژگاں کا (زبان، بیان)

۱۲۔ نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا (فلسفہ)

تمہید: اِس غزل میں حقیقی محبت کے مراتب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے حیات انسانی کی ناپائیداری اور زندگی کی خوشیوں کی عارضی نمود پر خیال آرائی کی گئی ہے، اور ثابت کیا گیا ہے کہ کسی چیز کا ہونا اس کے نہ ہونے کی دلیل ہے۔ مفہوم بالکل مسلسل نہیں۔

مفہوم: ۱۔ خواہشِ جنت بھی ہوس ہے۔

۲۔ اشکہائے غمِ یادِ محبوب کا سلسلہ ہیں۔

۳۔ بیخودی میں جو مظاہر جذبات ہوں ان کو کوئی نہیں روک سکتا۔

۴۔ محبت رنگ لائے گی۔

۵۔ حقیقی حسن پر دنیا کے تمام حسن قربان ہیں۔

۶۔ وجود فنا کی دلیل ہے۔

۷۔ ویرانی کا لطف ویرانی ہی کو حاصل ہوسکتا ہے۔

۸۔ میری خموشی بمصداق "صورت بہ بین حالم مپرس" گفتگو ہے۔

۹۔ عشق و محبت کے تمام مدارج طے کرنے پر بھی حسن کی یاد باقی رہتی ہے۔

۱۰۔ تبسم پنہاں میں عیاری شامل ہے۔

۱۱۔ ستمگر کی غمگینی افزونیِ ستم کی دلیل ہے۔

۱۲۔ سلسلۂ حیات کی ایک گرہ موت ہے۔

تشریح۔ ۱۔ طاقِ نسیاں یعنی بھول چوک۔ گلدستۂ طاقِ نسیاں یعنی وہ گلدستہ جس کو ہم کسی طاق پر رکھکر بھول گئے ہوں۔ طاقِ نسیاں محاورہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بہشت جس کی تعریف میں زاہد کی زبان گھسی جاتی ہے وہ دراصل ہمارا ایک گلدستہ تھی جسکو ہم کہیں بھول گئے اور اب اس کی پرواہ تک نہیں۔ کیونکہ ہماری بہشت میں زاہد کی جنت سے مشابہ لاکھوں گلدستے ممکن ہو سکتے ہیں ؎

دوزخ و جنت یقین بشنو کہ چیست

جز فراق و جز وصال دوست نیست

۲۔ کاوشہائے مژگاں یعنی مژگاں کی کھٹک تسبیحِ مرجان یعنی مونگے کی مالا۔ خون کے قطرہ کو جو آنکھوں سے بہا مونگے کے دانہ پر خدا کی یاد کی جاتی ہے اسی طرح میری آنکھوں کا ہر آنسو یادِ محبوب بن کر آتا ہے۔

۳۔ سطوت معنی رعب۔ ریشۂ نیستاں یعنی "نَے" دانتوں میں تنکا لینا محاورہ "خس بدندان گرفتن" کا ترجمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قاتل کا رعب بھی میرے نالوں کو روک نہ سکا۔ قاتل کا لحاظ کر کے لبطور انگشت بدندان جو تنکا لیا تھا وہ بھی "نَے" ہو گیا اور اس سے نالہ کی آواز پیدا ہوئی۔

۴۔ "تخم ہے سروِ چراغاں کا" یعنی ایسے سرو کا بیج ہے جس پر چراغ ہی چراغ نظر آئیں۔

مطلب یہ ہے کہ داغِ عشق ابھی تخم یا بیج کی صورت میں ہے اگر عشق کی ترقی میں کوئی بات لبطور سدِ راہ واقع نہ ہوئی یعنی اگر زمانہ نے فرصت دی تو یہی داغ سروِ چراغاں کی صورت اختیار کریں گے۔ اور وہ تماشا قابلِ دید ہوگا۔

۵۔ آئینہ خانہ یعنی وہ کمرہ یا مکان جس میں آئینے ہی آئینے آویزاں ہوں شبنمستاں یعنی چمن یا وہ جگہ جہاں شبنم پڑی ہو۔ سورج کی روشنی سے شبنم غائب ہو جاتی ہے۔ سورج کے ظہور سے پہلے ہر قطرۂ شبنم "انا الشمس" کا دعویدار ہوتا ہے لیکن جہاں سورج نمودار ہوا تو شبنم کے وہ قطرے جو پتوں پر نمودار ہوتے ہیں ستاروں کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ یعنی تیرے جلوے کے سامنے کسی کو قیام نہیں۔ وہ برق [illegible] سے بھی بڑھکر ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر آیہ:۔ کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

۶۔ تعمیر یا ساخت یعنی وجود۔ مضمر ہے بمعنی پوشیدہ ہے۔ خرابی یعنی فنا، ہیولا بمعنی "مادہ" لیکن یہاں اس لفظ سے "سبب" مراد ہے۔ برقِ خرمن یعنی خرمن کو مٹانے یا غائب کرنے والی بجلی۔ خونِ گرم یعنی ذی حیات کا خون جو گرم ہوتا ہے اور جو دست و پا کی حرکت کا ذریعہ ہے۔ یہاں اس کے معنی "مشغولیت" ہونگے۔ اب شعر کے معنی اس طرح ہوئے:۔

"میرے وجود میں فنا کی ایک صورت پوشیدہ ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ کسان کی مشغولیت اس کی کھیتی کو ٹھکانے لگانے کا سبب ہو۔ یعنی تخم ریزی، آبپاشی اور کٹائی پٹائی کے بعد قصہ ختم ہو جاتا ہے۔" شعر کا مطلب یہ ہے کہ خدا یعنی دہقاں نے مجھ کو مٹنے ہی کے لئے بنایا ہے۔ ملاحظہ ہو براؤننگ کی نظم "ربی بن عذار"۔ براؤننگ نے خدا کو ایک کوزہ گر سے تشبیہ دی ہے اور انسان کوزہ کی حیثیت رکھتا ہے یعنی جس طرح دہقاں کی غرض و غایت پیداوار یعنی اناج سے وابستہ ہے۔ اسی طرح خدا کی غرض و غایت انسان سے۔ اس کی مرضی پوری ہونا چاہیئے۔ بمصداق ؎

یا الٰہی تری مرضی پہ دل و جان فدا

پیکرِ خاک کے سب حسرت و ارمان فدا

۷۔ جب گھر خالی ہوتا ہے تو گھاس پھوس اُگ آتی ہے۔ اور ویرانی اس سبزہ زار کا تماشا کیا کرتی ہے۔ گھر کے نگہبان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اس خودرو سبزہ یعنی "سبزۂ بیگانہ" کو جو خود بخود اُگ آیا اور جس سے کسی قسم کی تفریح مقصود نہیں۔ [illegible] ۔ اس شعر میں یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے۔

۸۔ گھر کا چراغ اگر گل ہو جائے تو اندھیرے سے گھبرا کر گھر والے فوراً جلا دیتے ہیں۔ گورِ غریباں کا چراغ اگر بجھ جائے تو اُسے کون جلائے اس کے بجھتے ہی اُس کی آرزوؤں کا خون ہو جاتا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ میری خاموشی میں لاکھوں حسرتیں پوشیدہ ہیں۔ میں گورِ غریباں کا گل شدہ یا مردہ چراغ ہوں۔ بقول اقبال ؎

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

الفاظ خموشی، نہاں، مردہ، بے زباں اور گورِ غریباں میں صنعتِ مراعات النظیر ہے۔

۹۔ پرتو یعنی عکس۔ افسردہ یعنی مایوس۔ حجرۂ یوسف یعنی دل جس

ہیں کبھی کسی حسین صورت کا خیال رہتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود مایوسی کے ابھی تک ان کی یاد باقی ہے۔ بمصداق ؎

آپ آئیں یا نہ آئیں یاد تو ہے آپ کی
نقش میرے لوحِ دل پر آپکی تصویر ہے

۱۰- تبسّم ہائے پنہاں یعنی پوشیدہ مسکراہٹ جو کسی پوشیدہ عیاری کی طرف اشارہ کرے۔ شعر کا مطلب ظاہر ہے۔

۱۱- لہو پانی ہوا ہوگا یعنی لہو پانی کی طرح بہا ہوگا۔ مژگاں کا سرشک آلودہ ہونا بمعنی پلکوں کا آنسوؤں سے تر ہونا۔ یعنی اب تو اپنے مظالم یاد کر کے غمگین ہو رہا ہے۔ یہ غمگینی اس بات کی دلیل ہے کہ تو نے بہت ظلم کئے۔

۱۲- شیرازہ یعنی لڑی اجزائے پریشاں یعنی دنیا اور اس سے متعلق تمام باتیں مطلب یہ ہے کہ موت زندگی کے تمام واقعات کا شیرازہ ہے

خلاصہ - جذب محبّت سے بڑھکر پُر لطف کوئی شے نہیں۔ حقیقی حسن تمام محاسن کی جان ہے۔ وجود فنا کی دلیل ہے۔

ماخذ -

گر در دلِ تو گل گذرد گل باشی
ور بلبل بیقرار بلبل باشی
سودائے بلا رنج و بلا می آرد
اندیشۂ کُل پیشہ کنی کل باشی

سیّد مقبول حسین احمد پوری

غزل

۱- ضبط کا حق ادا نہ ہو جائے
وہ ستمگر خفا نہ ہو جائے

۲- عشق کی بیکسی ارے توبہ
حُسن درد آشنا نہ ہو جائے

۳- دیکھ اے جذبِ دل وہ پردہ نشیں
کہیں جلوہ نُما نہ ہو جائے

۴- شکوہ کرنے چلا تو ہوں لیکن
شکرِ نعمت ادا نہ ہو جائے

۵- کیوں پشیماں ہو تم جفاؤں پر
دل کو کچھ حوصلہ نہ ہو جائے

۶- زخمِ دل پر نمک چھڑکتے ہو
درد بڑھکر دوا نہ ہو جائے

۷- بیوفائی پہ جس کی مرتا ہوں
وہ کہیں باوفا نہ ہو جائے

۸- فکرِ اظہار مدّعا نہ کرو
رازؔ وہ پھر خفا نہ ہو جائے

رازؔ رامپوری

تعلیمات

ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو یا اردو؟

آج سے چند ماہ پیشتر یعنی جن ایام میں سیاسیات ہند کے متعلق لندن میں گول میز کانفرنس منعقد ہو رہی تھی ہندوستان کے ایک بہت بڑے ماہر تعلیمات نے "ذریعۂ تعلیم" کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، نواب سر اکبر حیدری فینانس و ریلوے ممبر سلطنت نظام نے جو گول میز کانفرنس کے ایک نمائندہ تھے ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن میں "موجودہ حیدر آباد" کے موضوع پر ایک مضمون پڑھ کر سنایا تھا جس میں آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق نہایت اہم معلومات بہم پہنچائی تھیں

لارڈ زٹلینڈ نے صدر کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہاں کے طلبہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے بجائے جو ایک غیر ملکی زبان ہے تمام تعلیم اپنی مادری زبان اردو میں حاصل کرتے ہیں۔ لارڈ زٹلینڈ نے جنہوں نے ہندوستانی زندگی اور ہندی خیالات و آراء کا نظر تعمق سے مطالعہ کیا ہے
اس امر کو تسلیم کیا کہ ہندوستانی طلبہ کو مادری زبان کے بجا
میں تعلیم دینا اُن کی تعلیمی ترقی کی راہ میں بہت بڑا سنگ

سر اکبری حیدری نے اپنی تقریر میں کہ
ایسے شعبوں کے متعلق جنہیں حکومت
دشوار بنا رکھا ہے تجربے کر
انگریز سامعین سے دریافت
چاہیں تو وہ ان کے
انہیں ان کی مادری
زبانوں مثلاً لاطین
یا چینی کو ذریعۂ ت
لیکن
ہندوستا
لی ہے او
طور پر جا

اب جبکہ کانگریس انگریزی مال کے مقاطعے اور سول نافرمانی پر تلی ہوئی ہے انگریزی زبان کا معاملہ بھی خطرہ سے خالی نہیں۔

سر اکبر حیدری کا بیان ہے کہ حیدر آباد میں بھی چار دیسی زبانیں رائج ہیں۔ کیونکہ مرہٹی اور تلگو وغیرہ بولنے والے طلبہ وقتاً فوقتاً انگریزی یونیورسٹیوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں جہاں انگریزی ذریعۂ تعلیم ہے لیکن اگر دیسی زبانوں کی ترقی کا یہی عالم رہا اور کسی خاص زبان کو "لینگوا فرینکا" جو پشاور سے کیپ کموری تک بولی جاتی ہو نہ بنایا گیا تو لارڈ زٹلینڈ کے قول کے مطابق ہندوستانی طلبہ کو سخت نقصان پہنچے گا"

سر اکبر حیدری نے اس بات کی طرف
میں بہت کم لوگ اس بات
کر

حفظانِ صحت

صحت پر سفید لباس کا اثر

شفا خانوں اور ہسپتالوں میں سفید لباس کا عام رواج ہے - اسی
طرح بیماریوں کے علاج میں دھوپ کی قدر و قیمت بھی مسلّم ہے - اس
لئے ہر ممکن ذریعہ سے مریض کو اس بات کا موقع دینا چاہیئے کہ وہ دھوپ
کے منافع سے اچھی طرح متمتع ہو - سفید باریک لباس میں روشنی اچھی
طرح نفوذ کرتی ہے جس کی بدولت بدن کو نشوونمو کا بہت اچھا موقع ملتا ہے -
کمزور آدمیوں کو تاریک کمروں میں ہرگز نہ رکھنا چاہیئے اور نہ انہیں کبھی اس
بات کی اجازت دینی چاہیئے کہ وہ سایہ یا معمولی شیشہ والی کھڑکیوں کے
س - ایسے کمرے میں سکونت رکھنا جہاں معمولی شیشے میں سے روشنی
کے نقطۂ نظر سے ایسا ہی مضر صحت ہے جس طرح
اقوائے جسم کو برباد کر دیتا ہے - کیونکہ کھڑکی
کر جسم انسانی سے بالکل

اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عموماً موت کے چنگل میں جلد گرفتار ہوتے ہیں -
ریاستہائے متحدہ امریکہ کی دو ثلث آبادی شہروں میں سکونت
پذیر ہے اور قریب قریب ساری آبادی اسی محرومی میں مبتلا ہے کہ دھوپ
ان کے جسموں کو مس نہیں کرتی - معلوم ہو کہ صرف چہرے اور ہاتھوں پر
دھوپ پڑ جانا ہرگز کافی نہیں ہے - چمڑے کا رقبہ قد کے لحاظ سے
کم و بیش ہوتا ہے - بالغ آدمی کے جسم کا رقبہ اوسطاً پندرہ بیس مربع فٹ
دیکھنے میں آتا ہے - حالانکہ ہاتھ اور چہرے کا رقبہ کل رقبۂ جسم کے دسویں
حصہ سے بھی کم ہے - اس سے معلوم ہوگا کہ حصول صحت کے لئے
صرف دسویں حصہ جسم پر دھوپ پڑ جانا ہرگز کفایت نہیں کرتا -
ہمارے اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ وہ لوگ جو وزنی اور
سیاہ رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں حقیقت میں بہت کم روشنی ان کے
جسم سے مس کرتی ہے اگرچہ وہ اپنے اوقات کا بیشتر حصہ کھلی ہوا میں
گذارتے ہوں - جہاں تک ممکن ہو موسم گرما میں چھوٹے بچوں کو
پہنانا چاہیئے تاکہ ان کے جسموں کو کافی دھوپ اور
ڈاکٹر کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ گرم موسم ہو یا سرد
لباس کا اختیار کرنا ضروریات سے ہے -
کے اندر رہنے پر مجبور ہیں کم از
بھی بہرہ اندوز ہونے کا ضرور

لباس پہنا کرتے تھے -
ہیں ملبوس نظر آتے
تھا - تمام گرم
نے والے بھی ہمیشہ
سفید لباس
رہ

رحیم اللہ

سینما

امن کے پیغامبر...... سینما کے ایکٹر

دنیا میں سب سے تیز موٹر کار چلانے کا اعزاز حاصل کرنے کے بعد سر میلکم کیمبل ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے انگلستان کو واپس آ رہا تھا۔ بندرگاہ پر بے شمار لوگ جمع تھے کہ وہ اپنے اولوالعزم ہم وطن کا خیر مقدم کریں۔ جونہی معلوم ہوا کہ اسی جہاز پر چارلی چپلن بھی سوار ہے تو ساری خلقت اسی کی طرف ٹوٹ پڑی۔ اور وہ ان کے پرجوش نعرہائے مسرت کا مرکز بن گیا، سر کیمبل کے مداح بہت گھبرائے۔ لیکن کیا کر سکتے تھے۔ عوام ایک چالاک ڈرائیور کے بالمقابل ایک ایسے شخص کو دیکھنا چاہتے تھے جو دنیا کے سینما تھیٹروں میں اوسطاً ڈیڑھ کروڑ ناظرین کو ہر روز ہنساتا ہے۔

بعض انگریزی اخبارات نے لوگوں کی "بد مذاقی" پر تاسف آمیز حیرت کا اظہار کیا کہ ان کے نزدیک موٹر کار کی رفتار کے ریکارڈ کو مات کرنے والے برطانوی جانباز کے مقابلہ پر جوبائٹ بھی ہے ایک "مسخرہ" کی حیثیت زیادہ بلند ہے۔ ایک اور واقعہ سنیئے۔ ابھی چند ہفتے نہیں ہوئے کہ فیشن ایبل دنیا کی مشہور تفریح گاہ مونٹے کارلو کے ایک تھیٹر میں چارلی چپلن کی تازہ فلم "سٹی لائیٹس" دکھائی گئی۔ اس موقع پر ڈیوک آف کناٹ تشریف فرما تھے۔ فلم کی نمائش کا مقررہ وقت گذر چکا تھا۔ سینما کے منتظمین اس انتظار میں تھے کہ چارلی چپلن آئے اور کھیل شروع کیا جائے۔ آخر ڈیڑھ گھنٹے بعد چارلی آیا، اور اس نے بطور معذرت صرف اتنا کہا اور کمال استغنا سے کہا کہ میں پرنس موناکو اجو ریاست ریویریا کا حاکم اعلےٰ ہے) کے ساتھ باتوں میں مشغول رہا۔ لہذا وقت پر نہ پہنچ سکا۔ اس کے بعد تماشا شروع ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ ڈیوک آف کناٹ کے ہمراہی جن کے نزدیک پابندیٔ وقت فرائض خداوندی کی حیثیت رکھتی ہے چارلی چپلن کی اس "بے قاعدگی" پر بہت تلملائے۔ لیکن عوام کا یہ فتوےٰ تھا کہ ڈیوک آف کناٹ بھی چارلی کا انتظار کر سکتا ہے۔ حال ہی میں ایک امریکن اخبار نے اپنے لاکھوں ناظرین سے استفسار کیا کہ ان کے خیال میں زمانۂ حال کی گیارہ ممتاز ترین شخصیتیں کونسی ہیں؟ رائے شماری کے بعد جب ان کے اسمائے گرامی چھپے تو ان میں میسولینی پرنس آف ویلز ہنری فورڈ آئن سٹین اور ایڈیسن وغیرہ کے ساتھ چارلی چپلن کا نام بھی موجود تھا۔ ان چند واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ حاضرہ کی متمدن تہذیب سینما کے اثر و رسوخ سے کس حد تک متاثر ہے۔ اور مغرب کے مجلسی نظام میں سینما کے ایکٹروں کا درجہ کسقدر بلند ہے؟ ناظرین جانتے ہیں کہ ڈوگلس فیئربینکس حال ہی میں ہندوستان کی سیاحت سے واپس گئے ہیں۔ تب ان سے پوچھا گیا کہ میری پکفورڈ ہندوستان میں آپ کی ہم سفر کیوں نہ ہوئیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ موسمی حالات نے انہیں جانے کی اجازت نہ دی اور وہ مصر میں ٹھہر گئیں۔ گذشتہ یکم اپریل کو ڈوگلس فیئربینکس کلکتہ میں تھا۔ کہ ایک زندہ دل نے اس مضمون کا ایک نوجوش اشتہار شائع کر دیا کہ آج شام کو کلکتہ میدان میں ڈوگلس فیئربینکس کے اعزاز میں ایک پارٹی دی جائیگی۔ ہزاروں لوگ وہاں پہنچ گئے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دعوت اپریل فول کے سلسلے میں تھی۔ میری پکفورڈ اور ڈوگلس فیئربینکس کو سات مرتبہ مختلف ممالک کی سیر کے دوران میں جو واقعات پیش آئے۔ ان سے متاثر ہو کر میری پکفورڈ نے "سفیرِ امن" کے معنی خیز عنوان سے ایک نہایت دلچسپ مضمون شائع کیا ہے۔ آپ نے روس، چین، جاپان اور افریقہ کی سیاحت میں عوام کی نظروں سے محفوظ رہنے کی لاکھ کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اسکندرہ میں لوگوں کے ہجوم کا یہ عالم تھا۔ کہ انہیں باہر نکلنے کا راستہ نہ ملا۔ آخر پولیس کے سواروں نے نیزوں کے سایہ میں ان کے لئے راستہ بنایا۔ جب وہ موٹر کار میں سوار ہوئے، تو میری پکفورڈ کے بیان کے مطابق "لوگوں کی مسرت آمیز چیخوں سے فضا گونج اٹھی۔ ہر شخص ہم سے مصافحہ کرنے اور یادداشت کے طور پر ہمارے دستخط لینے کی غرض سے آگے بڑھا۔ موٹر کار کا پائیدان ٹوٹ گیا۔ بہت سے لوگ اپنے کانوں کو ہاتھ سے پکڑتے اور ہلاتے اور میری طرف

دیکھ کر ہنستے تھے" ان کی یہ حرکت میری پکفورڈ کی سمجھ میں نہ آئی - آخر ایک اخبار نویس نے بتایا کہ وہ چاہتے ہیں آپ ان کے کانوں پر اپنا نام لکھدیں تاکہ وہ اسے سوئی سے گود کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کرلیں -

جب سینما کے آسمان کے یہ درخشندہ ستارے "طلوع آفتاب کی سرزمین" جاپان میں پہنچے - تو حکومت جاپان نے ان کے استقبال کے لئے ایک ہوائی جہاز کا انتظام کر رکھا تھا - جو ان کے سر پر مصروف پرواز رہا - پورٹ آرتھر میں کئی ہزار لوگوں کا مجمع آدھی رات کے بعد تک ان کے انتظار میں ریلوے اسٹیشن پر گھومتا رہا - بندرگاہ کو لمبو میں انہیں "آبنوسی رنگ کے ہزاروں متبسم چہرے نظر آئے" میری پکفورڈ کا بیان ہے کہ "ان لوگوں کے دانت بہت چمکدار تھے"

وہ لکھتی ہیں کہ میں نے ایک عربی لڑکے کو دیکھا جو اپنے ہمجولیوں کے سامنے چارلی چپلن کی نقل اتار رہا تھا - ایک چینی ہوٹل کے ملازم نے آپ کو "لیلین گش" کی تصویر دکھائی جسے وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا - سیاحت سپین کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے میری پکفورڈ لکھتی ہے کہ "ہم شاہ الفانسو بادشاہ کی والدہ اور ملکہ پرتگال کے ہمراہ گھوڑ دوڑ دیکھنے جارہے تھے کہ راستہ میں ایک غریب بڑھیا عورت نے میرا دامن پکڑ لیا - میں نے سمجھا کہ شاید وہ مجھ سے خیرات مانگتی ہے - میں ایک لمحہ کے لئے ٹھہر گئی - اس عورت نے ہسپانوی زبان میں ایک تقریر شروع کردی جسکا مفادیہ تھا کہ میں فلم پر تمہیں بارہا دیکھ چکی ہوں - میں مدت سے تمہارے ملنے کی آرزومند تھی" -

اس عورت کے بعد ملکۂ پرتگال نے میری پکفورڈ سے کہا "مصیبت کے تاریک لمحوں میں جب بار بار میرے دل میں درد اٹھتا ہے - تم نے میرے لئے روشنی کی شعاع کا کام دیا - تمہاری تصویروں کے سوا میرے لئے اور کوئی تفریح کا سامان نہ تھا"

ناظرین کو غالباً چارلی چپلن کا مشہور فلم "گولڈ رش" دیکھنے کا موقع ملا ہوگا - ڈرامہ کا ہیرو طلائی کان کی تلاش میں نکلتا ہے - وہ کشمکش حیات میں بے طرح مبتلا ہے - دوسرے لوگوں نے زندگی کا نام عیش رکھ چھوڑا ہے - لیکن اس کے لئے دنیا خارستان بن گئی ہے - تفریح و مسرت کی جستجو اسے دیوانہ سا بنا دیتی ہے - لوگ اس پر ہنستے ہیں - غرض یہ فلم بہ حیثیت مجموعی مزاحیہ ہے - لیکن آپ یہ سنکر حیران ہونگے کہ فلسطین کے یہودی اس کامیڈی کو ایک نہایت متین ٹریجیڈی سمجھتے ہیں - ان کی رائے میں یہ ڈرامہ اس آزمائش و ابتلاء کا مظہر اور اس عظیم جدوجہد کا ترجمان ہے جس میں بنی اسرائیل مدتوں گرفتار رہے - کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں کہ ایک ڈرامہ مختلف الخیال اقوام کی زندگی کا یکساں حیثیت سے آئینہ دار بن جائے ؟

یہ واقعات اپنی نوعیت میں نہایت بصیرت افروز ہیں - یہ سینما کی عالمگیر مقبولیت کا درخشاں ثبوت ہیں - جن لوگوں نے چارلی چپلن اور ڈوگلس اور پکفورڈ سے اظہار عقیدت کیا، وہ فی الحقیقت خراج تحسین ہے - جو انسانی زندگی کی طرف سے ہمیشہ آرٹ کے حصہ میں آتا ہے -

آپ دیکھتے ہیں کہ سینما کے آرٹ نے کس طرح مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملا دیئے ہیں - اس کی سحر کارانہ کشش سے ہر شخص بلا امتیاز قومیت و نسل، رنگ و مذہب مسحور ہے - ہر فلم جو اپنے اندر عالمگیر دلچسپی رکھتا ہے - دراصل اس ملک کی صنعت کاری اور تخیلی قوت کا اشتہار ہے جس میں وہ تیار کیا جاتا ہے - لوگ خود بخود اس ملک سے مانوس ہوئے جاتے ہیں - اور پھر ان اشخاص کی ہر دلعزیزی کا کیا ٹھکانا ہے - جو اپنے فن سے ان تصویروں میں جان ڈال دیتے ہیں - اگر واقعی دنیا انہیں امن کا پیغامبر سمجھے تو یہ تعجب کا مقام نہیں -

ملک یوسف العزیز

دنیائے ادب
بنگالی

ٹیگور کا خط

سر رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک چٹھی ہم ادبی دنیا کی گذشتہ اشاعت میں ہدیۂ ناظرین کر چکے ہیں۔ دوسری چٹھی کا ترجمہ جو محترمہ راحت آرا بیگم نے چاٹگام سے بھیجا تھا درج ذیل ہے۔ — ادارہ

میں بخیریت رُوس پہنچ گیا ہوں۔ اگر یہاں نہ آتا تو زندگی کی تیرتھ نامکمل رہ جاتی۔ اِن لوگوں نے یہاں جو کچھ کیا ہے، اس بھلائی یا برائی کا فیصلہ کرنے سے پہلے دل میں یہ خیال ضرور موج زن ہوتا ہے کہ اِن لوگوں کی ہمتیں کیسی بلند ہیں۔ مساوات کا اصول ان لوگوں کے رگ و پے، دل و دماغ میں علیٰ درجہ الکمال سرایت کئے ہوئے ہے، اس رواج کی بڑی سختی سے نگرانی کی جاتی ہے، اسی رواج کے ماتحت ہر طرف سے ٹیکس وصول کئے جاتے ہیں۔ جن کی وصول یابی کا نظام نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم ہے، ان لوگوں نے پُرانے طور طریقے جڑ سے اُکھاڑ پھینکے ہیں، مغربی سائنس کی سحر کارانہ قوت یہاں بظاہر ناممکنات پر بھی دسترس پا رہی ہے، اور یہ ایک ایسی چیز ہے، جس کی تعریف کئے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔

یہاں جس رعب و جلال کے ساتھ حکومت کا کاروبار چل رہا ہے اسے دیکھ کر میں سخت حیرت زدہ ہوں، اگر اِن لوگوں کے سامنے صرف مسمار کر دینے ہی کا کام ہوتا تو مجھے کچھ حیرت نہ ہوتی کیونکہ ان میں تخریب و اِعدام کی قوت بہت کافی ہے، لیکن دیکھ رہا ہوں کہ انہوں نے بہت دُور دُور تک ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے، کسی کام میں توقف و تاخیر کرنا ان لوگوں کی برداشت سے باہر ہے کیونکہ دنیا کی کوئی طاقت انکے موافق نہیں بلکہ سب مخالف ہیں، جس قدر جلد ممکن ہوگا۔ ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑیگا اور دکھانا ہوگا کہ جو کچھ ان کی دلی خواہش ہے، وہ غلط نہیں ہے، اور نہ اس میں کسی فریب و جعل کو دخل ہے۔ ان لوگوں نے حلف اٹھایا ہے کہ ہزار سال کا مقابلہ دس پندرہ برس میں کر کے فتح حاصل کرینگے۔

دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ان کی مالی حالت بہت کمزور ہے لیکن ان کے اِرادہ کی مضبوطی کامیابیوں کو دعوت دے رہی، جس انقلاب کا انتظار مدت سے ہو رہا تھا وہ ہو کے رہا، اس مقصد کے لئے مشہور و گمنام ہر قسم کے محبانِ وطن روسیوں نے جانیں تک دی ہیں۔ اور ناقابلِ برداشت مصائب جھیلے ہیں۔

دنیا میں کسی زبردست انقلاب کا ظہور اس وقت ہوا کرتا ہے جب کوئی خیال عالمگیر وسعت اختیار کرلے، لیکن کسی کسی جگہ ایسے خیالات انتہائی پختگی کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں، جب خون میں کسی طرح کی خرابی پیدا ہو جائے، تو اس کا ظہور ایک زخم کی صورت میں ہوتا ہے، جو لوگ دولتمند طاقتور اور زور آور ہیں، ان لوگوں کے ہاتھوں غریبوں اور کمزوروں کو ناقابلِ برداشت تکالیف سہنی پڑی تھیں دونوں قسم کے لوگوں میں بڑا فرق تھا، اس لئے آخر کار ایک انقلاب کی صورت میں اس کا مداوا تجویز ہوا، ایک دن فرانس میں بھی اس خیال کے ماتحت انقلاب میں آیا تھا۔ غربار اسی دن سمجھے تھے کہ عدم مساوات کی ذلت اور مصیبت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اس لئے ان لوگوں نے عدل و مساوات کے نعرے لگانے شروع کئے، ان نعروں نے گنبد گردوں میں گونج پیدا کی اور فرانس سے باہر اغیار کے کانوں کے پردے بھی ان سے پھٹنے لگے لیکن یہ آواز کچھ زیادہ دن تک بلند نہ رہ سکی۔ لیکن آج دنیا میں اس ملک کے لوگ اپنی قوم کی بھلائی کے علاوہ دوسرے لوگوں کے بھی بہی خواہ بتائے جاتے ہیں۔ لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس جذبہ کو دوام و استحکام بھی نصیب ہو سکتا ہے یا نہیں؟

ظاہر ہے کہ اپنی ذات کی بھلائی کے ساتھ دنیا کی ہر قوم کی بھلائی وابستہ ہے، آج کل یہی جذبہ ساری دنیا کے دلی خیالات کا مرقع ہے، اس لئے اس کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں آجکل کی دنیا کے تاریخی اسٹیج کا پردہ گویا اُٹھ گیا ہے، اتنے دنوں یہ لوگ بڑی رازداری کے ساتھ ایک، پردہ کی آڑ میں الگ الگ ریہرسل (مشق) کر رہے تھے، ہر ملک چاروں طرف

سے گھرا ہوا تھا۔ باہر سے مطلق آمد و رفت کی گنجائش نہ تھی اُن ایام میں دنیا کی مختلف قوموں کی جو حالت تھی، آج وہ دکھائی نہیں دے رہی ہے، اُس وقت الگ الگ درخت نظر آتے تھے، لیکن آج وہ ایک جنگل کی صورت میں ہیں۔

ٹوکیو میں جب میں نے کوریو کے ایک نوجوان سے دریافت کیا کہ تم لوگوں کو آخر کس بات کی تکلیف ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ مہاجن کا راج ہم لوگوں کے سر پر سوار ہے، ہم ان کے منافع کا بوجھ ڈھونے والے ہیں۔ میں نے کہا اس کی کچھ ہی وجہ کیوں نہ ہو۔ جس صورت میں تم کمزور ہو تو اس بوجھ سے کیونکر رہائی حاصل کر سکتے ہو؟ اس نے کہا کہ بے بسوں کا گروہ آج دنیا میں چھایا ہوا ہے مصیبت انہیں متفق کر کے اکٹھا کرے گی جو تونگر ہیں اور جنہیں اپنے پُر زور صندوقوں کو بچانے کی ضرورت ہے، انہی لوگوں میں نا اتفاقی رہے گی کبھی وہ ایک ہو نہ سکینگے۔ کوریا کی طاقت ان کے دُکھ ہی سے ہے۔

مصیبت زدہ لوگ آج انسانی دنیا میں اپنے کو وقعت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں یہ معمولی بات نہیں ہے، ایام گذشتہ میں سبھوں نے اپنے آپ کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ دیکھا ہے اس لئے ان پر اپنی قوت کا اصلی اظہار کسی طرح نہ ہو سکا انہوں نے گردش ایام ہی کے خیال سے سب کچھ برداشت کیا تھا، آج جو سب سے زیادہ بے بس ہے وہ بھی اس بہشتی راج کا تصور کر سکتا ہے۔ جس میں مظلوموں کی مصیبت اور ذلیلوں کی ذلت کا خاتمہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں مصیبت زدوں کی ایک زبردست تحریک پھیل گئی ہے، جو لوگ طاقتور ہیں ان کے طور طریقے مغرورانہ دکھائی دیتے ہیں، مصیبت زدوں اور دُکھی لوگوں میں جانفشانی اور طاقت کی روح پائی جاتی ہے۔ زور آور لوگ اس روح کو سطحی کوشش سے فنا کرنا چاہتے ہیں، ان کی فریاد کو سُننے کے بجائے ان کی بے مددگار زبان کو بند کر رہے ہیں، حالانکہ اگر غور کیا جائے تو سرمایہ دار لوگوں کو مصیبت زدوں کی مصیبت ہی سے خوف کھانا چاہئے۔ ان لوگوں کی عرصۂ دراز سے تحقیر ہو رہی ہے، سرمایہ داروں کو مصیبت زدوں کی مصیبت پر اضافہ کرنے میں مطلق باک نہیں ہے، ان کا دل بدنصیب کسانوں کو قحط کے پنجے میں چھوڑ کر دو تین سو کروڑ نفع لے کر بھی کبھی نہیں پسیجا، کیونکہ انکے زعم میں وہ جسقدر نفع وصول کریں وہ اسی قدر زیادہ طاقتور ہو نگے، یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حیات اجتماعی کا ہر کام جو حد سے تجاوز کر جائے وہ پُرخطر ہو جاتا ہے، اس خطرہ کو کسی دوسرے ذریعہ سے روکنا ناممکن ہے، انتہائی قوت انتہائی کمزور کی مخالفت پر سبقت لے جا نہیں سکتی، اگر طاقتور لوگ اپنی طاقت اور زور کے نشہ میں مست اور مگن نہ رہتے تو انہیں سب سے زیادہ غیر مساوات کا کھٹکا لگا رہتا۔ کیونکہ یہ غیر موافقت ایک خلاف فطرت امر ہے۔

جب مجھے ماسکو سے دعوت آئی، اس وقت تک میں بولشوزم کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکا تھا۔ کیونکہ میں ہمیشہ انکے بارے میں اُلٹی اُلٹی باتیں سُنا کرتا تھا، چونکہ آغاز کار میں انکی جدوجہد تشدد پر مبنی تھی اسلئے میرے دل میں انکے خلاف منافرت کا جذبہ موجزن تھا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ انکی مخالفت اب یورپ میں بہت ہی کم ہو رہی ہے۔ میرے روس جانے کی خبر سُن کر بہت سے لوگوں نے میرے خیال کی تائید کی، یہانتک کہ بہت سے انگریزوں نے بھی اسکی تعریف کی، اکثر اشخاص نے یہ بھی کہا کہ روسی لوگ ایک حیرت انگیز ابتلاء کے دور میں سے گذر رہے ہیں لیکن بہت سے لوگوں نے مجھے وہاں جانے سے پست ہمت بھی کیا۔ زیادہ تر مجھے اس بات کا کھٹکا کہ وہاں ہر قسم کی تکلیف اُٹھانی پڑیگی، اور بتایا گیا کہ کھانے پینے کا انتظام وہاں اس قدر ادنیٰ ہے کہ وہ میری برداشت سے باہر ہوگا۔ اور یہ بھی مجھ سے کہا گیا کہ مجھے جو کچھ دکھایا جائیگا وہ سب تصنع ہوگا۔ میرے لئے اس عمر میں ان حالات کے ماتحت روس کے سفر کی ہمت کرنا مشکل امر تھا لیکن جس سرزمین میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ تاریخی واقعات رونما ہونے ہیں وہاں پر نہ جانا میرے لئے ناقابل معافی قرار پاتا۔ علاوہ اسکے میرے کانوں میں وہی کوریو نوجوان کی باتیں گونج رہی تھیں۔

خیال ہوتا تھا کہ اہل روس دولتمند کی دولت اور طاقتوروں کی طاقت کو منہدم کر دینا چاہتے ہیں، اس میں ہم کیوں ڈریں اور کیوں غصہ دکھائیں، ہماری دولت ہی کیا ہے اور طاقت بھی کتنی ہے؟ ہم تو فاقہ زدوں اور بے بسوں کے گروہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ ان لوگوں نے کمزور ہستیوں کی طاقت کو جگانے کا حلف اُٹھایا ہے تو میں کس منہ سے کہوں کہ وہ ان کے سایہ سے بھاگ جائے؟ ممکن ہے کہ یہ لوگ غلطی پر ہوں۔ انکے مخالف بھی غلطی پر ہو سکتے ہیں لیکن آج ہمارے بولنے کا وقت بھی آیا ہے۔ کمزوروں کی طاقت اگر ابھی ظہور میں نہ آئے تو آخر انسان کی نجات کیونکر ہو۔ کیونکہ زور آوروں کی طاقت انتہائے

زیادہ بڑھ چلی ہے۔ اتنے دنوں سے دنیا تپ رہی تھی اب آسمان تک کو بھی اپنے گناہوں سے ناپاک کرڈالا۔ بے بس آج بے یار و مددگار ہیں۔ ایک ہی جگہ ہر قسم کے عیش و آرام کا جمگھٹا ہے۔ اور دوسری طرف ہیں ناقابل برداشت انتہا درجہ کے مصیبت زدہ لوگ۔

چند روز قبل ہی سے ڈھاکہ کے روح فرسا واقعات میرے دل میں تلاطم پیدا کر رہے تھے۔ افسوس یہ کیسی غیر انسانی اور حیوانی بے رحمیاں ہیں جو ظہور میں آئیں۔ لیکن یورپ کے اخباروں میں اسکے متعلق کچھ خبر ہی نہ تھی۔ اگر وہاں کوئی معمولی موٹر یا گاڑی وغیرہ سے کوئی حادثہ پیش آجائے تو اس کی خبر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چھاپی جاتی ہے لیکن ہماری دولت، عزت اور جان کیسی ارزاں ہو گئی ہے۔ جنکی کوئی ہستی ہی نہ ہو انکے بارے میں منصفی کیونکر ہو سکتی ہے؟ ہماری فریاد دنیا کیوں سُنے؟ جبکہ ہر طرف سے راہ بند ہو۔ ہمیں بدنام کرنیوالی باتوں کو ساری دنیا میں پھیلا دینے کا ذریعہ انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے لیکن ان دنوں ایک کمزور قوم کے لئے یہ باتیں سخت تکلیف دہ ہیں کیونکہ آجکل یہ حالت ہے کہ کوئی افواہ ہو یا کسی قسم کی خبر فوراً ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ طاقتور قوم کے قبضہ میں چاروں طرف خبر پھیلانے کی جو مشین ہے اسکے ذریعہ سے کمزور قوموں کو بدنامی و گمنامی کے گڑھے میں رکھکر نیست و نابود کر دینا انکے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔

انہوں نے تمام دنیا میں مشہور کر رکھا ہے کہ ہم ہندو مسلمان آپس میں لڑمر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ، لیکن ایک وہ زمانہ تھا جبکہ یورپ میں بھی اکثر فرقے آپس میں لڑمرتے تھے، اس کا خاتمہ آخر کیونکر ہوا؟ صرف تعلیم کی اشاعت سے اور ہمارے ملک میں بھی اس صورت سے اسکو ختم کیا جا سکتا تھا۔ لیکن انگریزی حکومت کے بعد جسکو ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہوئے کو آیا فی صدی صرف پانچ آدمیوں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا اور وہ بھی تعلیم کہلانے کے قابل کب ہے؟ ہماری ناتوانی کا سبب دور کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے چاروں طرف مشہور کیا جاتا ہے کہ ہم کمزور ہیں۔ یہی تو ہماری کمزوری پر سب سے بڑی تہمت ہے۔ انسان کے تمام اہم مسائل طے کرنے کا ذریعہ تعلیم کی عمدگی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں اس کی راہ بند ہے، کیونکہ قانون اور ضبط (لا۔ آرڈر) نے کسی قسم کی بھلائی کی گنجائش ہی نہ رکھی۔ اس لئے تحویل میں مطلق کچھ ہے ہی نہیں۔ ملکی بھلائی کیلئے جتنی قسم کے کام ہیں ان میں سے ایک کو میں نے سب پر ترجیح دی تھی۔ عام آدمیوں کو محض اپنی قوت پر بھروسہ کرکے تعلیم دینے کے لئے میں نے اپنی انتہائی قوت صرف کی ہے اور اس کوشش میں میں نے گورنمنٹ کی مدد سے بھی انکار نہیں کیا بلکہ اس کی اُمید لگی تھی۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ آخر کیا ملا؟ انجام کار سمجھ میں آگیا کہ اس سے کچھ بھی حاصل نہیں یہ ہمارے لئے گناہ کبیرہ ہے۔

ہم ناتواں ہیں۔ اسلئے جب میں نے سُنا کہ روس میں جہاں عام اشخاص کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا وہاں عوام کی تعلیم حیرت انگیز طریقہ سے بڑھ گئی ہے، اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ میری صحت جو خراب ہو رہی ہے، جس درجہ بھی خراب کیوں نہ ہو جائے وہاں ضرور جاؤں گا۔ اہلِ روس کا خیال ہے کہ ناتوان کو قوت بخشنے کا صرف ایک ہی واحد ذریعہ یعنی تعلیم ہے۔ خوراک، چین و سکون اور صحت غرض ہر قسم کی سلامتی کا دارومدار اسی پر ہے، صرف "لا اور آرڈر" کے ڈھکوسلے ہمیں دے کر نہ تو اس سے پیٹ ہی پل سکتا ہے، اور نہ دل کو تسکین ہو سکتی ہے، بلکہ اسی کا بار اٹھانے کے لئے سب کچھ کھو دینا پڑا اسی ہندوستان کی آب و ہوا میں میری پرورش ہوئی ہے، اس لئے اتنے دنوں میرے دماغ میں یہ خیال مضبوطی کے ساتھ قائم تھا کہ تینتیس کروڑ جاہلوں کو تعلیم دلانا ایک غیر ممکن امر ہے۔ اسکے لئے ہم اپنی بدقسمتی کے سوا اور کسے قصوروار ٹھہرا سکتے ہیں۔ جب پہلے پہل میں نے سُنا تھا کہ یہاں کسانوں اور مزدوروں تک میں گویا تعلیم کا ایک سیلاب امنڈ آیا ہے اس وقت میرا خیال تھا کہ وہ تعلیم محض معمولی لکھائی پڑھائی یا تھوڑا بہت حساب کتاب ہوگا۔ تعلیم کی اصلیت پر نہیں بلکہ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد کی زیادتی پر ہی فخر کیا جاتا ہے، لیکن اگر ایسا بھی ہو تب بھی کیا کم ہے؟ لیکن ہمارے ملک میں کم از کم ایسا انتظام بھی ہوتا تو سرکار کو دعائیں دیتا ہوا مکان کا رخ کرتا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد دیکھا کہ تعلیم ایک پختگی کی صورت لئے ہوئے ہے۔ اور ایک انسان واقعی اس تعلیم کے بعد انسان کہلا سکتا ہے۔ لیکن صرف نوٹ یاد کرکے ایم۔ اے پاس کر لینے سے کوئی شخص حقیقی انسان نہیں بن سکتا۔

رابندر ناتھ ٹیگور

سنسکرت

عورت

عورت کمزور اور بزدل مرد کی پرواہ نہیں کرتی، اس کا عقیدہ ہے کہ مچھلیاں صرف مضبوط جال سے ہی پکڑی جاتی ہیں۔ عورت کی کتاب دنیا ہے وہ کتابوں سے اس قدر نہیں سیکھتی۔ جس قدر دنیا کے مشاہدے سے۔ عورت رنج میں ساتھ دیتی ہے اور راحت کو دوبالا کرتی ہے۔ باعصمت عورت کے چہرے پر ایک جلال ہوتا ہے۔ وہ عصمت کا ناز ہے۔

عورت انسان کیلئے بیش بہا نعمت اور آسمانی برکت ہے۔

(کالی داس)

عربی

دنیا میں اگر کسی چیز کو ثبات ہے تو وہ نیکنامی ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں خواہ وہ جاندار ہوں یا بے جان سب ایک دن فنا ہو جائیں گی۔ لیکن نیکنامی کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں... مٹا سکتی۔

(ترجمہ پریم سیالوٹی)

پشتو

محبت میں مزاج اس قدر برہم ہو جاتا ہے، کہ اطبائے دہر علاج سے عاجز آجاتے ہیں۔

محبت میں خون دل آنکھوں کی راہ سے بہ جاتا ہے۔

محبت رسم و رواج کی زنجیریں کاٹ دیتی ہے۔

محبت میں دار پر چڑھنا معراج پانا ہے۔

(دیوان رحمان)

جرمنی

علوم مادّی اور جسم انسانی

دنیا عرصہ سے "پاگل خانہ" بنی ہوئی ہے۔ خوش قسمتی سے اب تمام چیزیں سدھر رہی ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ انسان اب تک متعصب احمق اور خود غرض بنا ہوا ہے، انسان دنیا دما فیہا پر فلسفیانہ نظر نہیں ڈالتا۔ وہ اپنی مختصر زندگی تک اپنی ساری کوششوں کو محدود کرنا چاہتا ہے۔ وہ ان اشیا کی تعمیر کی کوشش نہیں کرتا جو صدیوں اس کے بعد قائم رہیں۔ وہ درخت لگا کر خود ہی اس کا پھل کھانا چاہتا ہے۔ وہ ان درختوں کو اگانا نہیں چاہتا۔ جن کے لئے صدیوں کی محنت اور شفقت درکار ہو۔ اور جن سے آنیوالی نسلیں عرصہ دراز تک متمتع ہوں

آج کل انسان روز بروز تنگ خیال ہوتا جاتا ہے۔ جسکی وجہ صرف خود غرضی اور نفسانیت ہے، لوگ ایک دوسرے کے ساتھ سلوک کرتے۔ ہمدردی خندہ پیشانی اور ظاہرداری کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ لیکن کسی کو نصب العین کی پروا نہیں ہوتی۔

(نطشے)

خوبصورتی
نصف دنیا
کیلئے
دھوکا ہے
مگر دیگر نصف دنیا یعنی عورتوں (بیویوں) کو فریب
نہیں دیا جاسکتا ۔ کیونکہ وہ اکثر پہلے ہی سے اس امر سے واقف
ہوتی ہیں کہ اوڈین اعضا کو خوبصورت بنانے میں ستو آئکی کیا امداد کرسکتی ہے
اگر آپ بلاناغہ ہر شب پانچ منٹ "اوڈین کریم" لینے میں صرف
کریں تو آپ کا وقت ضائع نہیں ہوگا ۔ کیونکہ رات کا یہ سادہ
مگر ضروری مشغلہ اُس وقت کا بہتر نعم البدل ہو جائیگا ۔
"اوڈین" جلد کو صاف و ملائم کرتی ہے ۔ اسکو تر و تازگی بخشتی ہے ۔
اور دوسرا دن شروع ہونیسے قبل اس کی
زائل شدہ قوت کو بحال کر دیتی ہے ۔
"اوڈین سنو" دن میں جلد کو دھوپ ۔ گرد اور پسینے کے
بد اثرات سے محفوظ رکھے گا
ان دونوں کا تجربہ بشرطیکہ
"اوڈین کریم" کا ہر رات اور "اوڈین سنو" کا ہر دن اگر آپ
تجربہ کرنا چاہتے ہیں و ایک دفعہ ضرور استعمال کیجیے ۔
اوڈین کریم ۔ ہر شب مالش کے ذریعے صاف و پاک کرنے والی ۔ نرماہٹ لانے والی ۔ اور لطافت دینے والی
اوڈین سنو ۔ ہر دن میں استعمال سے جذب ہونے والی کریم ٹھنڈک پہنچانیوالی تسلی بخش اور محافظت کرنے والی ۔
سب دکانداروں سے ملتی ہیں
دی اوڈین کمپنی نمبر ۱۷ پرنسپ اسٹریٹ کلکتہ

ایڈیٹر
تاجور

جائنٹ ایڈیٹر
سجاد حیدر

فہرست مضامین

جلد ۵ | بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء | نمبر ۴

(مطبوعہ ہندوستان پریس ہسپتال روڈ لاہور۔ محمد اسمٰعیل پرنٹر پبلشر نے دفتر ادبی دنیا کشمیر بلڈنگ لاہور سے شائع کیا)

حال و قال

ادبی سفر۔

سالنامے کی اشاعت کے سلسلے میں گزشتہ دو ماہ میں نے ملک کے ادبی خطوں کی سیر میں گزارے۔ اس سفر میں "ادبی دنیا" کی طاقت و عظمت کا صحیح اندازہ مجھے ہوا، ملک کے اہلِ علم، اہلِ تعلیم، اہلِ قلم اور اہل الرائے نے جس خلوص و احترام سے میرا خیر مقدم کیا اُس عزت و سرفرازی کو میں زندگی کی پُرلطف ساعتوں کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھوںگا۔

اس دورِ دوں پرور میں کہ نہ ہماری حکومت ہے، نہ حکومت کی وہ علم پرور نگاہ۔ جب کہ علم و ادب ہمارے بازار کی سب سے غیر ضروری متاع ہے اور قدر شناس و ہنر نواز لوگ سُونے قبرستانوں میں خاموش پڑے ہیں، اِس بدحالی میں بھی ملک کے علمی مرکزوں میں علم و ادب کے خدمت گزاروں کی مشکلات سے ہمدردی رکھنے والوں کی کمی نہیں اور اِس منزل کے مسافروں کے لئے۔

"ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے"

آوارہ روزگاری جہاں جہاں لے گئی میری شامِ غربت کو صبحِ وطن بنانے والے مجھے ہر جگہ ملے۔ ناخواندہ مہمان کی حیثیت ہی کیا؟ مگر ہر منزل پر سیر چشم میزبانوں کی بلند نظری نے "خانہ خانۂ تست" کہہ کر خندہ جبینی سے میرا استقبال کیا۔

ناموں کی تفصیل میرے میزبان پسند نہ کریں گے ورنہ جذبۂ شکرگزاری کا اقتضا یہی تھا کہ نام بنام ہدیۂ سپاس پیش کروں۔ جانتا ہوں کہ اربابِ کرم میرے تشکر و امتنان کے مظاہروں سے بے نیاز ہیں مگر محسوس کرتا ہوں کہ ادائے سپاس و اعترافِ نعمت ایک ممنون انسان کا سب سے ضروری فرض ہے۔

اِس لئے اپنے غریب نواز میزبانوں کے سامنے

"سجدۂ شکر بجا لاتا ہوں"

اہلِ قلم سے تصدیع

سالنامے کے لئے اہلِ قلم نے اپنی گراں مایہ قلمی اعانت کا مجھ سے وعدہ فرمایا تھا، اور میں یہ متاعِ یقین لے کر اُن سے رخصت ہوا تھا کہ لاہور پہنچنے پر بہت سے زریں وعدے مضامین کی صورت میں مجھے متشکل نظر آئیں گے، مگر آج لاہور آئے ہوئے ایک ماہ ہوگیا اور چند گرامی قدر حضرات کے سوا کسی نے ایفائے عہد کی زحمت گوارا نہیں کی۔ حیرت زدہ ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور ہراساں ہوں کہ اب کیا ہوگا؟ سالنامے کی اشاعت کا وقت سیلابِ نشیب کی طرح بڑھا چلا آ رہا ہے اور میرا دل اس طوفانِ بے ساحل کو دیکھ دیکھ کر ڈوبا جا رہا ہے کہ اِس آرزو کا نتیجہ کہیں انفعال ہی نہ ہو۔

خدارا اہلِ قلم اپنے وعدوں کا پاس اور میری ذمہ داری اور ناکامی کی صورت میں عالمگیر رسوائی کا احساس کریں۔

عملۂ ادارہ۔

سالنامے کی تیاری کے سلسلے میں ادبی دنیا کے غیر مقامی اراکینِ ادارہ نے مجھے جو قابلِ قدر امداد دی ہے اُس کے شکریہ سے میں کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

وکیلوں کے فرقہ سے میں بہت بدظن ہوں۔ میری رائے میں ریاضی اور قانون کا مطالعہ انسان کے بلند جذبات کو برباد کر دیتا ہے۔ ایثار، مروّت، ہمدردی، خلوص، بے غرضی قانون کی تعزیرات کے بڑے بڑے جُرم ہیں، مگر حسن برنی اور کنہیا لال کو قدرت نے اس گروہ میں پیدا کر کے اپنے بخل کی تلافی کر دی ہے۔

مولٰنا سید حسن برنی

مولٰنا سید حسن برنی بی اے، ایل ایل بی کی توجہات عالیہ ادبی دنیا کو مسلسل رہینِ منت بنائے ہوئے ہیں۔ ایک نامور اور ہجومِ مقدمات میں گھرے ہوئے وکیل کی مصروفیتوں کا اندازہ کیجئے۔ آپ نے اِن مصروفیتوں اور پھر اپنی اہلیہ محترمہ کی شدید علالت اور اس وجہ سے خانہ داری کی پریشانیوں کے باوجود ادبی دنیا کے کاموں کو برابر جاری رکھا اور اب سالنامے کی ترتیب کے لئے بہت سے اہم اُمور کی انجام دہی اپنے سر لے لی ہے۔

علمی تعاون کے جس جذبۂ رفیع کی بنا پر آپ نے اپنی گراں قدر خدمات

ادبی دنیا کے لئے پیش فرمائی تھیں خدا کا شکر ہے کہ اس میں سرمو فرق نہیں آیا۔

مسٹر کنھیا لال

مسٹر کنھیا لال ایم اے، ایل ایل، بی ایڈووکیٹ الہ آباد بھی ادبی دنیا کو اپنا پرچہ خیال کر کے اس کی بہبودی و بہی خواہی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

اب کے پہلی بار اُن سے الہ آباد میں میری ملاقات ہوئی اور میں اُن کی شریفانہ صفات سے بہت متاثر ہوا۔

آپ ایڈیٹر چاند کی حیثیت سے روشناس خلق ہو چکے ہیں۔ اور اب ایڈیٹر ادبی دنیا کی حیثیت سے میں ان کے تعارف کی عزت حاصل کرتا ہوں۔

عشرت رحمانی

میرے عزیز دوست مولینا عشرت رحمانی ایڈیٹر رسالہ نیرنگ دہلی ایک کامیاب رسالے کے کامیاب ترین ایڈیٹر ہیں۔ ادبی دنیا کی اور خصوصیات کے علاوہ ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اسے سب سے زیادہ اس کے معاصرین پسند کرتے ہیں، اور اپنے اپنے طرفوں سے اس پسندیدگی کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ سید حسن برنی رسالہ کائنات بلند شہر کے رُوح ورواں ہیں۔ مسٹر کنھیا لال ایم اے رسالہ چاند کے ایڈیٹر ہیں۔ مولینا عشرت رحمانی رسالہ نیرنگ دہلی کو ایڈٹ کر رہے ہیں اور یہ سب کے سب حضرات "ادبی دنیا" کے کسی کام کو اپنا کام سمجھ کر سرانجام دیتے ہیں۔

مولینا عشرت رحمانی اپنی اداراتی مصروفیتوں کے ساتھ ادبی دنیا کی مصروفیتوں میں بھی گھرے رہتے ہیں۔ میں جب دہلی جاتا ہوں تو تمام کام چھوڑ کر طلوع آفتاب سے لیکر غروب آفتاب تک میرے ساتھ رہتے ہیں۔ اور ادبی دنیا کی بہت سی انتظامی مصروفیتوں میں میرا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ میں ان کی مسلسل قیمتی امداد کا ہمیشہ طلبگار رہتا ہوں۔ اور آج بڑی مسرت سے ادبی دنیا کے غیر مقامی اسٹاف میں اُن کی شرکت کا اعلان کرتا ہوں۔

مولینا سجاد میرٹھی

مولینا زین العابدین سجاد میرٹھی (مولوی فاضل) رکن ادارۂ غیر مقامی سے مقامی ہو گئے ہیں۔ یعنی میں اُنہیں ادبی دنیا کے جائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے میرٹھ سے اپنے ہمراہ لاہور لے آیا ہوں۔ میں ان کی امتیازی صفات سے واقف ہوں مگر ان کا اظہار چھ ماہ کے بعد کروں گا۔ اور یہ بخل اپنی عادت کے خلاف ارادۃً کر رہا ہوں کیونکہ آج تک جتنے ساتھیوں کو میں اپنے دفتر میں لایا ہوں اُنہیں میری نظر لگ گئی ہے۔ اور قارئین رسالہ سے اُن کے پُرشکوہ تعارف پر مجھے نادم ہونا پڑا ہے۔ سید عابد علی صاحب کے علاوہ کہ اُن کے جانے کے بعد بھی اُن سے صاحب سلامت باقی ہے۔ باقی حضرات نے ادبی کارکنوں سے مجھے طبقۂ وکلا سے بھی زیادہ ڈرا دیا ہے۔ میں بم بازوں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا ان ادیبوں سے پناہ مانگتا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ مولینا سجاد اپنی فطری سعادت کے سبب ان ادبی جرائم پیشوں سے مجھ سے زیادہ متنفر ہیں۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ قارئین ادبی دنیا ان کے علم وفضل سے مستقل طور پر مستفید ہوتے رہینگے۔

مرکزی بک ایجنسی لاہور

میرے کارواں احباب نے ادبی دنیا کے گراں بار نقصانات کے کم کرنے کی صورت یہ نکالی ہے کہ ادبی دنیا کیلئے ایک ایسی علمی بک ایجنسی قائم کی جائے جس میں ملک کے مقتدر مصنفین کی قابلقدر تصانیف اور پبلشروں کی کارآمد مطبوعات کمیشن پر فراہم کی جائیں اور اُن کی فروخت کے وسیع ذرائع جو مجھے حاصل ہیں استعمال کئے جائیں غور وفکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ تجویز بہت مناسب ہے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ مجوزہ بک ایجنسی کے بیش بہا کتابوں کے مصنفوں اور پبلشروں کی قدر افزائی کے علاوہ اردو ادب کے متعلق میرے پروگرام کی تکمیل میں بھی مجھے مدد دیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ملک کے تعلیمی رہنما اور افسران تعلیم عموماً اور صوبۂ پنجاب کے خاص طور پر میری ناچیز علمی خدمات کو محبت وہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ وطلبہ۔ لائبریریوں اور کتبخانوں کے مہتمم ملک کے اہل قلم، اور عام علم دوست مجھ سے اور میرے علمی مشاغل سے اچھی طرح واقف ہیں اور میں اُنہیں اپنی بک ایجنسی سے کتابیں خریدنے پر مجبور کرنے کا حق رکھتا ہوں۔

ادبی دنیا جو اس وقت ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ رہا ہے اور جس کے مطالعہ کرنیوالوں اور خریداروں میں صوبہ کے گورنر والیان ریاست ریاستوں کے وزیر، صوبجاتی حکومتوں کے منسٹر، کونسلوں کے ممبر، ہائی کورٹوں کے جج یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر اور ہر طبقے اور ہر فرقے کے عام علم دوست شامل ہیں۔ اس بک ایجنسی کی کتابوں کے مفصل اور مجمل اشتہارات

مسلسل شائع کریگا۔ اس کے علاوہ میں نے اردو اور انگریزی کے ایک درجن اخبارات و رسائل میں اپنی ایجنسی کے اشتہارات مستقل طور پر شائع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ کئی تنخواہ دار سفری ایجنٹ رکھ رہا ہوں جو ملک کے ہر گوشے میں سفر کر کے بک ایجنسی کی کتابوں کے لئے خریدار مہیا کرینگے وقتاً فوقتاً محکمہائے تعلیم، افسرانِ تعلیم کے علاوہ اسکولوں، کالجوں اور لائبریریوں میں میں خود بھی دورہ کرونگا۔

مختصر یہ کہ اچھی کتابوں کے لئے خریدار بہم پہنچانے کے ذرائع جو مجھے حاصل ہیں میرا خیال ہے اور کسی بک ایجنسی کو میسر نہیں آسکتے۔

اس لئے میں ملک کے مصنفوں اور پبلشروں کو صلائے عام دیتا ہوں۔ کہ وہ میری بک ایجنسی میں جس کا نام "مرکزی بک ایجنسی لاہور" ہے اپنی تصانیف اور مطبوعات کی فہرستیں بھیج دیں اور ہر کتاب کے متعلق کمیشن کی مقدار مقرر کرتے ہوئے اس امر کو پیش نظر رکھیں کہ "مرکزی بک ایجنسی لاہور" کے ذرائع فروخت سب سے زیادہ اور سب سے گراں ہیں۔ اس لئے اس ایجنسی کو دوسری عام ایجنسیوں سے زیادہ کمیشن دینا پڑے گا۔

مجھے امید ہے کہ یہ ایجنسی اس غلط خیال کا ازالہ کر دے گی کہ اچھی کتابوں کے خریدار ملک میں کم ہیں جن مصنفین کی کتابیں الماریوں میں دیمک کی نذر ہو رہی ہیں وہ کمیشن کی مقدار کا فیصلہ کر کے مرکزی بک ایجنسی میں کتابیں بھیجدیں۔ اور یہ اطمینان رکھیں کہ مرکزی بک ایجنسی لاہور میں ہر پبلشر اور ہر مصنف کی کتابوں اور اُن کی فروخت وغیرہ کا حساب آئینے کی طرح رکھا جائے گا۔ ہر کتاب کی فروخت کا روپیہ کمیشن کی رقم کاٹ کر مصنف یا پبلشر کو ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو بھیج دیا جایا کریگا۔ اور ہر مصنف اور پبلشر کو اختیار ہوگا کہ خود یا اپنا آدمی بھیج کر اپنے حسابات کی جانچ پڑتال جب چاہے کرالے۔

خریدارانِ ادبی دنیا سے

ادبی دنیا کے معزز خریداروں سے گذارش ہے کہ وہ اپنے، اپنی مستورات اور اپنے بچوں کے مطالعہ کے لئے جب کوئی کتاب خریدنا چاہیں "مرکزی بک ایجنسی لاہور" کو ایک پوسٹ کارڈ سے مطلع کر دیں۔ اُن کی مطلوبہ کتاب ایجنسی میں ہو یا نہ ہو انہیں مہیا کر کے بھیج دی جائیگی۔

اچھی کتابیں۔

میں اپنی ایجنسی کو "وفادار عاشق" "عاشق معشوق کی چھیڑ چھاڑ" یا صنفی معلومات کے نام سے "دُلھن کانفرنس"، "لذتِ شباب" جیسے کوک شاستروں سے ایمان کی طرح بچاؤنگا۔ اور تلاش و جستجو اور خود مطالعہ کر کے کارآمد، بلند پایہ اور اچھی کتابیں فراہم کرونگا۔ جن کے مطالعہ سے دل کو طمانینت، عقل کو جلا اور دماغ کو روشنی حاصل ہو۔ جنہیں پڑھ کر دنیا اور زندگی کے متعلق ضروری ہدایات اور انمول معلومات حاصل ہوں۔

چھوٹے بچوں، لڑکیوں، لڑکوں اور عورتوں کے لئے علمی استعداد اور قابلیت بڑھانے والی کتابیں مرکزی بک ایجنسی لاہور میں مہیا کی جا رہی ہیں۔

مرکزی بک ایجنسی کے ذریعہ آپ کو بوقتِ ضرورت اپنے شوقِ علمی۔ بچوں اور عورتوں کی تعلیم اور اگر آپ طالبعلم ہیں تو آپ کو انتخابِ مضامین اور دوسرے علمی و تعلیمی اہم معاملات کے متعلق صحیح مشورہ بھی دیا جایا کرے گا۔

کوائفِ تعلیم

اس عنوان کے تحت میں ہر ماہ محکمۂ تعلیم، رفتارِ تعلیم۔ افسرانِ تعلیم اور ضروریاتِ تعلیم پر اظہارِ خیال کیا جایا کرے گا۔

پنجاب کا نیا اسسٹنٹ ڈائرکٹر۔

خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم لے آئی ای ایس انسپکٹر صدر اس لاہور ڈویژن کو عارضی طور پر اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر کیا گیا ہے۔

شیخ صاحب کی حسن کارکردگی، جفاکشی بیدار مغزی اور ہر دلعزیزی کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ آنریبل وزیر تعلیم کا یہ انتخاب "حق بحق دار رسید" کے منشا کو نہیں پورا کرتا۔ ہمیں امید ہے کہ پنجاب کے تمام اساتذہ تعلیمی رہنما، اور تعلیمات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات متفقہ طور پر شیخ نور الٰہی صاحب کے جدید منصب پر حکومت کو مبارکباد اور آنریبل وزیر تعلیم کو داد دیں گے۔

(۲) خان بہادر سید مقبول شاہ صاحب آئی ای ایس انسپکٹر و رنیکولر ایجوکیشن پنجاب اپنی مدت ملازمت پوری کر کے ریٹائر ہو گئے ہیں۔ سید صاحب ایک نیک دل، مرنجاں مرنج، اور بے تعصب انسان کی حیثیت میں صوبے کی تعلیمی خدمات نہایت دیانتداری محنت اور قابلیت سے انجام دیتے رہے۔ آپ نے اپنے طرزِ عمل سے اپنی اچھی شہرت کو آخیر تک قائم رکھا۔

(۳) آپ کی جگہ ایک مستعد، پُرحوصلہ اور نڈر انسپکٹر کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ چودہری محمد حسین صاحب بی لے بی ای ایس سابق

ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس لائل پور کی تعلیمی خدمات سے ملتان ڈویزن کا ہر استاد
اور ہر تعلیمی کارکن واقف ہے۔ آپ کی قوت ارادی مشکلات کے اونچے
انباروں کو پرواز کے ذریعے عبور کر لینے کی عادی ہے۔

راجہ فاضل محمد خاں۔

(۴) خاں صاحب راجہ فاضل محمد خاں صاحب پی ای ایس ملتان ڈویژن
کے انسپکٹر مقرر ہوئے ہیں۔ راجہ صاحب کی بے محابا صاف گوئی ۔
خوشامد سے نفرت ۔ اسی کیلئے جنگ ، سفارشوں سے بیزاری ۔ دیانت کار
یہ صفات تھیں جو انہیں قابلیت ، اہلیت ، جواں کارانہ محنت کاروائی
اور دیرینہ کاری کے باوجود اپنا حق حاصل کرنے سے اب تک روک
رہی تھیں۔ اُنہیں ضد تھی کہ انہیں سیڑھیوں سے بلندی پر پہنچو گا۔ اور ادھر
وقت کی بوقلموں روایات راستے کی منازل ہفت خوان بن رہی تھیں ۔
آخر "ہمت مرداں مدد خدا" کے مطابق یہ رستم عزم و استقلال عام راہوں
کو چھوڑ کر اپنے مقررہ راستوں سے منزل پر پہنچا۔ اب جبکہ راجہ صاحب
نے اپنا حق حاصل کر لیا ہے اُن کا حق دبانے والوں کی شکایت کی بجائے
حق دینے والوں کا شکریہ ادا کرنا مناسب ہوگا۔
آنریبل وزیر تعلیم اس پہلو میں شکریہ کے مستحق ہیں۔

انسپکٹر لاہور ڈویژن

(۵) خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر بنائے
جانے کے بعد ان کے سینیئر ڈپٹی شیخ ظہور الدین صاحب پی ای ایس اپنے
قانونی استحقاق کی بنا پر لاہور ڈویزن کے انسپکٹر بنائے گئے ہیں۔
آپ کی گراں قدر تعلیمی خدمات کا تقاضا یہ تھا کہ آج سے پانچ سال پہلے
آپ ڈویژنل انسپکٹر بنائے جاتے۔ مگر ہر امر کسی وقت سے وابستہ ہوا
کرتا ہے۔ آپ کے اس تقرر کی داد بھی وزیر تعلیم کے حصے میں لکھی تھی۔
اس تقرر اور اس حسن انتخاب پر ہم آنریبل وزیر تعلیم کو مبارکباد پیش کرتے
ہیں۔

مجھے اکثر ہیڈ ماسٹروں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ ملتان اور لاہور
کے ڈویژنوں میں میں نے ہیڈ ماسٹروں کو بے امتیاز مذہب و ملت شیخ
ظہور الدین کا مداح پایا ہے۔ نہایت قابل، تجربہ کار، اور محنتی ہونے کے
ساتھ ایک امتیازی خوبی آپ میں یہ ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ تعلیمی و
انتظامی معاملات کو سلجھانے اور اپنے ماتحت اداروں پر ضبط و نظم قائم
کرنے میں اوروں سے زیادہ قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی قابلِ رشک
انتظامی اہلیت کے حریف بھی قائل ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ محکمہ تعلیم پنجاب کو شیخ صاحب کے متعلق اپنی سفارش
اور آنریبل وزیر تعلیم کو اُس سفارش کے شرف قبولیت عطا کرنے پر کبھی افسوس نہ ہوگا۔

شکایات

(۶) پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے سپرنٹنڈنٹ لالہ ہر دیال صاحب
کے خلاف ایک معاصر نے شکایت کی ہے کہ وہ متعصب ہیں اور مسلمان
مصنفوں کے مفاد کو اپنے ہم مذہب مصنفوں پر تقسیم کر دیتے ہیں۔ اسی
لئے مسلمان مصنفین کو اپنی تصانیف پر شاذ و نادر ہی انعام ملتا ہے۔
ہمیں تعجب ہے کہ اس معاصر کو ٹیکسٹ کمیٹی کے طریقۂ کار سے ذرہ
بھر بھی واقفیت نہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ ٹیکسٹ بک کمیٹی میں جو
کتابیں مصنفین بھیجتے ہیں وہ جس فن کی ہوں اُس فن کے ماہروں کو بھیج دی
جاتی ہیں وہ اُنہیں مطالعہ کر کے اپنی رائیں قلمبند کر کے کمیٹی کو بھیج دیا کرتے
ہیں۔ اُن رایوں کو چھاپ کر ممبران کمیٹی میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ کمیٹی کے
ممبروں کی اکثریت اُن رایوں کے مطابق کتابوں کے لئے انعام تجویز کرتی
ہے اور اُس تجویز پر ڈائرکٹر، وزیر تعلیم اور اخیر میں گورنر کی منظوری ہونے
پر مجوزہ انعام کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔
ان تمام مرحلوں میں سپرنٹنڈنٹ صرف ڈاکخانہ کا کام دیتا ہے،
اُسے کسی کتاب پر نہ رائے دینے کا حق ہے نہ وہ انعام تجویز کرنے کا
مجاز۔ ٹیکسٹ کمیٹی کے ممبر ہی تجویز اور سفارش کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔
سپرنٹنڈنٹ متعصب ہو یا غیر متعصب وہ کسی مصنف کو نہ نفع پہنچا سکتا
ہے نہ نقصان۔ پھر لالہ ہر دیال صاحب تو بے حد نیک دل، دیانتدار،
محتاط، خدا ترس اور علم دوست آدمی ہیں۔ اُن پر تعصب کا الزام بہتان تراشی
بغیر نہیں لگایا جا سکتا۔ ہمیں بعض ممبران سے معلوم ہوا ہے کہ اس سال
پنجابی زبان کی ایک کتاب پر ایک مسلمان مصنف کے لئے انعام تجویز ہوا
ہے، حالانکہ سکھ مصنفین کی پنجابی تصانیف آئی ہوئی تھیں۔
پچھلے سال اردو زبان کی ایک تاریخ پر اُس کتاب کی حیثیت اور مصنف
کی اہلیت سے بہت زیادہ انعام مل چکا ہے۔ یہ مصنف ہندو یا سکھ نہ
تھا۔

(۷) ڈیرہ غازی خاں اور جہلم کے ڈسٹرکٹ انسپکٹروں
کے متعلق بعض معاصرین نے تعصب اور فرقہ داری کا الزام لگایا ہے۔
ہمارے خیال میں یہ انتقامی کاروائی ہے۔ پیر یعقوب شاہ ایم اے
اور مولانا غلام حسین بھٹی پر یہ تہمت حد درجہ کی زیادتی ہے۔ ان حضرات
کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ اول الذکر نہایت صلح کل اور مرنجاں مرنج

آزاد خیال مسلمان ہیں اور ثانی الذکر ایک مذہبی انسان ہیں جنہوں نے مذہب کو اپنے مظالم کے لئے آڑ بنانے کی بجائے اپنے مذہب سے خدا ترسی اور نیک منشی سیکھی ہے۔

صحیح معنی میں مذہبی انسان قدرتی طور پر بے امتیاز قوم و ملت مخلوق خدا کا خدمت گزار ہوا کرتا ہے اور ہم دیانتداری سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولینا غلام حسین بھٹی ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے دیر و حرم کے جھگڑوں میں حصہ لینے کی غلطی نہیں کرتے، اور ان کے پرسنل اسسٹنٹ تو

"پروانہ چراغ حرم و دیر نداند"

ایک عشق مشرب دیدانتی ہیں اور اس لئے کسی سے دشمنی کرنے کے اہل بھی نہیں۔

(۸) ملتان کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے متعلق بہت سی شکایات فراہم ہو چکی ہیں۔ سر جارج اینڈرسن کی رائے بھی اُن کے متعلق اچھی نہ تھی۔ ادبی دنیا چونکہ ایک تعلیمی رسالہ ہے اس لئے وہ جہاں افسرانِ تعلیم پر فرقہ وارانہ الزامات کی سختی سے مدافعت کریگا، وہاں بے خوف ہو کر اُن کی ثابت شدہ زیادتیوں کو بھی وانشگاف طور پر بیان کر کے محکمۂ تعلیم، پبلک اور حکومت کو توجہ دلائے گا۔

ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ملتان کے متعلق بہت مدت سے شکایات کا سلسلہ جاری ہے۔ میں نے ملتان جاکر غیر جانبدارانہ طریقے سے تحقیقات کی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ صاحبِ موصوف اپنے رویّے کو تبدیل کرلیں اور شکایت کرنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ اُن کو شکایات زائل کرنے کا موقعہ دینے سے پہلے اُن کے خلاف کوئی غلط قدم نہ اٹھائیں۔

میرا تو خیال ہے کہ اب یہ شکایات خود بخود رفع ہو جائینگی کیونکہ ملتان ڈویژن میں ایک زبردست انسپکٹر پہنچ گیا ہے، جو اپنے ڈویژن میں کسی کو بھی کسی پر زیادتی کی اجازت نہ دیگا۔

پنجاب یونیورسٹی

(۱) پنجاب یونیورسٹی پر اس نمبر میں بھی کچھ شائع نہ کیا جا سکا۔ مضمون لمبا تھا اور صفحات کم۔ اس لئے اگلے نمبر کے لئے روک لیا گیا۔

(۲) میری غیر موجودگی میں تصحیح کرنے والوں نے اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کی اور پچھلے پرچوں میں بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے فارسی کورس کی عبارتیں بھی صحیح شائع نہ ہو سکیں۔

(۳) اگلے نمبر میں مسٹر محمد شفیع (اورنٹیل کالج) کے مرتبہ "مخا نہٗ عبدالنبی" کے متعلق ایک تحریر شائع کی جائے گی۔ جسے بڑھ کر ہر شخص کو عربی فارسی کے متعلق شفیع صاحب کی قابلیت، اہلیت اور اُسے کورس بنوانے کی رنگین مصلحت سے آگاہی ہو جائے گی۔

تعلیم یافتہ حضرات کے ایک وفد کی ترتیب بھی زیر غور ہے جو ہز ایکسیلنسی گورنر پنجاب، اور آنریبل وزیر تعلیم کی خدمت میں جاکر مطالبہ کرے گا کہ شفیع صاحب کو یونیورسٹی کی فیلوشپ سے معزول کیا جائے کیونکہ انھوں نے ایک ایسی کتاب کو کورس بنانے کا مشورہ دیا جو حضرت پیغمبر اسلام علیہ اسلام اور اُن کے صحابۂ کرام کے متعلق شرمناک بہتانوں پر مشتمل ہے۔

پنڈت برجموہن کیفی دہلوی۔

ہم بڑی مسرت سے اس خوشخبری کا اعلان کرتے ہیں کہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی خدمات عثمانیہ یونیورسٹی نے حاصل کرلی ہیں۔ یہ ہفت زباں اور ہفت فن ادیب اپنی جامعیتِ علوم والسنہ کے سبب اسی اعزاز کا مستحق تھا۔ ہم جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر اور سنڈیکیٹ کے ممبران کو اس موزوں ترین انتخاب پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اس تقرر پر حیدرآباد کے بعض تنگ خیال و کوتاہ نظر اخبارات نے ملکی و غیر ملکی اور ہندو مسلم کا سوال اُٹھا کر اعتراض کرنے شروع کئے ہیں۔

حضرت کیفیؔ کا وطن وہی ہے جو اردو کا زاد و بوم کہلاتا ہے۔ اُن کی مادری زبان اردو، اُن کا خاندان اردو کا خدمت گزار، اُنھوں نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ خدمت اردو میں گزارا۔

پھر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ آخر وہ کونسی کمی ہے جس کی وجہ سے علامہ کیفی جامعہ عثمانیہ میں اردو کے استاد نہیں بن سکتے۔ کیا یہ کمی ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں؟ اور کیا اردو اور اسلام دو ایسی لازم و ملزوم چیزیں ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکیں؟

اگر ذہنیت کی پستی کی یہی حالت ہے اور نظر کی تنگی کی یہی کیفیت ہے تو اردو کا ملکی زبان بننا معلوم!

ہمارے نزدیک عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے لئے علامہ کیفی کا انتخاب نہایت موزوں ہے اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ

"پسلی پھڑک اُٹھی نگہِ انتخاب کی"

تاجور

آئینۂ عالم

افغانستان جدید۔

تازہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ افغانستان کے نئے فرمانروا اعلیٰحضرت نادر شاہ اس کو دنیا کے متمدن ملکوں کے ہم پلہ بنانے میں بڑی سرگرمی کا اظہار کر رہے ہیں۔

اعلیٰحضرت اور ان کے وزرائے کابینہ نے سول اور فوجی مقامات کو ریل کے ذریعے سے ملا کر باربرداری اور آمدورفت میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے ایک ریلوے سکیم کی منظوری عطا فرما دی ہے۔ جو راستہ تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق ریلوے لائن درۂ خیبر کے بالمقابل سرحدِ افغانستان کے قریب کسی مقام سے شروع ہو گی اور جلال آباد ہوتی ہوئی کابل جائے گی۔ کابل سے ایک اور لائن قندھار ہوتی ہوئی برطانی بلوچستان میں کسی مقام پر ختم ہو گی۔ اس ریلوے لائن کی ایک شاخ ہرات جائے گی۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ کل نو سو میل لمبی لائن بچھے گی۔ جو ملک کی حالت کے پیش نظر کافی ہے۔

متعدد اہم سڑکیں زیر تعمیر ہیں معلوم ہوا ہے کہ اعلیٰحضرت کی خواہش ہے کہ خواہ ریلوے کی تعمیر میں مالی انتظامات کی وجہ سے کچھ تاخیر بھی واقع ہو جائے لیکن سڑکوں کی تعمیر کا پروگرام بند نہ ہو۔

امید کی جاتی ہے کہ سڑکوں کی تعمیر اور ریلوے لائن کی تکمیل کے بعد مسافروں کی آمدورفت کے علاوہ متفرق مال مثلاً خشک اور تازہ میوے، قالین۔ شال۔ پارچہ جات، چمڑا کھالیں۔ اور ادنی اشیاء وغیرہ کی باربرداری کی وجہ سے جو اس وقت خچروں اور اونٹوں کے قافلوں کے ذریعے سے عمل میں آتی ہے۔ مالیہ میں کافی اضافہ ہو جائیگا۔ وسط ایشیا خصوصاً ترکستان اور بخارا سے ہمیشہ آمدورفت جاری رہتی ہے۔ جو جدید ریلوے کی کامیابی کا باعث ہو گی۔

وسط ایشیا کا نقشہ ظاہر کرتا ہے کہ افغانستان میں ریلوے بالکل نہیں۔ اس کی سرحدوں پر ہر جانب سے ریلیں آکر ختم ہوتی ہیں۔ اس لئے اگر ایک دفعہ افغانستان میں جہاں تک اس کی جغرافیائی حالت اجازت دے۔ ریلوں کا جال بچھ جائے۔ تو بہت زیادہ ترقی کا موجب ہو گا۔ اور بین الاقوامی تعلقات بہتر طریق پر از سر نو مضبوط ہو جائیں گے۔

علاوہ ازیں ماہرین افغانستان غیر مصافی ہوا بازی کی ایک سکیم پر بھی غور کر رہے ہیں لیکن اس کی کامیابی کا انحصار سرحدی اور مالی مسائل پر ہے۔ فی الحال ہوابازی کے سلسلہ میں صرف اتنی ترقی ہوئی ہے کہ کابل اور ترمیز کے درمیان ہوائی ڈاک کا سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ پیغام رسانی وغیرہ کے کام کو مختلف جدید طریقوں پر ترقی دینے میں حکومتِ افغانستان کا تدبر قابلِ تعریف ہے۔

افغانی افواج کو مغربی نمونہ پر منظم کیا جا رہا ہے۔ اور اس وقت افغانی عساکر اپنی ضرورت کے مطابق توپ خانہ۔ جدید ترین رائفلوں۔ مشین گنوں۔ ہوائی جہازوں ٹینکوں اور جنگی موٹر کاروں سے پورے طور پر مسلح ہیں۔ اس سے قبل فوجی تربیت دینے کے لئے ترک۔ جرمن اور اطالوی افسر ملازم تھے۔ اب صرف جرمن رہ گئے ہیں لیکن فوجی مدارس میں اب پھر ترکی استاد رکھ لئے گئے ہیں جو پہلے بھی یہیں تھے۔ لیکن گذشتہ بدامنی کے دوران میں اپنے ملک کو واپس چلے گئے تھے۔ افغانستان کے شاہی باڈی گارڈ یا "سروش شاہی" جنہیں رسالہ اور پیادہ فوج کے چیدہ چیدہ نوجوانوں میں سے منتخب کیا گیا ہے۔ ماہرین کے خیال میں نہایت اعلیٰ معیار رکھتے ہیں۔ ان کی وردیاں فرانسیسی طرز کی ہیں لیکن سروں پر جرمن طرز کی جنگی ٹوپیاں پہنتے ہیں دوسری افواج کی تربیت میں بھی ترقی ہو رہی ہے۔ لیکن ان کا لباس قریباً وہی ہے جو سابق بادشاہ امان اللہ خاں کے عہد میں تھا لیکن اب فوجی سپاہیوں کو پہلے کی نسبت تنخواہیں زیادہ اور باقاعدگی کے ساتھ ملتی ہیں۔ فوج کی تنظیم بھی از سر نو عمل میں آئی ہے اور افسروں کا سپاہیوں کے ساتھ زیادہ میل جول پیدا کرنے کے لئے ہر افسر کے ماتحت سپاہیوں کی مختصر سی تعداد ہے۔ چنانچہ ایک کرنیل صرف چار سو آدمیوں کی کمان کرتا ہے۔ فوجی بھرتی کا طریقہ مغربی طریق سے بہت مختلف اور وسط ایشیا کی روایات کے مطابق ہے۔

قبیلہ کو خود فوج کے لئے آدمی منتخب کر کے بھیجنے پڑتے ہیں۔ ہر قبیلہ کا سردار دفتر جنگ کا ایجنٹ ہوتا ہے اور جب رنگروٹوں کی ضرورت لاحق

ہوتی ہے، وہ قبیلہ کے لوگوں کا جلسہ منعقد کرتا ہے اور پہلے اپنے لوگوں سے رضا کارانہ خدمات پیش کرنے کو کہتا ہے۔ اگر اس طرح مطلوبہ تعداد پوری نہیں ہوتی تو وہ ہر کنبہ سے مساوی آدمی لیکر پوری کرتا ہے۔ قبیلہ کے سردار پر حکومت سختی کے ساتھ اقتدار رکھتی ہے تاکہ اس طریق میں پہلے کی طرح نقائص پیدا ہو کر فوج کے نظام کی تخریب کا باعث نہ ہوں۔

جہاں تک مالی حالات اجازت دیتے ہیں، تعلیم کو سرگرمی کے ساتھ فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور طریقۂ تعلیم ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ ملاؤں کی مخالفت کا خطرہ نہیں۔ تمام افغانستان میں پرائمری سے لیکر یونیورسٹی کے درجہ تک تعلیم مفت ہے اور فوجی درسگاہوں کے علاوہ تین آرٹ کالج کابل، قندھار اور ہرات میں قائم ہو چکے ہیں۔ کابل میں ایک میڈیکل کالج بھی ہے۔ مختلف طرز کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے اور خصوصاً حکومت کی ملازمت حاصل کرنے والوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کا میدان بہت وسیع ہے۔ اکثر استاد فرانسیسی اور جرمن ہیں۔ غیر ملکی زبانوں کا علم تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ سب سے زیادہ اہم ان قبائل کی ترقی اور نشوونما کا کام ہے جو ملک کے دور افتادہ حصوں میں رہتے ہیں اور جنہیں تہذیب حاضرہ کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یہ کام بھی عمدگی کے ساتھ ہو رہا ہے۔

پرائمری تعلیم، سڑکوں کی تعمیر اور فوجی ملازمت سے ان لوگوں کو بھی تہذیب سے آشنا کیا جا رہا ہے۔ اور اس طرح امن و قانون قائم رکھنے کے لئے ان کی امن طریق پر تربیت ہو رہی ہے۔ ان قبائل میں پہلے بھی اپنی طرز کی تعلیم موجود ہے اور اسی کی بنیادوں پر ان کی مخالفت کے بغیر جدید پرائمری تعلیم بھی رائج کر دی گئی ہے۔

القصہ اعلیٰ حضرت شہریار غازی محمد نادر شاہ اور ان کے وزرائے کابینہ ایک استوار اور ترقی پذیر حکومت کے قیام کے لئے محتاط اور تدریج ترقی کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ اگر اعلیٰ حضرت غازی کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی تو افغانستان ایک اہم بین الاقوامی طاقت اور متمول ملک بن جائے گا۔ جدید افغانستان کے جذبۂ ترقی کا اظہار کھیلوں کی ترویج اور ترقی کی مساعی سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ سال لاس اینجلیز کو اولمپک کھیلوں میں شرکت کے لئے جہاں دنیا بھر کے کھلاڑیوں کا مقابلہ ہوگا۔ افغانستان سے ایک ہاکی کی ٹیم بھیجی جائے اور بعض حلقوں میں اس امر کا تذکرہ بھی ہو رہا ہے کہ افغانستان نے جمعیۃ الاقوام کی رکنیت کی خواہش کا اظہار کیا ہے جس کے متعلق لندن میں گفت و شنید شروع ہو چکی ہے۔ قوم افغان زندگی کے ہر شعبہ میں تیزی کے ساتھ ترقی کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ صرف اس بات کی ضرورت تھی کہ انہیں کوئی ایسا رہنما مل جائے جو ان کی مذہبی اور قومی روایات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کو شاہراہ ترقی پر گامزن کرے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ان کے حقیقی رہنما ہیں۔ اور ان کا دل اپنے وطن کی ترقی کے جذبات سے سرشار ہے۔

ہندوستان کی آبادی میں اضافہ۔

۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ شائع ہو گئی ہے۔ گزشتہ دس سالوں میں ہندوستان کی آبادی میں ۱۰٫۲۶ فیصدی (تقریباً ۱۰ ¼ فیصدی) کا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کی آبادی ۳۱ کروڑ ۰۰ لاکھ تھی۔ اب ۳۵ کروڑ ۵۳ لاکھ ہے۔ مسلمانوں کی آبادی میں ۱۳٫۱ اور ہندوؤں کی آبادی میں ۱۰ فیصدی زیادتی ہوئی ہے۔ برطانوی ہند میں ہندوؤں کی تعداد ۳۵ ۴۴ ۹۳ ۱۷۶ اور مسلمانوں کی ۶۰۰۱۵۵۱۰ ہے۔ ریاستوں میں ۶۱۲۹۱۳۰۰ ہندو اور ۱۰۶۵۸۴۱۸ مسلمان ہیں۔ ریاستوں کی مجموعی آبادی جس میں جملہ اقوام شریک ہیں۔ ۸۱۰۸۰۵۷۱ ہوتی ہے۔

مگر سچی بات یہ ہے کہ محض آبادی کا اضافہ جب کہ ملک تعلیمی حیثیت سے گرا ہوا ہے۔ مالی حیثیت سے گرا ہوا ہے۔ اقتصادی حیثیت سے گرا ہوا ہے۔ کوئی خوشی کی بات نہیں۔ اہلِ نظر کیفیت کو دیکھتے ہیں کمیت کو نہیں دیکھتے۔

پنجاب میں ابتدائی تعلیم۔

پنجاب کی سالانہ تعلیمی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ گزشتہ سال ابتدائی تعلیم کی رفتار میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ اسکولوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ تربیت یافتہ معلمین کا تناسب بھی بڑھا دیا گیا ہے۔ اور لازمی تعلیم کی اشاعت میں بھی توسیع ہوئی ہے۔ اعداد و شمار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب لوئر مڈل اسکولوں کی تعداد ۲۴۲۱ تک اور اپر مڈل اسکولوں کی تعداد ۴۰۷۰ تک پہنچ گئی ہے۔ . . . . لازمی تعلیم کا دائرہ بھی وسیع ہوا ہے اور اب تک ۲۴۴۹ دیہاتی رقبوں میں جبری تعلیم رائج کی جا چکی ہے۔ ہم ابتدائی تعلیم کی اس رفتار ترقی کو بہ نظر اطمینان دیکھتے ہیں، اور آنریبل ملک فیروز خاں نون وزیر تعلیم پنجاب کی خدمت میں ان کی کوششوں کی کامیابی پر

اخبار علمیہ

کوئلہ میں سے پٹرول:۔ ایک برطانوی کیمیا ساز نے کوئلہ کو پٹرول کی صورت میں تبدیل کرنے کا طریقہ دریافت کرکے دنیائے صنعت و تجارت میں تہلکہ ڈالدیا ہے۔ ایک انگریزی کمپنی نے کیمیا ساز مذکور سے کثیر روپیہ صرف کرکے اس دریافت کے حقوق حاصل کرلئے ہیں۔ اور اس نے بڑے پیمانہ پر کوئلہ سے پٹرول حاصل کرنے کا کام شروع کردیا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ کمپنی اوسطاً ایک ہزار ٹن فی ہفتہ پٹرول تیار کرسکے گی۔ یورپ اور امریکہ کے سائنسدان اور تجار اس دریافت کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے پٹرول کے موجودہ نرخ بڑی حد تک گرجائیں گے +

مچھروں کی افادی حیثیت:۔ جدید ترین تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ ملیریا کے مچھروں کا کاٹنا فالج کے مریضوں کے لئے بہت مفید ہے اور ان کا زہر اس مرض کے جراثیم کے لئے پیام فنا ہے۔

چنانچہ ایک مشہور علمی انجمن نے ان مچھروں کو جمع کرنے اور انکی باقاعدہ پرورش کرنے کا بڑے پیمانہ پر انتظام کیا ہے۔ یہ انجمن دنیا کے تمام شفاخانوں کو معمولی قیمت پر مچھر بہم پہنچایا کرے گی تاکہ ان سے فالج کے مریضوں کا انجکشن کیا جائے۔ کیا ملیریا کے مچھروں کی یہ افادی حیثیت اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ خدا نے کوئی چیز بیکار پیدا نہیں کی؟

ظاہر و باطن کا تعلق:۔ علماء فراست کا خیال ہے کہ انسان کے بال اور آنکھوں کے رنگ کو اس کے ڈر اور غصہ کے جذبات سے اور اس کے سر کی ہیئت کو اس کے اخلاق و عادات سے گہرا تعلق ہے۔ ان کا تجربہ ہے کہ زرد بالوں والا انسان بالکل نڈر ہوتا ہے بھورے بالوں والا اس سے کم اور کالے بالوں والا اس سے کم۔

بھوری آنکھوں والا انسان کالی آنکھوں والے کی بہ نسبت زیادہ غصیلا ہوتا ہے اور لمبوترے سر والا چوڑے سر والے کی بہ نسبت زیادہ بدخلق ہوتا ہے۔

غیر مرئی تاروں کی تحقیق:۔ ہمبرگ (جرمنی) کے ادارہ سائنس کے مہتمم، ڈی ویکیوان اب اس فکر میں ہیں کہ جن سیاروں کا وجود مسلم ہے مگر وہ نظر نہیں آتے ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے ایک جدید شعبہ قائم کیا جائے۔ یہ شعبہ حکومت کی سرپرستی میں ہوگا اور اس کے مصارف بھی حکومت کے خزانہ سے ادا کئے جائیںگے۔

اس شعبہ کے لئے کم سے کم ڈھائی سو سائنس کے ماہرین کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ اور اس کا پروگرام حسب ذیل ہوگا۔

(۱) گم شدہ سیاروں کو معلوم کرنا۔

(۲) ان کی ہیئت اور جسامت معلوم کرنا۔

(۳) یہ معلوم کرنا کہ ان میں روشنی کہاں سے آتی ہے۔

(۴) زمین سے ان کا بُعد معلوم کرنا۔

(۵) یہ معلوم کرنا کہ آیا ان میں بستیاں ہیں یا نہیں؟

(۶) اگر یہ معلوم ہوجائے کہ ان میں بستیاں ہیں تو پھر ان میں بسنے والوں سے نامہ و پیام جاری کرنا۔

(۷) ان کے فوٹو لیکر ان کی وضع قطع کے متعلق تفصیلات معلوم کرنا اور پھر انہیں شائع کرنا۔

(۸) ان کی زبان سے واقفیت حاصل کرنا اور پھر دوسرے لوگوں کو اس سے متعارف کرانا۔ اپنی کارگزاری کی تفصیلات سے عوام کو مطلع کرنا۔

نرم پتھر: ممالک متحدہ امریکہ کی علوم طبیعہ کی ایک اکاڈیمی میں ایک محیر العقول پتھر ہے۔ یہ پتھر موم کی طرح نرم ہے اور اسے آسانی کے ساتھ لپیٹا اور کھولا جاسکتا ہے۔ یہ برازیل سے لایا گیا ہے اور آجکل امریکہ کے علماء کی تحقیقات کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قدرت نے اس کی ظاہری خصوصیات کی طرح اس کی باطنی خصوصیات بھی عجیب و غریب بنائی ہونگی۔ وہ انتہائی کوشش صرف کررہے ہیں کہ کسی طرح ان خصوصیات کو بے نقاب کرسکیں کیا یہ پتھر اجتماع اضداد کی ایک محیر العقول مثال نہیں ہے؟ **ادارہ**

جدید الفاظ

بحری تار برقی	CABLEGRAM
کلیسا - گرجا	CHURCH
شاہی سند	CHARTER
مرکزی حکومت	CENTRAL GOVERNMENT
آئینی نظام	CABINET SYSTEM
مسودۂ قانون - بِل	BILL
صیغجاتی مجلس، بورڈ	BOARD
مالی امداد - ایڈ	AID
بدنظمی، نراج - انارکی	ANARCHY
ترمیم	AMENDMENT
صدر - پریزیڈنٹ	PRESIDENT
نائب صدر - وائس پریزیڈنٹ	VICE PRESIDENT
برقیہ، تار، ٹیلی گرام	TELEGRAM
ہنگامی قانون - آرڈی ننس	ORDINANCE
مقالہ افتتاحیہ لیڈنگ آرٹیکل - لیڈر	LEADING ARTICLE
اِداریہ - ایڈیٹوریل	EDITORIAL
شذرات - ایڈیٹوریل نوٹس	EDITORIAL NOTES

تمکین رامپوری

سوال و جواب

س۔ (۱) غالب اور ذوق کے سہروں میں آپ کس کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ چونکہ ذوق نے اُسی وقت لکھا اس لئے ان کا سہرا اچھا ہے۔

(۲) "روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ" اس مصرع کا مطلب کیا ہے اور کس کی روسیاہی مراد ہے؟

رحمت اللہ بی اے (شیلانگ آسام)

ج۔ (۱) فی البدیہہ کہنا سبب ترجیح نہیں ہو سکتا، بلکہ نظم کی لفظی اور معنوی خوبیوں پر اس کی اچھائی برائی کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک غالب کا سہرا بہتر ہے (توضیح ماہِ گذشتہ کی "تنقیدِ شعری" میں ملاحظہ ہو)

(۲) غالب نے سہرے کے مقطع میں شاعرانہ دستور کے موافق فخر کیا تھا جس کو ذوق نے اپنے اوپر اوڑھ لیا اور اپنے سہرے کے آخری شعر میں غالب پر چوٹ کی۔ اس کے بعد غالب نے معذرت کہی جس کا ایک مصرع یہ بھی ہے، مطلب یہ ہے کہ "اگر میں نے کسی پر طعن کیا ہو تو میرا منہ کالا ہو جائے۔" لیکن کنایہ ذوق کی طرف بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ان کا سیاہ رنگ تھا اور وہ غالب پر طعن بھی کر چکے تھے۔

س۔ (۱) "کیمیا" اور "التفات" مذکر استعمال ہوتے ہیں یا مونث؟ سند کا بیان ضروری ہے۔

(۲) عربی قاعدہ سے "طائر" کی جمع "طیُور" (تخفیفِ یاء کے ساتھ) آتی ہے لیکن ذوق مرحوم نے "طیّور" (تشدیدِ یاء کے ساتھ) نظم کیا ہے ؎

کیوں نہیں بولتے صبح کے طیّور
کیا شفق نے کھلا دیا سیندور

(دل لوت۔ لائل پور)

ج (۱) "کیمیا" مونث ہے ؎

تجارت بہتر اسبابِ غنا ہے
تجارت کیا ہی اچھی کیمیا ہے
(حضرت شادؔ)

"التفات" مذکر ہے ؎

بہلا ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات ؛ سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
(غالبؔ)

(۲) شعر کا پہلا مصرعہ یوں ہے ؏

کیوں نہیں بولتے سحر کے طیور

"طیور" اپنے قاعدہ کے موافق (ایک "ی" کے ساتھ) نظم کیا گیا ہے اگر "ی" پر تشدید لگا دی جائے گی تو شعر ناموزوں ہو جائے گا۔

کیوں نہیں بو، لتے سحر، کے طیُور
فَاعِلَاتُن مُفَاعِلُن فِعِلَان
کیا شفق نے، کھلا دیا، سیندور
فَاعِلَاتُن مُفَاعِلُن فَعِلَان

(بحر خفیف مسدس مخبون مشعث مقصور)

س۔ "آخری چہار شنبہ" کی حقیقت کیا ہے؟

عبدالحلیم (بکسر)

ج۔ حضرت رسالتمآب ؐ کے مرض میں جب کمی ہوئی اور وہ شہر کے باہر تفریح کرنے تشریف لے گئے تو اُس دن صفر کا آخری "چہار شنبہ" تھا۔ اس لئے مسلمانوں میں یہ خوشی کا دن سمجھا جاتا ہے۔

مرزا غالب نے بادشاہ ظفر کے غسلِ صحت کی تہنیت میں جو قطعہ کہا ہے اس میں اسی چہار شنبہ کی تلمیح ہے ؎

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کے جام

س۔ "آن" کے کتنے معنے ہیں۔

احمد حسین (ملتان)

ج۔ "آن" کے معنے عربی میں "وقت" کے ہیں۔ "الآن" (قرآن مجید)

فارسی میں کرشمہ اور ادا کے معنے ہیں ؎

شاہد آن نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعتِ آن باش کہ آنے دارد
(حافظ)

اردو میں شان اور وضعداری کے معنے ہیں۔ "شان"

اب بھی قاتل تجھے ارمان سے ہم دیکھتے ہیں
زیرِ خنجر بھی اُسی آن سے ہم دیکھتے ہیں
(امیر مینائی)

"وضعداری" تری آن باقی رہی بات میری

لحد پہ مری پھول کہ آنیوالے

اور عربی و فارسی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

"وقت" تازے تازے چھدے ہوئے وہ کان

جن کے دیکھنے سے لب پہ سسکی ہر آن (مثنوی قلق)

"کرشمہ و ادا" حسن کس کام کا جو آن نہ ہو

کیا وہ معشوق جس میں شان نہ ہو (امیر مینائی)

س۔ "تماشائی" اور "تماش بین" میں کوئی فرق ہے؟

موہن داس (جھانسی)

ج۔ لغوی حیثیت سے کوئی فرق نہیں۔ اصطلاح میں "تماشائی" تماشہ دیکھنے والے کے لئے بولتے ہیں۔ اور "تماش بین"۔ عیاش۔ ہوس کار کو کہتے ہیں۔

س۔ "گوئیاں"، ہمجولی اور سہیلی میں کیا فرق ہے؟

رعنا (بمبئی)

ج۔ "گوئیاں" جو عورت کسی عورت کی دوست ہو۔

"ہمجولی" جو عورت کسی عورت کی ہمسن ہو اور ان میں دوستی بھی ہو۔

"سہیلی" جو عورت کسی عورت کی ہمسن اور دوست ہو یا اُس کی مصاحبت کے لئے نوکر رکھی گئی ہو۔

س۔ "حَسِینہ اور حُسینہ" میں کون صحیح ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ چونکہ "حُسن" سے مشتق ہے اس لئے "حُسینہ" درست ہے۔

شاہ دین (پشاور)

ج۔ حَسِینہ زبر کے ساتھ صحیح ہے۔ پنجاب والے پیش کے ساتھ اسے غلط استعمال کرتے ہیں۔

ہدف اجتہادی

س۔ ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اس شعر کا مطلب بتائیے؟

(سلیم مبتی سکنڈ ماسٹر مڈل اسکول چوہا سیداں شاہ ضلع جہلم)

ج۔ تاتار مغلوں کو کہتے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری کے وسط میں انہوں نے ہلاکو خاں کی زیر سرکردگی دار الخلافہ بغداد پر حملہ کیا اور اسے بالکل تباہ و برباد کر دیا۔ تاتاریوں کے اس حملے سے مسلمانوں کی پانسو سال کی عظیم الشان سلطنت عباسیہ کا چراغ گُل ہو گیا اور خلیفہ اسلام قتل کر دیا گیا۔ مسلمان سمجھتے تھے کہ اب شاید اسلام کی بربادی کے دن آ گئے مگر پھر اسی ہلاکو خاں کے پوتے نے اسلام قبول کر لیا اور اس خاندان نے اسلام کی بڑی بڑی خدمات انجام دیں۔

علامہ کے شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ فرماتے ہیں کہ تاتاریوں کے واقعہ سے یہ بات ظاہر ہے کہ خدا کو جب اسلام کی خدمت لینی منظور ہوتی ہے تو وہ کافروں میں سے اس کی خدمت کرنے والے انتخاب کر لیتا ہے۔

س۔ (۱) انگریزی زبان بولنے والے زیادہ ہیں یا فرانسیسی زبان؟

(۲) آیا کسی زبان کی وسعت و عدم وسعت کا تعلق اس کی حکومت کے قوت و ضعف کے ساتھ ہے یا نہیں؟

(عبد الحمید۔ پٹنہ)

ج۔ (۱) انگریزی زبان بولنے والے زیادہ ہیں۔ اس وقت دنیا میں ۲۰۰ ملین انسان انگریزی بولتے ہیں۔ ان میں سے ۱۲۱ ملین صرف ولایات متحدہ امریکہ کے انگریزی بولنے والے ہیں۔ حالانکہ فرانسیسی بولنے والے صرف ۵۰ ملین ہیں۔

(۲) بیشک حکومت اور زبان کا تعلق بڑا گہرا ہے۔ کسی قوم کا حاکمانہ اقتدار جتنا زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کی زبان کا اثر زیادہ وسیع ہوتا ہے اور جسقدر کسی قوم کی سلطنت کمزور ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اس کی زبان گرتی جاتی ہے۔ انگریزی زبان کی موجودہ وسعت کا راز بھی برطانوی حکومت کی جہاں گیری میں مضمر ہے۔

لیکن بعض اوقات اس کے خلاف بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ لاطینی زبان رومن حکومت کے مٹنے کے بعد بھی عرصہ دراز تک دنیا کی سب سے زیادہ زندہ زبان بنی رہی اور اسی طرح عربی بھی عربوں کے سیاسی اقتدار کے فنا ہو جانے کے بعد بھی دنیا کی مختلف قوموں کی زبانوں پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ ان کا سیاسی اقتدار ختم ہو چکا تھا مگر مذہبی اقتدار باقی تھا۔

س۔ لفظ جاجم صحیح ہے یا جازم؟

(دکانتا پرشاد سنٹرل ہائی اسکول رہتک)

ج۔ صحیح لفظ جاجم ہے۔

ادارہ

تصحیح

اَہْل

اکثر تعلیم یافتہ اصحاب اور بعض اخبار نویس "لاہور والوں" اور "دہلی والوں" کے معنی میں "اہالیانِ لاہور" اور "اہالیانِ دہلی" استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔

صحیح لفظ "اہلِ لاہور" اور "اہلِ دہلی" ہے

اَہل عربی لفظ ہے اور اس کے کئی معنی ہیں جن میں سے ایک "صاحب" اور "والا" بھی ہیں جب اہل ان معنی میں استعمال ہو تو وہ جمع کے لئے مخصوص ہے، اس کی جمع بنانے کی ضرورت نہیں۔ اور جب دوسرے معنوں میں استعمال ہو تو اس کی جمع "اہالی" آتی ہے۔ اہالی میں جو خود جمع ہے الف نون بڑھا کر اس کی فارسی قاعدہ سے جمع بنانا پھر بھی غلط ہوگا۔ لہذا

آپ ہمیشہ "اہلِ لاہور" اور "اہلِ دہلی" لکھیں

ادارہ

تنقیدِ شعری

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں! غالبؔ

معنی آفرینی اور جدّت طرازی غالبؔ مرحوم کی خصوصیات ہیں۔ اُس نے اپنی غزلوں میں جہاں ایک شریف عاشق کے غیور تیور اور ایک عفیف محبوب کی مؤدب شوخیاں، خود ساختہ اسلوب اور بے ساختہ زبان میں دکھائی ہیں وہاں حکمت اور فلسفے کے کانٹوں کو بھی شاعری کے پھولوں میں بنیدھ کر اچھے اچھے گلدستے تیار کئے ہیں! زیب عنوان شعر اس کی ایک مثال ہے۔

کھاد حیوانی ہو یا نباتی درختوں کی غذا ہے۔ اور سورج کی گرمی سے خاکی اجزا ان میں تحلیل ہو کر جڑوں کے ذریعے سے درختوں میں سرایت کر جاتی ہے۔ اور اُن کا جزوِ جسم بن کر پھول اور پھل کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اس مسئلے کو سعدیؒ نے اس طرح نظم کیا ہے۔

اجزائے خاکِ مُردہ بہ تشریفِ آفتاب
بُستان و میوہ و چمن و لالہ وزار کرد

یعنی فطرت نے مردہ چیزوں کو سُورج کی مدد سے کھاد بنا کر پھول اور پھل کی شکل میں تبدیل کر دیا!

غالبؔ مرحوم نے طبعیات کے اس مسلّم ظریفانہ اصول کو شعر کے نازک قالب میں ڈھال کر اس کے بھیانک اور جلادی تیور بالکل بدل دیئے! اور پہلے مصرعے میں سب کہاں، اور کچھ کے رقت آفرین ابہام کو دوسرے مصرعے میں کیا، کے استعجاب سے مِلا کر تخیّل کی ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا! کہتا ہے کہ یہ لالہ و گل جو تمہاری جنتِ نگاہ بنے ہوئے ہیں اُنہیں چند صورتوں کی خاک سے بنے ہیں جو دستبردِ ایام ہو گئیں! ہائے، سنو کہ وہ کیا صورتیں ہونگی جو بگڑ کر لالہ و گلُ ہیں!

سعدیؒ نے چونکہ علمی حیثیت سے اس مسئلے کو پیش کیا ہے اس لئے نفسیاتی پہلو کا چنداں لحاظ نہ کیا اور "میوہ" کا دل گداز لفظ بھی ذکر کر دیا! میوہ جو ایک حیوان کی کھاد سے بنا ہے۔ اُسے ایک حیوان کھا جاتا ہے اور وہ جس طرح پہلے نباتات کا جزو بدن بنا تھا اسی طرح اب ایک حیوان کی غذا بن کر اس کا جزو بدن ہو جاتا ہے! بتائیے کہ انسان کی مردم خوری اور نیچر کی ہم جنس خورانی کا مظاہرہ اس سے بڑھ کر عمل میں آ سکتا ہے؟!

غالبؔ کی رقیق طبیعت اور شعری لطافت نیچر کی اس قساوت کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اُس نے صرف لالہ و گل تک اپنے بیان کو محدود رکھا۔ اور ایسے میوہ کے چٹخارے سے محترز رہا جو انسان کے گوشت پوست سے بنا ہے۔ کیونکہ وہ فلسفے کی یبوست کو شاعری کی طراوت میں گوندھ رہا ہے اور دماغ پرور فیلسوف کی باتیں دل نواز شاعر کی زبان سے سنا رہا ہے!

تمکین رامپوری

بیوہ کی نذر

پَو پھٹی، اِک شور برپا ہو گیا — جاگ اُٹھی کائناتِ خوابگیں
عشقِ محزوں ہو گیا شوریدہ سر — لیگئی شب دُورِ اشکِ شبنمیں
سازِ دل صرفِ نوا سنجی ہوا — کھو گئی ئے میں فغانِ آتشیں
ہو گئے سب یک بیک نغمہ سرا — کوہساروں اور درختوں کے مکیں
گُل نے سینہ چاک کر کے رکھدیا — بلبلیں مصروفِ نغمہ ہو گئیں
ننھی کلیوں نے نمائش کیلئے — دی اُلٹ اپنی نقابِ عنبریں
ہر شگوفے کی حیا پرور چٹک — بن گئی موجِ ترنّم کی امیں
موجِ گستاخِ صبا کی چھیڑ پر — آبِ ساکن ہوگیا چین بر جبیں
ذرّہ ذرّہ ہوگیا آفاق کا؛ — چشمہ زارِ نغمہ ہائے دلنشیں
کوہ پیمازمزموں سے گونج اُٹھی — آسمانوں کی فضائے نیلمیں
آہ، لیکن میرے بربط کو ملا — ایک نالہ دردزا، غم آفریں

نذر کرنے میں اسی کو لائی ہوں
موت کے ماتے اجگانے آئی ہوں

اختر انصاری

پیسطالزی اور طریقۂ تعلیم

تعلیم کے جدید طریقوں کا معلم اوّل، جان ہنرک پیسطالزی - سوئٹزرلینڈ کا ایک دولتمند مصلح اور ادیب تھا۔ اُس نے اپنی لاکھوں روپے کی جائداد خیراتی کاموں میں صرف کر دی تھی، جس کا بیشتر حصہ مفلس و نادار بچوں کی تعلیم پر خرچ ہوا تھا۔

جوانی کے عالم میں نوعِ انسان کی خدمت کا جذبہ اُسے ہر وقت بے چین رکھتا تھا۔ اور وہ اپنے گرد و پیش کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ وقت کی سب سے اہم ضرورت تعلیم ہے، اور خصوصاً نادار و مفلس بچوں کی تعلیم، کچھ عرصہ تک وہ اپنے دیہاتی اسکول میں تجربے حاصل کرتا رہا اور پینتیس ۳۵ سال کی عمر میں اُس نے اپنی کہانی ...... (لیونارڈ اور گرٹروڈ) Leonhard and Gertrude شائع کی۔ اس میں اُس نے بچوں کو تعلیم دینے کے بہت سے طریقے لکھے، اس کتاب سے اس کی شہرت دُور دُور پھیل گئی۔ اور آہستہ آہستہ اُسے ایک ممتاز ماہرِ تعلیم تسلیم کر لیا گیا۔ آخر ترپن ۵۳ سال کی عمر میں پیسطالزی نے اپنے مجرب اصول کے مطابق "برگڈاف" میں ایک مدرسہ قائم کیا، جسے کچھ عرصہ بعد جھیل نیوچیٹل کے کنارے وردم میں منتقل کر دیا گیا۔ بڑے بڑے معلمین کے علاوہ اسی جگہ فروبل نے اُس سے تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ وہی فریڈرک ولیم فروبل تھا۔ جس نے پیسطالزی کے مدرسہ سے تحصیلِ علم کے بعد کنڈرگارٹن کا مشہور طریقۂ تعلیم ایجاد کیا۔

وردم کے مدرسہ میں پیسطالزی اُناسی ۷۹ برس کی عمر تک اپنے تعلیمی اصولوں کی اشاعت کرتا رہا۔ ۱۸۲۵ء میں وہ ان مشاغل سے کنارہ کش ہو کر اپنے گاؤں نیوہاف میں چلا گیا۔ جہاں اُس نے "نوخیز دماغوں کے مخفی خزانوں کی تلاش کیلئے" پہلے پہل تجربے حاصل کئے تھے۔ یہاں وہ صرف دو سال جیا۔ اور ۱۸۲۷ء میں اکیاسی ۸۱ برس کی عمر میں مر گیا۔

پیسطالزی نے اپنے انگریز دوست، جے۔ پی۔ گریوز، کے نام بہت سے خط لکھے تھے جن میں اُس نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے ابتدائی اصول مختصراً بیان کئے تھے۔ ہم اُس کے انیسویں ۱۹ مکتوب کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ اہلِ نظر دیکھیں گے کہ اس میں پیسطالزی نے ایسی منزل کا نشان بتا دیا ہے، جہاں تک پہنچنے کیلئے یورپ اور امریکہ کے ماہرین تعلیمات نے راستوں کی تلاش ابھی شروع ہی کی ہے۔ ہندوستان نے تو اب تک تقلیدِ مغرب کا پہلا دَور ہی ختم نہیں کیا۔ اس کا ابھی ان راستوں پر گامزن ہونا کیسا!

۴ر اپریل ۱۸۱۹ء

میرے پیارے گریوز!

نوخیز بچے کے ذہنی ارتقاء کے لئے میں جو دوسرا ابتدائی قاعدہ بچے کی والدہ کو سکھاؤنگا یہ ہے:-

"بچے کو محض اس قابل نہ بناؤ کہ وہ تمہاری سکھائی ہوئی باتوں کی نقل کر سکے۔ بلکہ ذہنی تعلیم و تہذیب میں اُسے خود محرک بننے دو۔"

اِس سے میرا مطلب یہ ہے کہ بچے کی ماں یہ بات ذہن نشین کر لے کہ اس کا بچہ نہ صرف چند خیالات اور مسلمہ حقیقتوں پر توجہ کرنے اور انہیں یاد رکھنے کی اہلیت رکھتا ہے بلکہ دوسروں کے خیالات سے بالکل آزاد، اُس کے ننھے دماغ میں غور و خوض کا مادہ بھی موجود ہوتا ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ ایک بچے کو سبق پڑھنا اور لکھنا، اور یاد کرنا، اور دہرانا سکھا دیا جائے، لیکن اس سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ بچے کو غور کرنا سکھایا جائے۔ ہم دوسروں کی رائے کو اپنے فائدے کیلئے بہترین طریق پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اور ہمارے لئے ان آراء سے آگاہ رہنا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم اوروں کے لئے بہت زیادہ کار آمد اسی وقت بن سکتے ہیں۔ اور ہمارا شمار سوسائٹی کے قابلقدر افراد میں اسی حالت میں ہو سکتا ہے جب ہم خود اپنی ذہنی قوتوں سے کام لیں، ہم خود اپنے تجسس اور تحقیق سے نتیجے نکالیں، اور ان نظریوں کو عملی شکل دیں، جنہیں ہم بجا طور پر اپنی "ذہنی املاک" کہتے ہیں۔ میں اس وقت اُن اہم خیالات کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو وقتاً فوقتاً لوگوں کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اور جن سے علم و فن کو ترقی ہوتی ہے یا نوعِ انسانی کو ایک عمومی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ میں اس ذہنی ملک کا ذکر کر رہا ہوں جسے ہر شخص، حتٰے کہ زندگی کے ادنیٰ ترین طبقہ

کا ایک کمزور ترین فرد بھی حاصل کرسکتا ہے۔ میں "غور و خوض کی عادت" کے متعلق کہہ رہا ہوں۔ جو ہر قسم کے حالات میں بے پروائی اور غیر ذمہ دارانہ افعال کے مقابلہ میں ایک زبردست محافظ ہے۔ اور جو دماغ میں آنے والی ہر بات کو دور رس نگاہوں سے دیکھنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے غور و تامل کی اس عادت میں جہالت کی خود فراموشی اور غرور، یا "تھوڑے سے علم" کے چھچھورے پن کو ہرگز دخل نہیں ہوتا۔ یہ عادت ایک آدمی کو سکھاتی ہے کہ وہ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اپنی کم علمی کو تسلیم کرلے، لیکن ایمانداری کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھ لیتا ہے کہ جو تھوڑا علم اُس نے حاصل کیا ہے، اُسے اس پر پورا عبور ہے۔

اگر کسی بچے کی ماں مجھ سے ایسے مضامین کے متعلق پوچھے جو بچے کی قوتِ فکر کے ارتقا میں مدد دے سکتے ہوں۔ تو میں اسے جواب دونگا کہ ہر مضمون پڑھایا جاسکتا ہے۔ لیکن وہ اس طریقے سے پڑھایا جائے کہ بچے کی ذہنی قوتوں پر خواہ مخواہ بوجھ ثابت نہ ہو۔ تعلیم و تدریس کا ایک بہت بڑا فن یہ ہے کہ ایک حقیقت تو دنیا میں کوئی مضمون اسقدر خشک نہیں ہے جسے ایک آزمودہ کار معلم اپنے تعلیم کے طریقوں سے بچوں کے لئے دلچسپ نہ بنا سکے۔ ایک بچے کے لئے ہر چیز نئی ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جدت کا طلسم جلد ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن بچے میں اگر پختہ سال باریک بینوں کی سی دقتِ نظر نہیں ہوتی تو کم از کم بحث و مباحثہ کے لئے طفلانہ بے صبری اور زبردست جوش تو ضرور ہوتا ہے اور اس طرح معلم کا کام بڑی حد تک آسان ہوجاتا ہے۔ وہ تعلیم و تدریس کے سادہ اجزا کو ایک مجموعہ میں مرتب کرسکتا ہے جس سے مضمون میں مختلف دلچسپیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ بچے کی توجہ کبھی نہیں ہٹتی۔

اگر میں یہ کہتا ہوں کہ اس مقصد کیلئے ہر مضمون کام آسکتا ہے۔ تو اسے بالکل صحیح سمجھنا چاہئے۔ نہ صرف بچے کی زندگی، اُس کی تفریح کی باتوں اور اس کے والدین، دوستوں اور ہمجولیوں کے تعلقات میں سے، تمہیں کوئی ایسا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ نہ ملیگا، بلکہ حقیقتاً بچے کی توجہ کو جذب کرنے والی کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ (خواہ وہ فطرت کے بیش بہا خزانوں میں سے ہو یا زندگی کی مصروفیتوں میں سے)، جو بچے کیلئے سبق کا ایسا مضمون مہیا نہ کرسکتی ہو جس سے کچھ مفید علم حاصل ہوسکے، اور جس سے خصوصاً، بچے کو اپنے مشاہدات پر غور کرنے اور پھر اپنے خیالات ظاہر کرنے کا خوگر نہ بنایا جاسکے۔

اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ بچے کے سامنے کوئی تقریر کی جائے بلکہ اپنی تعلیم کے سبق بچے کے ساتھ ایک دلچسپ مکالمہ کی صورت میں پیش کئے جائیں۔ ایک لمبی چوڑی تقریر، اس کے الفاظ خواہ کتنے ہی عام فہم کیوں نہ ہوں۔ بچے کے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ اُسے موقع دینا چاہیئے کہ وہ اپنے شکوک بھی تمہارے سامنے ظاہر کرے۔ ایک مضمون کا الف سے لیکر یاء تک پڑھا کر ختم کردینا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اس مضمون کے متعلق بچے سے سوالات کرنے چاہئیں اُسے ان کا صحیح جواب سوچنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ اور پھر بچے سے سوالات کرائے جائیں اور معلم اچھی اچھی چیزوں کی مثالیں دیکر اس کے شکوک رفع کرے۔ یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔ کہ ہم ایک بچے کی طفلانہ سیرت اور بے چین طبیعت سے یہ توقع رکھیں کہ وہ کسی طول طویل توضیح سے بالکل مردہ ہوجاتی ہے بلکہ ایسے سوالات کرنے سے وہ اپنے مضمون میں بہت زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔

یہ سوالات چھوٹے چھوٹے، واضح، اور قابلِ فہم ہونے چاہئیں صرف یہی نہ ہو کہ بچے کو اُسی ایک بات کا انہی الفاظ میں یا کسی اور ترتیب سے اعادہ کرنا پڑے، جو تھوڑی دیر پہلے وہ سُن چکا ہو۔ یہ سوال اسقدر دلچسپ ہوں کہ بچے کا دماغ خود بخود ان باتوں کو سمجھ لینے کا محرک ہو کہ اس کے سامنے کیا ہے؟ وہ کیا کچھ سیکھ چکا ہے؟ اور وہ اپنے تھوڑے سے علمی ذخیرے کو ان باتوں کے جواب دینے کے لئے کیسے استعمال کرسکتا ہے؟ اُسے ایک چیز کا کوئی وصف بتا دو اور پھر دوسری چیزوں میں یہی وصف اُسے خود تلاش کرنے کے لئے کہو۔ اس کو دکھا دو کہ گیند کی شکل "گول" کہتے ہیں۔ اس کے بعد اگر تم اُس سے ایسی چیزوں کے متعلق۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سوال کروگے جو اُسی شکل کی ہوں۔ تو تم نے اُس کے ذہن اور ادراک کو صحیح رستے پر لگادیا ہے۔ اور اس طرح ایک تو بچے کو غور سے سُننے اور پھر اس بات کو وقت پر یاد کرنے کی عادت ہوگی۔ اور دوسرے غور سے دیکھنے اور اُس پر سوچنے کا شوق ہوگا۔

حبیب اللہ خاں
آفتاب احمد خاں

یعنی طبعی مناظر اور کیف پرور راگ راگنیوں اور معنوی حسن یعنی حکمت، علم، اور فضیلت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ نہایت پختگی کے ساتھ یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ محسوسی یا ظاہری جمال میں جو کمی یا عیب نظر آتا ہے وہ مادہ کی وجہ سے نہیں ہے۔ اِس لئے کہ مادہ اُس کے نزدیک غیر حساس اور جامد ہے۔ اس میں زندگی کا شائبہ تک نہیں۔ وہ کسی طرح بھی باعثِ نقص نہیں ہوسکتا۔ اُس کے نزدیک تناسب اجزا بھی عیب کا باعث نہیں۔ وہ ہر چیز میں ایک خاص "معنی" کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اسی معنی یا روح کو چیزوں کے حسن اور اُن کے قبح کا سبب قریب بتاتا ہے۔ معنی یا روح زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اگر یہ چشمہ کسی مادی شے کے اجزا میں داخل ہوجاتا ہے، تو اُسے، دیکھنے والوں کی نظروں کے سامنے، حسن کے لباس میں پیش کرتا ہے۔ حسن وجمال وہیں جلوہ گری کرتے ہیں۔ جہاں زندگی اور وحدت ہوتی ہے۔ معنی یا روح ان دونوں کا سرچشمہ ہے۔ اِس لئے جہاں معنی نہیں ہوتے وہاں جمال بھی مفقود ہوتا ہے۔

بلوطینوس نے مثل اعلیٰ تک پہنچنے کے طریقے بھی متعین کر دئے ہیں۔ مثل اعلیٰ ظاہری اور باطنی محاسن کے مجموعہ کا نام ہے، وہ اِس مجموعہ کو کبھی کبھی حکمت کا ہم معنی بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صرف تین اشخاص مثل اعلیٰ تک پہنچ سکتے ہیں۔ ایک موسیقی جاننے والا، دوسرا عاشق، تیسرا فلسفی۔ موسیقی جاننے والا آوازوں کے حسن یا اُن کی موزونیت سے ترقی کرکے اُس بلند حسن تک پہنچ جاتا ہے جو روشنی کی طرح عقل کے ذریعہ سمجھی جانے والی چیزوں میں پیدا ہوا ہے۔ عاشق دنیا کی ہر اچھی سے اچھی چیز سے آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ ایسی روحانی محبت کی طرف قدم بڑھاتا رہتا ہے جسے مادہ سے کسی قسم کا بھی تعلق نہیں فلسفی ہر لحظہ اپنے نفس کے سدھارنے اور اس کے پاک کرنے میں مصروف رہتا ہے، اور آخر میں جمال مطلق تک پہنچ جاتا ہے۔ جس طرح آفتاب کی روشنی میں ستارے جھلملا جھلملا کر نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔ فہم، خلق اور جمال ان تین محاسن کے مجموعہ کو خدا کہتے ہیں۔ اور فلسفہ میں ان تین صفات میں سے کسی ایک صفت کو حاصل کر لینے کی کوشش کیجاتی ہے۔ بلوطینوس کہتا ہے کہ ان صفات کو حاصل کرنے کا ایک اور صرف ایک طریق ہے، یعنی جمال کی حقیقت تک پہنچنا اور بیخود ہوجانا۔

مستم کن آنچناں کہ ندانم زبیخودی　　در عرصۂ خیال کہ آمد کدام رفت

بلوطینوس کے اخلاقیات ہمارے اخلاقیات سے بالکل جدا ہیں وہ ہماری طرح یہ نہیں کہتا کہ ہر انسان کو مجبور ہو کر ہر اچھے فعل کو کرنا چاہئے۔ اور ہر بُرے کام سے مجتنب رہنا چاہئے۔ اُس کے نزدیک انسان اپنے فعل اور عمل میں پورے طور پر آزاد ہے۔ اُسے صرف مثل اعلیٰ تک پہنچنا ہے، اور ظاہر ہے کہ مثل اعلیٰ تک پہنچنے کی راہیں مختلف ہیں۔ ایک شخص ان تمام مختلف راہوں میں سے صرف اُس ایک راہ کے اختیار کر لینے پر مجبور ہے، جو اس کی طبیعت، سرشت، اور مخصوص حالات سے مناسبت رکھتی ہو۔

بلوطینوس کے فلسفہ کو خود اُس کی زندگی میں بہت کچھ فروغ حاصل ہوا، "گرا کو سکی" کہتا ہے کہ ایک طویل مدت تک بلوطینوس کے فلسفہ نے ارسطو اور افلاطون کو گمنامی کے گوشہ میں ڈالے رکھا۔ اور ایک زمانہ میں یہ اس طور پر لوگوں کے دلوں پر چھا گیا کہ اس کے مقابلہ میں "نصرانیت" کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ عام طور پر ممبروں اور پلیٹ فارموں پر اس کے اصول کی سچائی اور خوبی بیان کی جانے لگی۔ اور نصرانیت کے مسلمہ اصول کی دھجیاں اُڑائی جانے لگیں۔ یہ چیز حیرت سے خالی نہیں کہ نصرانیت کے مبلغوں اور پیروؤں نے بھی بلوطینوس اور اس کے فلسفہ کو نظرِ وقعت دیکھا۔ اور اپنے عقائد کی اشاعت میں بہت کچھ اس سے مدد لی۔ سینٹ اگسٹینوس نے "مظاہر شر" سے بحث کرتے ہوئے بلوطینوس کی تحلیلات پر اعتماد کیا ہے۔ اور اکثر و بیشتر اُنہی دلائل کو بیان کیا ہے جو بلوطینوس کے زرخیز دماغ کی پیداوار ہیں۔

عرب کے دقیق فلسفہ نے بھی بلوطینوس سے خوشہ چینی کی ہے۔ مصر کا ایک بہت بڑا فاضل لکھتا ہے کہ بلوطینوس کے فلسفہ نے تنہا عربی ممالک ہی پر اثر نہیں ڈالا۔ بلکہ یہ دلوں میں گھر کر جانے والا فلسفہ عربوں کے ساتھ ان دور دراز شہروں اور ملکوں میں بھی گیا جہاں عرب فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے۔ ہندوستان کا فلسفہ، عربوں ہی کے واسطہ سے بلوطینوس کے خیالات اور اُس کی تعلیمات سے سیراب ہوا ہے۔

جدید مغربی فلسفہ بھی، اس باب میں، قدیم فلسفہ سے پیچھے نہیں رہا ہے۔ اس روشن فلسفہ نے اپنے اصول کے بُرے بھلے چمن کی آبیاری بلوطینوس کے صاف وشفاف چشمہ ہی سے کی ہے۔ اور جائے حیرت ہے کہ جدید فلسفہ کے علمبرداروں کو اس کا اعتراف بھی ہے۔" برحسین

۱؎ ملاحظہ فرمایئے الہلال اپریل صفحہ ۸۹۸

جو ہمارے زمانہ کے تمام فلاسفروں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اور چوٹی کے فلسفیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کراکوسکی کے نزدیک ملوطینوس ہی کا شرمندۂ احسان ہے۔ برجسن کے فلسفہ کی بنیاد بصیرت پر قائم ہے۔ اور فلسفہ جمال، جس کا دھندلا سا خاکہ سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے، تمامتر داخلی یا اندرونی تامل پر موقوف ہے۔ ظاہر ہے کہ بصیرت اور اندرونی تامل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں خیال ایک ہی نقطہ پر جمع ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف اتنا ہے کہ برجسن حوادث اور موجودات کے دریافت کرنے میں بصیرت سے کام لیتا ہے، اور ملوطینوس مثل اعلیٰ یا اللہ کی معرفت میں اندرونی تامل پر اعتماد کرتا ہے۔ اور بہت ظاہر ہے کہ یہ کچھ زیادہ تفاوت نہیں ہے۔

سیّد شوکت علی سبزواری

غزل

ہو رہے ہیں عہد و پیماں کچھ نیاز و ناز میں
دل کا محسنؔ اب خدا حافظ ہے بزمِ راز میں

انتہا بیتاب ہو کر آ گئی آغاز میں
سر کا جھکنا تھا کہ دل پہنچا حریمِ ناز میں

دل میں کچھ ہے اور زباں پر کچھ کہاں سے ہو اثر
ساز ہم آہنگ ہوں تو سوز ہو آواز میں

فرقِ ناقوس و اذاں نقصِ سماعت ہی تو ہے
مَیں تو سنتا ہوں وہی آواز ہر آواز میں

کیفِ مے یکساں ہے لیکن ظرف وجہِ اختلاف
بیقراری دل میں ہے شوخی ہے چشمِ ناز میں

کائناتِ خفتہ میں ہے شانِ بیداری ہنوز
کارکن ہے فطرتِ خاموش ہر انداز میں

ہاں سُنا اے مطربِ غم نغمہ ہائے سرمدی
عشرتِ محسنؔ ہے پنہاں بس اسی آواز میں

محسنؔ امرتسری

رموزِ کائنات

میری کوریلی دورِ جدید کے مشہور مصنفین کی صفِ اوّل میں کھڑے ہونے کی لائق ہے۔ اس کی سب سے پہلی تصنیف جس کے ایک حصہ کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔ "افسانۂ کون و مکاں" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مصنفہ نے ایک برقی شعاع کا نظریہ ارادتاً افسانہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ تاکہ دلچسپی سے مطالعہ کیا جائے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس زمانہ میں جبکہ مغربی ممالک میں مادہ پرستی کا زور ہے۔ اس کی کتاب محض علمی صورت میں مقبولِ عام نہیں ہوسکتی۔

افسانہ کے دو چیف کیریکٹرز خود مصنفہ اور ہیلیوباس ہیں، جو میری کوریلی کے بیان کے مطابق کوئی فرضی ہستی نہیں ہے۔ اس غیر معروف عالم نے بارہ قسم کے عرق تیار کئے ہیں۔ جن کے ذریعہ وہ عجیب محیر العقل کام انجام دلیکتا ہے۔ وہ ایک عرق میری کوریلی کو پلاتا ہے، جس کے اثر سے اس کی روح جسمِ خاکی سے نکل کر آسمان پر پہنچ جاتی ہے، اور ہیلیوباس کے روحانی راہنما "آزل" کی معیت میں تمام سیاروں کی سیر کرتی ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اس نے ایک چھوٹا جام میری طرف بڑھایا، جو ایک چمکدار اور سیماب صفت مائع سے لبریز تھا۔ وہ اس نے ایک بلوری صراحی میں سے انڈیلا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میری ہمت نے مجھے خیرباد کہدیا۔ اور خون میری رگوں میں برف کی مانند سرد ہوگیا۔ پھر مجھے اپنی بہادری کا خیال آیا جس پر میں ناز کرتی تھی۔ کیا یہ ممکن تھا کہ میں اس نازک لمحہ میں بزدلی کا اظہار کروں؟ میں نے اپنے منتشر خیالات کو مجتمع کر کے اس کے ہاتھ سے جام لے لیا۔ اور تمام عرق پی گئی۔ وہ بے مزہ تھا۔ لیکن چمکدار، وہ ابھی مشکل سے میرے حلق کے نیچے اُترا ہوگا۔ کہ ایک عجیب و غریب مدہوشی مجھ پر طاری ہوگئی۔ اور ہیلیوباس جو میرے قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ ایک دیونما انسان معلوم ہونے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں برقی لیمپ کے مانند روشن تھیں، جس سے میرا جسم جلا جارہا تھا۔ مجھے اس کی آواز ایک گونجتے ہوئے لہجہ میں سنائی۔

"آزل! آزل! تو اس ہلکی مگر حوصلہ مند روح کو اُٹھا کر لیجا اور اس راستہ کے لئے اس کا راہنما بن جا۔ جس پر یہ چلنا چاہتی ہو، اور بغیر کسی روک تھام کے اس کو ہوا کے وسیع اور منور خطوں میں سے گذرنے دے۔ اور اگر یہ کسی عظیم اور پُر رونق کرہ کو دیکھنا پسند کرے تو اس میں اُترنے کے لئے اس کو ایک خاص شکل اور طاقت دیدے۔ اور اگر یہ اوّلین و آخرین دنیا کے اعلیٰ ترین منظروں پر نگاہ ڈالنے کی تاب لاسکے، تو ایک لمحہ کیلئے اجازت دیدے۔ اور اس اختیار کے ذریعہ جو تو نے مجھے عطا کیا ہے، میں اس کی روح کو آزاد کرتا ہوں۔ اے آزل! اسے جلدی سے لیجا۔"

میرے چاروں طرف بہت گہرا اندھیرا چھا گیا۔ میرے تمام اعضا کی قوت مفقود ہوگئی۔ میں نے محسوس کیا گویا کہ میں زور اور تیزی کے ساتھ تاریکی کے کسی خوفناک اور لامتناہی کرہ میں پہنچ گئی ہوں۔ میں نہ تو حرکت کرسکتی تھی نہ شور و غل مچا سکتی تھی۔ البتہ یہ محسوس ہورہا تھا کہ میں بغیر سانس لئے تیزی کے ساتھ فضا میں بلند ہوتی جارہی ہوں۔ یہانتک کہ اچانک ایک تیز لرزتے ہوئے نورانی شعلہ کے پرتو سے جو قوس قزح کا ایک جزو معلوم ہوتا تھا۔ میری آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوگئی۔ "تاریکی کیا شے ہے؟" مجھے معلوم نہیں تھا میں اس لفظ سے بھی ناآشنا تھی۔ البتہ ایک ایسے نور سے ناواقف تھی جو صاف شفاف اور ضوفشاں تھا۔ میں اس روشنی میں سے اس طرح گذر رہی تھی، جیسے کوئی پرندہ ہوا میں اُڑتا ہے۔ میرے حواس قائم تھے، میں نے معلوم کرلیا کہ ان میں کوئی بات قابلِ عذر نہیں ہے۔ میں ایک ایسی آرام دہ جگہ پہنچ چکی تھی جس سے واقفیت معلوم ہوتی تھی۔ کسی کے نازک ہاتھوں نے میرے بازو کو پکڑا ہوا تھا۔ اور ایک ایسا دلکش نسوانی چہرہ — جو کبھی کسی شاعر یا مصور کے تخیل میں نہ آیا ہوگا۔ میری طرف نظر کئے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ ایسے تبسم زا منظر کو دیکھ کر میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ پھر مجھے ایک عجیب مترنم لہجہ میں آواز سنائی دی۔ جس کو میں بخوبی سمجھ سکتی تھی۔

"تصویر کے مدھم ہونے سے پہلے اپنے پیچھے دیکھ۔"

میں نے بے دلی سے حکم کی تعمیل کی اور ایک سایہ کی طرح جو شیشے

کے پیچھے گزر رہا تھا یا ایک مدھم تصویر کے مانند اس کمرے کو دیکھا جس میں ہیلیو باس کھڑا تھا۔ وہ ایک نامکمل مجسمہ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس شکل کو پہچان لیا۔ وہ میری سابق ہیئت کے مانند ایک مٹی کی مدھم مورت تھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ نامکمل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بت ساز نے متواتر ناکامیابی کی صورت دیکھنے کے بعد اُسے ناقص حالت میں چھوڑ دیا تھا۔ چونکہ میں اپنی اس وقت کی حالت کو ہر طرح سے مکمل سمجھتی تھی۔ اس لئے میں نے اپنے دل سے سوال کیا "کیا یہی وہ جسم خاکی ہے جس کے اندر میں رہا کرتی تھی؟ ۔تعجب ہے میں اس زندان میں کس طرح قید رہی؟ اُف! میری شکل کتنی بدہیئت۔ علم و ہنر سے محروم۔ ضعف و نقاہت سے گھری ہوئی۔ قابلیت کے لحاظ سے محدود۔ فہم و فراست میں کسقدر تنگ کتنی جاہل اور کسقدر حقیر و ذلیل ہے۔"

اور پھر میں اطمینان قلب حاصل کرنے کے لئے اپنے نورانی راہنما کی طرف متوجہ ہوئی۔ جو اس وقت تک میرا بازو پکڑے ہوئے تھا۔ اور اس کے ایک نوری اشارہ پر میں نے محسوس کیا کہ میں اور زیادہ بلندی پر پرواز کرتی چلی جا رہی ہوں۔

یہانتک کہ کرۂ ارض کو حصار کرنے والی فضا کی آخری حدیں بھی گذر گئیں۔ اور خالص ہوا کے صاف و شفاف وسیع طبقے میری نظر کے سامنے پھیلے ہوئے تھے، یہاں پر ہم جیسی مخلوق ہزاروں کی تعداد میں موجود تھی، جو مختلف اطراف میں جلدی جلدی دوڑ رہی تھی۔ وہ خواب میں نظر آنیوالی پریوں کی طرح خوبصورت تھی۔ ان میں سے بعض ہستیاں پستہ قد اور نازک اندام تھیں اور بعض قد آور اور عالی شان۔ ان کی شکل و صورت انسان جیسی تھی۔ لیکن اسقدر مہذب، ترقی یافتہ اور فضیلت مآب تھیں کہ ان کو انسان سے غیر مشابہ کہا جا سکتا ہے، لیکن پھر بھی انسان کے مانند تھیں۔

اسی اثنا میں میری پشت کی طرف سے آواز آئی۔ "کیا کوئی امر دریافت طلب ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں۔ مجھے بتاؤ جس کسی چیز سے واقف ہو جانا میرے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکے۔"

اسی آواز نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تمام لطر آنیوالی ارواح سیاروں میں رہنے والوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ باہمی محبت اور گناہوں سے توبہ کرانا ان کا فعل ہے۔ تنبیہ۔ دلیل اور عبادت کے ذریعہ دوسری ارواح کو خدا کی طرف مائل کرنا بھی ان کا کام ہے۔ وہ خود ایک مرتبہ فانی لباس زیب تن کر چکے ہیں۔ اور اس طرح اپنے تجربہ سے فانی انسانوں کو درس عبرت دیتے ہیں۔ یہ نورانی مخلوق دوسرے لوگوں کو افعالِ ذمیمہ سے بچا کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرتی ہے۔ اپنی جدوجہد میں اس کو جسقدر کامیابی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ جنت کے قریب ہو جاتی ہے۔ یہ وہی مقام ہے جس کو اہلِ زمین "اعراف" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس جگہ ان روحوں کو جو دیدارِ الٰہی کی آرزومند ہیں۔ لیکن کافی پاکیزہ نہ ہونے کے سبب باریاب نہیں ہو سکتیں، ایک قسم کا خفیف عذاب دیا جاتا ہے۔ دوسروں کی خدمت کر کے اور گناہوں سے بچا کر آخر کار وہ اپنی مراد حاصل کر لیتی ہیں۔ اگر کوئی فانی انسان احسان فراموشی، غفلت یا بدمعاشی جیسے برے افعال کا مرتکب ہو جائے تو ان صابر کارکنوں میں سے ایک یا دو کو جنت سے زیادہ دور کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا تم خیال کر سکتی ہو کہ ہر روح کو اپنی آرزو پوری کرنے کے لئے کتنے عرصہ تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ دُور کافی بلندی پر پہنچ گئے تھے۔ یہانتک کہ ایک مقام پر میرے راہنما نے، جسکو ہیلیو باس نے آزل کے نام سے پکارا تھا۔ ٹھہر جانے کا حکم دیا۔ اس وقت ہم ایک ایسے طبقہ میں پرواز کر رہے تھے جس کو صاف شفاف روشنی کا سمندر کہا جا سکتا ہے، میں قدرت کی کارفرمائیوں کا مشاہدہ کر رہی تھی۔ میں نے نظامِ شمسی پر نظر ڈالی۔ بہت سے حلقے ایک دوسرے کے اندر گھوم رہے تھے۔ ان کی رفتار اسقدر تیز تھی کہ ان سب کا ایک چکر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے بہت سے سیاروں ——کو ہوا میں اُچھالی ہوئی گیند کی طرح —— لگاتار گردش کرتے ہوئے دیکھا۔ آتشیں و مدار تارے چمک رہے تھے، گویا وہ خطرہ کی خبر دینے والی مشعلیں ہیں اور رحمان و شیطان کے درمیان جنگ چھڑنے والی ہے۔ ناقابلِ بیان عجائبات کا ایک عظیم الشان جلوس غیر محدود اور شاندار دائروں میں گذر رہا تھا۔ جب میں اس پُر رونق نمائش کا نظارہ کر رہی تھی، تو مجھ پر بالکل خوف و اضطراب طاری نہ تھا۔ میں اس کو ایسے ہی اطمینان کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ جیسے کوئی شخص مناظرِ قدرت سے محظوظ ہو رہا ہو۔ میں اس جگہ سے اپنی دنیا کو بمشکل تمام دیکھ سکتی تھی وہ بے شمار اور آتشیں دائروں کے مقابلے میں ایک معمولی داغ یا سوئی کے ناکے کی مانند چھوٹی سی معلوم ہوتی تھی۔

اس وقت اگرچہ میں بے شمار پابندیوں میں گھری ہوئی تھی لیکن

پھر بھی اپنے اندر ایک غیر معمولی قوت محسوس کر رہی تھی۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ میں ایک غیر فانی مادے سے بنائی گئی ہوں۔ اور اس کی تصدیق کے لئے کسی تشریح و توضیح کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر تمام سیارے اور نظام کائنات کسی اچانک حادثہ سے فنا ہو جائیں تب بھی میں زندہ و سلامت رہونگی۔ اور اشیاء کو جاننے۔ یاد رکھنے محسوس کرنے اور ایک عالم جدید کو دائرۂ وجود میں آتا دیکھنے کی اہل رہونگی۔ اور اس نئی دنیا کی ترکیب و تنظیم میں کافی حصہ لے سکونگی۔

میں اپنے راہنما کی طرف متوجہ ہوئی۔ اور ایک ایسی سریلی آواز میں — جو نغمہ و سرود سے مشابہ تھی۔ اس کے ساتھ ہمکلام ہوئی۔ میں نے کہا۔

"مجھے بتاؤ کہ ان تعجب خیز عجائبات کے پیدا کرنے میں کیا مصلحت ہے، اور کیا وجہ ہے کہ دنیا کے باشندے تمام عالم میں سے صرف زمین ہی کو فانی سمجھے ہوئے ہیں۔"

آزل نے جواب دیا "پہلے آخری سوال کا جواب دیا جائیگا۔ کیا تو کچھ فاصلے پر ایک گول چکردار سیارہ دیکھتی ہے، اہل زمین — جن میں تو بھی شامل تھی جبکہ تیرا جسم خاکی تھا۔ اس کو زحل کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اچھا اب میرے ساتھ نیچے اترو۔"

ایک لمحے میں ہم نیچے کی طرف اُترنے لگے یہانتک کہ ایک وسیع اور خوشنما مقام پر پہنچ گئے۔ جہاں عجیب و غریب اشکال اور گوناگوں رنگوں کے پھول بکثرت اُگے ہوئے تھے۔ یہاں ایک قدآور اور نورانی حسن والی مخلوق سے ملاقات ہوئی جس کی وضع انسان جیسی لیکن صورت فرشتوں کے مانند تھی۔ انہوں نے ادب کے ساتھ جھک کر ہماری تعظیم و تکریم کی۔ پھر وہ اپنی اپنی مرضی کے مطابق کسی کاروبار یا تفریح و تفنن طبع کے لئے چلی گئی۔ اور میں اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے آزل کی طرف متوجہ ہوئی۔

نورانی راہنما نے کہا "خالق حقیقی نے ان بچوں کو فضا میں پرواز کرنے والی روحوں کے ساتھ گفتگو کرنے اور میل جول پیدا کرنے کا اختیار دیا ہے۔ وہ ان سے واقف ہیں اور محبت کرتے ہیں، اور ان کی حفاظت میں رہنے کے ملتجی ہیں۔ اس سیارے میں بیماری اور بڑھاپا بالکل نہیں اور موت ایک بے خبر نیند کے مانند آتی ہے۔ دنیا کے معیار وقت کے مطابق ان لوگوں کا عرصۂ وجود تقریباً دو سال ہے اور ان کے فنا ہونے کا عمل ایک پھول کے مرجھانے سے زیادہ ناخوشگوار نہیں ہے۔ وہ برقی چکر جو ان کی دنیا کے چاروں طرف نظر آتا ہے۔ طاعون اور دوسرے امراض کا سدِ باب ہے۔ اور صحت و تندرستی عطا کرتا ہے۔ وہ تمام علوم و فنون اور ایجادات — جن سے اہل زمیں واقف ہیں، اس دنیا کے لوگ بھی نسبتاً زیادہ کمال کے ساتھ جانتے ہیں۔ اس سیارہ کے باشندوں اور اہل زمین کے درمیان تین زبردست اختلافات ہیں۔ اول یہ کہ ان کا کوئی خود مختار حکمران نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص بذاتِ خود حاکم ہونے کے لائق ہے۔ دوسرے یہ کہ شادی کا رواج نہیں ہے۔ کیونکہ قانونِ کشش — جس کے ماتحت مخالف اصناف کی دو ہستیاں ایک دوسرے سے وصل کی آرزومند ہوتی ہیں۔ غیر حقیقی وفاداری کا موجب ہے۔ تیسرے یہ کہ اس نورانی فضا کی لامنتہا وسعتوں میں ایک ہستی بھی ایسی نہیں ہے جس نے کبھی وجودِ باری پر شک و شبہ کیا ہو۔ اور نہ آئندہ ہی ایسا ہوگا۔"

یہ سنتے ہی شرم و انفعال سے میری روحانی ہستی پر ایک لرزش طاری ہوگئی۔ اور مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اسی اثنا میں پریوں کے مانند ایک چھوٹی مخلوق — جو شاید اہل زحل کے بچے ہونگے۔ دوڑتی ہوئی ہمارے قریب آئی۔ اور عبادت کی غرض سے ہاتھ باندھ کر دوزانو ہوگئی۔ پھر انہوں نے کچھ پھول جمع کئے اور زمین کے اس حصہ پر پھینک دئے جہاں ہم کھڑے ہوئے تھے۔ اور بے باک اور محبت بھری نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔ گویا کہ وہ کسی نایاب پرند یا تیتری کو دیکھ رہے ہیں۔

آزل کے اشارہ پر، ان کی نظروں کے سامنے ہم دوبارہ بلند ہونے شروع ہوئے اور پرواز کرتے ہوئے اس نورانی حلقے کے پار جو دائرہ میں گھرے ہوئے سورج کے مانند تھا، بہت دور نکل گئے، اور پھر اس سیارے میں اُترے جس کو زہرہ کہتے ہیں۔ یہاں پر سمندر، جھیلیں، مرغزار اور دشت و جبل ایک وسیع چمنستان کے مانند تھے۔ جس میں تمام عالم سے زیادہ شگفتگی اور سرسبزی و شادابی موجود تھی۔ اس جگہ بُت سازوں اور مصوروں کے خواب سے زیادہ وقعت نہ رکھنے والے تخیلات حقیقت و اصلیت کے ساتھ جلوہ نمائی کرتے ہیں۔ کیونکہ یہاں پر خواتین کی حسین و جمیل وضع قطع اور دلکش صورتیں خالقِ حقیقی کی صنعتگری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اور اس مقام کے مرد بے مثل قوت و توانائی عالی حوصلگی اور خداداد حسن کے لحاظ سے عالم کی تمام مخلوقات پر سبقت لے گئے ہیں۔ ایک سرسری نگاہ یہ معلوم کر لینے کے لئے کافی تھی۔ کہ اس نورانی سیارے میں تہذیب و تمدن درجۂ کمال کو پہنچ چکا

ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ فنونِ لطیفہ کی قدر و منزلت اور قدرتی مناظر کی پرستش کرتے ہیں۔ وہاں خونریزی مطلق نہیں ہوتی۔ کیونکہ قومیت کے لحاظ سے کوئی تفریق نہیں ہے۔ تمام باشندے ایک وسیع خاندان کے افراد معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے کاروبار میں مدد دیتے ہیں۔ اور صاحبِ عقل و فہم لوگوں کی تعظیم و تکریم کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لیجاتے ہیں۔ ان کا ایک شہنشاہِ اعظم ہوتا ہے۔ جس کی وہ سب لوگ بسر و چشم اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں۔ وہ عموماً اعلیٰ درجہ کا شاعر ہوتا ہے۔ اگر اس کی رعیت میں اس سے بھی زیادہ افضل شاعر پیدا ہوجائے۔ تو وہ بخوشی اپنے شاہی تخت سے دستبردار ہوجاتا ہے۔ کیونکہ وہ ماہرِ فن سے نہیں بلکہ خاص اس کے ہنر سے محبت کرتے ہیں۔ وہاں پر خودغرضی جیسا گناہ بالکل مفقود ہے۔ اور سوائے روحانی الفت و ہمدردی کے عشق و محبت یا رشتۂ مناکحت پیدا کرنے کا کسی شخص کو مجاز حاصل نہیں ہے۔ وہاں بھی ایسی کوئی مخلوق آباد نہیں ہے جو خالقِ حقیقی کے وجود سے انکار یا اس کی عبادت سے اجتناب کرتی ہو۔

ازاں بعد ہم نے سیارہ مشتری کی سیر کی۔ وہاں بھی بجنسہٖ یہ حالت پائی جاتی ہے۔ لیکن ہر کام بجلی کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ برقی قوت کے توسل سے ہزاروں میل کے فاصلے پر رہنے والے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بہ آسانی گفتگو کرسکتے ہیں۔ فنِ طباعت جس پہ اہلِ زمین کو بہت فخر و ناز ہے، اس جگہ بجلی کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام علوم و فنون اور ایجادات۔ جن سے ہم واقف ہیں، اہلِ مشتری زیادہ کمال کے ساتھ جانتے ہیں۔ کیونکہ وہ تمام کام برقی قوت سے لیتے ہیں۔ جو کبھی خطا نہیں کرتی۔

مشتری کے بعد آزل مجھے بہت سی دوسری عمدہ اور شاندار دنیاؤں میں لے گیا۔ جن میں سے ایک بھی بہشت نہ تھی۔ ہر ایک میں کچھ نہ کچھ خامی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جسمانی یا روحانی آزار ہے جس کے خلاف جدوجہد کرکے فتح نصیب ہوسکتی ہے۔ ہر ستارہ کے تمام باشندے کسی نہ کسی ارفع و اعلیٰ چیز کے آرزومند تھے۔ جو اس وقت تک ان کو میسر نہیں آئی تھی۔ اور اسی لئے وہ غیر مطمئن تھے۔ مجبوراً ان کو کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا تھا۔ اور سب کی قسمت میں موت لکھی ہوئی تھی۔ اہلِ زمین خدا تعالیٰ سے اپنی مصیبتوں کا شکوہ کرکے اس کے عدل و انصاف کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن اس سیارہ کے لوگ باوجود مصائب و آلام برداشت کرنے کے حیات بعد الموت پہ کامل یقین رکھتے ہیں۔ اور یہ کہ ان کا مستقبل نہایت درخشاں اور مکمل ہوگا۔ ان کی محنت و جانفشانی کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی ملی آنند یعنی ابدی مسرت و شادمانی اور امن و امان حاصل کرسکیں۔

چاند اور سورج میں کوئی چیز قابلِ دید نہیں ہے۔ کسی زمانے میں وہ آباد تھے۔ اہلِ آفتاب عرصۂ دراز تک اپنی زندگی گزار کر مرکزی کرہ میں منتقل ہوگئے ہیں۔ اب سورج سوائے مشتعل دنیا کے کچھ نہیں ہے۔ اور جلدی ہی جل کر خاک سیاہ ہوجائیگا۔ یہ کتنا مناسب ہے کہ وہ اسی برقی حلقہ میں ——جس کے اندر سے ابتدا میں نمودار ہوا تھا۔ واپس جذب ہونا شروع ہوگیا ہے تاکہ دوبارہ کسی نئی طرز اور جدید روشنی کے ساتھ پیدا ہو۔ ابتدائے آفرینش سے تمام دنیاؤں۔ آفتابوں اور نظامِ کائنات میں یہ سلسلہ جاری ہے۔ وہ مختصر لمحے جن کو اہلِ زمین "سال" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں گزر جائیں گے اور سورج جل کر ختم نہیں ہوگا۔ ہماری چھوٹی اور سرد دنیا کے لوگ اس کی تپش سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں۔

چاند کا درحقیقت کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ اپنی گذشتہ شکل کا ایک عکس یا برقی نقش ہے۔ اور جس طرح ریفائیل دورِ حاضرہ کے لوگوں کے کارٹون بناتا تھا۔ اسی طرح فضائی کہربا نے ایک قدیم اور آباد دنیا کی تصویر سطحِ آسمان پر کھینچ دی ہے۔ موجودہ چاند سے سمندر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ اسی قدیم چاند کی برقی شعاعیں، جو اب تک سمندر کے پانی میں موجود ہیں۔ مدوجزر کا باعث ہیں۔ جس طرح سورج مختلف رنگوں کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے۔ اسی طرح چاند کی برقی تصویر میں جو آسمان پر دکھائی دیتی ہے۔ سمندر کے پانی میں تلاطم پیدا کرنے کی قوت موجود ہے اور جس طرح انسانی ہاتھوں سے تیار کی ہوئی تصویر میں رنگ بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس گم شدہ سیارہ کے خاکے میں جس کو وسعتِ قدرت نے اپنی نورانی قلم سے سطحِ آسمان پر بنا دیا ہے، بڑی زبردست کہربائی قوت پائی جاتی ہے۔ یا بطور تشبیہ کے یوں کہنا بہتر ہے کہ جس طرح تصویر کے بعض پہلو نمایاں کرنے کے لئے تاریک و روشن یا ہلکے گہرے رنگ بھرے جاتے ہیں۔ اسی طرح چاند کے عکس میں مختلف مدارج کی کہربائی قوت پائی جاتی ہے۔ اور جب اس کا تصادم کرۂ ارض کی برقی قوت سے ہوتا ہے تو نظامِ کائنات کے اندر بے شمار تبدیلیاں ظہور میں آتی ہیں۔

جبکہ ہم تیزی سے پرواز کر رہے تھے تو آزل نے آہستہ لہجہ میں مجھ سے کہا۔ "کیا تو نے ان سیاروں میں آکر، جن میں پُرامن زندگی

اور علم و ہنر کی فراوانی ہے، کوئی اچھا سبق حاصل کیا؟ اچھی طرح سمجھ لے۔ تیرے سامنے نظامِ کائنات میں ہزاروں سیارے گردش کر رہے ہیں، لیکن ان میں ایک چھوٹی سے چھوٹی دنیا بھی ایسی نہیں ہے جس کا ایک متنفس اپنے خالق کے وجود پر شک و شبہ کرتا ہو۔ صرف تیری ہی دنیا کے لوگ بدنصیب اور حقیقت ناشناس ہیں۔ غور سے اپنی دنیا کو دیکھ۔ وہ سورج کی روشنی میں ایک مدہم شعلہ کے مانند چمک رہی ہے وہ ایک مختصر سا داغ ہے۔ وہ فضا میں دائمی گردش کرنے والے منور حلقوں میں ایک معمولی نشان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ اس جگہ ایک مشتِ خاک سے پیدا کئے ہوئے پستہ قد لوگ آباد ہیں۔ وہاں مرد و عورت آپس میں اظہارِ الفت کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ایک دوسرے کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ دولت کی پوجا کرتے ہیں اور حرص و ہوا کے بندے ہیں۔ نامور ہستیاں قعرِ ذلت میں پڑی ہوئی ہیں۔ اور بہادر لوگ بے نیل و مرام اپنی زندگی کے دن گزار کر اس دنیا کو خیرباد کہتے ہیں۔ ایمانداری مفقود ہوگئی اور بے ایمانی کا سکہ ہے۔

رموزِ کائنات کو سمجھنے کے لئے لوگ کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی فہم و ادراک نہایت محدود ہے اور وہ اپنی ہستی کو بھی اپنی ملکیت ثابت نہیں کر سکتے۔ افسوس! تیری دنیا میں ایک قوم دوسری قوم سے ایک فرقہ دوسرے فرقے سے ایک متنفس دوسرے متنفس سے برسرِ پیکار ہے۔ لیکن خیر! بہت جلد ان پر تباہی آنیوالی ہے اور ان کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہیں رہیگا۔

میں نے اپنے نورانی راہنما پر مشتاق نظر ڈالی اور کہا "اگر تمہارا قول صادق ہے تو پھر کیا وجہ تھی کہ خدا، جیسا کہ کہا جاتا ہے، حضرت عیسٰے کے قالب میں نمودار ہوا اور ایک حقیر و ذلیل مخلوق کی خاطر مصائب و آلام برداشت کئے؟"

آزل نے اس کا تسلی بخش جواب نہ دیا۔ بلکہ اپنی چمکدار آنکھیں میری طرف پھیر کر تعجب سے دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں کسی عجیب پوشیدہ قوت نے مجھے آگے کی طرف دھکیلا اور پیشتر اس کے کہ میں اس کی حقیقت سے باخبر ہوں۔ میں تن تنہا اکیلی رہ گئی۔ اس کے بعد میں ایک اور وسیع نورانی طبقہ میں پہنچی۔ میں مطمئن تھی اور اپنی قوت کا احساس تھا۔ مجھے ایک آواز سنائی دی جو انتہائی بلندی سے آرہی تھی۔ اول اول وہ صدائے ارغنون معلوم ہوئی لیکن بعد میں نفیری کے مانند گونجدار آواز میں تبدیل ہوگئی۔

مجھے سنائی دیا۔ "اے روح! تجھے ایک نامعلوم ہستی کی جستجو ہے، اور چونکہ میں مناسب نہیں سمجھتا کہ کائناتِ عالم میں سے ایک ذرہ بھی تباہ ہو۔ اس لئے تجھے ایک منظر دکھایا جائیگا اور تجھ پر ایک ایسا اسرار منکشف کیا جائیگا جو تو نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہو۔ تو نئے نئے نظریے ایجاد کریگی۔ لوگ تیری پوجا کریں گے۔ اور کورانہ ذہنیت ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد ہوجائیگی۔ اس لئے بہتر ہے کہ اس نورانی فضا میں تھوڑی دیر آرام کر۔ اور جو عجائبات تجھ کو نظر آئیں۔ ان کو اچھی طرح دیکھ۔ کیونکہ وہ وقت قریب ہے جبکہ یہ تمام نظر آنے والی اشیاء تاریکی میں نہاں ہوجائینگی اور وہ ہستیاں جو مجھ سے محبت نہیں رکھتی۔ اس مقام پر ہرگز نہیں رہ سکیں گی۔"

آواز ختم ہوگئی۔ میں خائف تھی، لیکن پھر بھی اطمینانِ قلب حاصل تھا۔ میں نے اس آواز کو دوبارہ سننے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ سنائی نہ دیا۔ میرے چاروں طرف غیر محدود روشنی اور انتہائی خاموشی تھی۔ لیکن ایک عجیب منظر میری آنکھوں کے سامنے منکشف ہوا۔ وہ ایک عجیب خواب تھا۔ بلکہ ایک حد تک حقیقی چیز تھی۔ جس کا ایک ایک حصہ اچھی طرح میرے دل پر نقش ہے۔ وہ ایک روحانی ڈرامہ تھا۔ اور مجھے زبردستی اس کا چیف ایکٹر بنا دیا گیا۔ اور جن باتوں کو میں ایک سربستہ راز تصور کرتی تھی۔ وہ بالکل واضح اور نمایاں طور پر سمجھ میں آگئیں۔

جب میں ہوش میں آئی تو ہیلیو باس متفکرانہ حالت میں میرے سرہانے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

"تم نے بہت دیر لگا دی۔ میں تو تمہاری زندگی سے ناامید ہوگیا تھا۔ خدا کا شکر ہے، تم دوبارہ اصلی حالت میں آگئیں"
اس وقت میرے سر میں خفیف سا درد ہو رہا تھا۔

فضل حق قریشی دہلوی

سلطنتِ مغلیہ کا زوال

اٹھارہویں صدی عیسوی، دلّی اور سلطنتِ مغلیہ دونوں کے لئے قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھی۔ سو برس کے اندر ساری آفتیں جو کسی کے ذہن میں آسکتی ہیں، ایک ایک کرکے شہر اور قلعہ پر ٹوٹ پڑیں۔

پہلی قیامت تو ۱۷۳۹ء میں برپا ہوئی جبکہ نادر شاہ اور اس کی فوج نے دھڑی دھڑی کرکے شہر کو لوٹا کھسوٹا اور گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہادیں۔ یہ پہلی ضرب ہی ایسی کاری لگی تھی کہ سلطنتِ مغلیہ لاشۂ بیجان ہوکر رہ گئی اور اپنے پرائے ہوگئے۔

جب نادر شاہ زر و جواہر سے لدا پھندا ہنسی خوشی، محمد شاہ رنگیلے کو ہندوستان کے خیالی تخت پر بیٹھا کر اپنے وطن کو سدھار گیا، تو دلّی والوں نے اطمینان کا سانس لیکر اپنی حالت پر خود ہی تبصرہ کرنا شروع کیا۔ دل میں کہنے لگے "اپنی نیند سوتے تھے، اپنی نیند اٹھتے تھے، دن بھر بٹیر بازی، مرغ بازی، پتنگ بازی اور دوسری بازیوں میں مشغول رہتے اور رات بھر "تُمرٗ" میں "ایسر" کا سروپ دیکھتے رہتے تھے، آخر ہم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو اس ظالم ایرانی نے ہمیں یوں پیس کر سُرمہ کردیا اور دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجادی" لیکن جب بہت غور و فکر سے کام لیا تو پکار اُٹھے "شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت"

سلطنت تو کیا سنبھلتی ہاں دلّی والے کچھ عرصہ کے بعد روٹی پر روٹی رکھکر کھانے لگے تھے۔ لیکن اس واقعہ کے بارہ چودہ سال کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان کا رُخ کیا اور ۱۷۵۶ء میں رہی سہی کسر پوری کر دی۔ مثل مشہور ہے "موئے پہ سو دُرّے"

جب کارکنانِ قضا و قدر نے یہ دیکھا کہ ابھی تک ان لوگوں کے کان پر جُوں نہیں رینگی، تو انہوں نے تادیب کا دوسرا پہلو اختیار کیا۔ ۱۷۸۴ء میں دلی اور اس کے گرد و نواح کے اضلاع میں وہ قحط پڑا کہ الامان والحفیظ! جس پرگنہ سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ وصول ہوا کرتا تھا۔ وہاں سے صرف سات ہزار بمشکل وصول ہوسکے۔

قاعدہ کی بات ہے جب حکومت میں انتظام کرنے کی قابلیت نہ ہو اور رعایا کے پاس کھانے کو نہ ہو تو قتل و غارت اور لوٹ مار کی وارداتیں عام ہوجائینگی۔ ٹامس ٹوینِنگ نامی سیاح، جو ۱۷۹۰ء کے لگ بھگ ہندوستان میں آیا تھا اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ "جب میں آگرہ سے روانہ ہونے لگا تو میرے میزبان پادری جوڈیل نے مجھے ہدایت کی کہ صرف دن میں سفر کرنا، رات کو سرائے میں قیام کرنا اور اگر رات کو سفر کرنے کی ضرورت درپیش ہو تو چند سواروں کو ساتھ لے لینا، ورنہ لٹ جانے کا خطرہ ہے"!

مسٹر ٹوینِنگ کہتے ہیں "میں جب دہلی پہنچا تو وہاں مفلسی اور خستہ حالی کے آثار، در و دیوار سے نمایاں تھے۔ لیکن جامع مسجد جس سے زیادہ شاندار اور باشکوہ عمارت میں نے مدت العمر نہیں دیکھی۔ اور مدرسہ غازی الدین یہ دو عمارتیں اچھی حالت میں تھیں، دریائے جمنا، قدسیہ باغ کی دیوار کے نیچے بہتا تھا۔ چاندنی چوک کی نہر بالکل خشک پڑی تھی اور ایسا ہونا تعجب خیز نہ تھا جب خزانہ خالی پڑا ہو تو نہر کس شمار قطار میں آسکتی ہے!!"

۱۷۸۸ء میں روہیلوں نے یورش کی اور غریب شاہ عالم کو آنکھوں سے بھی معذور کردیا گیا۔ اچھا ہوا دلّی کی تباہی دیکھ دیکھ کر اس کا دل کڑھتا ہوگا۔ سندھیا نے روہیلوں کے پنجہ سے رہائی دلاکر اپنی حفاظت میں لے لیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ سلامت، مرہٹوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنے ہوئے تھے۔ اور یہ لوگ اس کے نام سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔

پندرہ سال تک بادشاہ، شاہزادے اور سلاطین زادے سب کے سب یونہی مختلف عذابوں اور آفتوں کا شکار رہے لیکن ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے دلّی فتح کی تو ایک طرف ملک میں امن و امان کیا دوسری طرف گورے گورے ہاتھوں سے بادشاہ سلامت کے آنسو پونچھے۔ لکھا ہے کہ جب انگریزی افسروں نے قلعہ معلیٰ میں شاہزادوں سے ملاقات کی تو انہوں نے سب سے پہلے اپنی مصیبت کی داستان ان لوگوں کو سنائی تھی۔ تیموری خاندان میں اب صرف مرثیہ خوانی ہی باقی رہ گئی تھی۔

چند روز کی گفت و شنید کے بعد شاہ عالم نے انگریزوں کی حفاظت

میں رہنا قبول کرلیا اور نوّے ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر ہوگیا۔ یعنی اس تاریخ سے سلاطین مغلیہ، برطانیہ کے پنشن خوار ہوگئے۔ انگریزوں نے ایک طرف تو بادشاہ کو خوش کیا دوسری طرف رعایا کا دل مٹھی میں لینے کی تدبیر کی۔ اوقاف کی نگرانی اور انتظام کے لئے ایک مسلمان داروغہ پچاس روپے ماہوار پر مقرر کیا اور ان کی آمدنی سے مقابر اور مساجد کی درستی کرائی۔ نہر جمن کو از سر نو صاف اور درست کیا گیا جس کی وجہ سے چاندنی چوک کی نہر میں دوبارہ پانی آنے لگا، قطب مینار کی درستی کی گئی۔ میجر اسمتھ نے مینار پر ایک گنبد تعمیر کرایا جس پر یونین جیک نصب کیا گیا۔ جامع مسجد کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ صحن مسجد کی صفائی کی گئی۔ پشت پر جو درخت اُگ آئے تھے اُن کو دور کیا گیا اور مرمت طلب حصّوں کی درستی کی گئی۔

علاوہ بریں، اسلامی علما کی تالیف قلوب بھی کی گئی، اس زمانہ میں، شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طوطی بول رہا تھا، یہ بزرگ حجۃ اللہ شاہ ولی اللہ مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے خلف اکبر تھے، اور دلی کے تمام لوگ چھوٹے اور بڑے ان کی پیر کی سی عزت کرتے تھے، دلی کے انگریز حکام وقتاً فوقتاً اُن کے سلام کے لئے آتے تھے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ انگریزی حکومت کی بدولت دلّی کو مدتوں کے بعد امن و امان نصیب ہوا۔ تجارت اور صنعت و حرفت دونوں میں زندگی پیدا ہوگئی، لیکن بیس پچیس سال کے بعد قدرتی طور پر دلی کے تمدن پر "انگریزیت" کا اثر نمایاں ہونے لگا۔ لباس اور وضع ظاہری کے علاوہ عادات اور اخلاق بھی "نئی روشنی" سے مستفید ہونے لگے۔ چاندنی چوک کی دکانوں میں "ولائتی مال" بکثرت نظر آنے لگا۔ بدرالدین خاں مہرکن نے، جو اکبر شاہ ثانی کی سرکار میں ملازم تھا سب سے پہلے انگریزی حروف میں اپنی دکان پر سائن بورڈ لگایا۔ یہ سائن بورڈ اس امر کی بھی دلیل تھا کہ "لیلیٰ کا ناز رخصت" اور "سودائے قیس غائب" ہونے والا ہے۔ وظیفہ کی جگہ پانیر پڑھا جائے گا۔ اور پاجامہ کی جگہ "نکر" استعمال ہوگا۔

۱۸۲۵ء میں دہلی کالج قائم کیا گیا جہاں عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم کا انتظام بھی کیا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ نے اسی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ ڈپٹی صاحب تو گھر ہی سے فاضل ہوکر داخل ہوئے تھے اور یہاں رہکر سوائے وظیفہ اور سند کے اور کوئی قابل تعریف بات حاصل نہ کی لیکن مولوی صاحب کی فیاضی دانی نے جو اس کالج کی شرمندۂ احسان تھی، انہیں میور سنٹرل کالج الہ آباد کی پروفیسری پر پہنچا دیا۔

اب ہم قلعہ معلیٰ کے باشندوں کا تھوڑا سا حال بیان کرتے ہیں وہ خاندانِ تیموریہ کے افراد عموماً قلعۂ معلیٰ میں رہتے تھے۔ اور عام باشندوں کے مقابلہ میں ان کو امتیازی حقوق حاصل تھے، شہر کے رؤسا اور شرفا سے رات دن کا ملنا جلنا ہوتا تھا، خصوصاً مشاعروں کے سلسلہ میں جس کی وبا اس زمانہ میں عام تھی، ہر شخص شعر و سخن کا دلدادہ تھا، نیچہ بند اور نعلبند تک فرصت کے اوقات میں تک بندی کرتے تھے۔ غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، نیرؔ، شیفتہؔ، علائیؔ، احسانؔ، تمکینؔ، حیاؔ، عیشؔ، تنویرؔ، تسکینؔ، تشنہؔ، سوختہؔ۔ مجروحؔ اور خدا جانے کس قدر لوگ ناوک شعر کے زخمی تھے جو اپنی آہوں سے مشاعروں کو گرمایا کرتے تھے۔

شاہزادے اور سلاطین زادے چونکہ ہر وقت بیکار رہتے تھے۔ اس لئے ان کی زندگی کسی طرح بھی لائق تعریف نہیں قرار دی جاسکتی۔ یہ لوگ اپنا وقت "بازیوں" میں صرف کیا کرتے تھے۔ جن میں سے تیتر بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی اور پتنگ بازی کو زیادہ اہمیت دیجاتی تھی۔

۱۷۹۴ء میں ان کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز تھی۔ چالیس تو شاہ عالم کے بیٹے اور پوتے ہی تھے۔

۱۸۴۸ء میں جملہ شاہزادوں اور سلاطین زادوں کی تعداد ایک ہزار نوسو چھیالیس تھی، قدرت کی ستم ظریفی کہیے یا کفایت شعاری کہ اس انبوہ کثیر اور جم غفیر کی جوع البقر کو تسلی دینے کے لئے غریب بادشاہ کو صرف بارہ لاکھ سالانہ ملتا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ خدام بارگاہ بھی سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ اور خواصین، آنائیں، اور چھوکریاں بھی اسی قدر تھیں۔ پھر قلعہ کی مرمت اور درستی بھی اسی میں شامل تھی۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ "شاہی مرتبہ" کا قیام بھی اسی رقم پر منحصر تھا، زمانہ کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں!! اسی بہادر شاہ کے دادا پردادا، پندرہ لاکھ روپے سالانہ محتاجوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ نذر و نیاز اس کے علاوہ ہوتی تھی۔ یا تیمور کے اس بدنصیب نام لیوا کی زندگی "اضافۂ تنخواہ" کی مسلسل درخواستوں ہی میں بسر ہوگئی فی الجملہ کثرت متوسلین اور قلت آمدنی کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ بہت سے شاہزادے محض دو وقت روٹی کھا کر گزارا کرتے تھے۔

اور غدر سے کچھ دنوں پہلے بہت سے "فلک زدہ" قلعہ سے نکل کر شہر کے گلی کوچوں میں روپوش ہو گئے تھے۔ سچ بھی تو ہے جب پاؤں میں جوتی بھی ثابت نہ ہو تو دیوان عام اور دیوان خاص میں کس منہ سے قدم رکھیں؟ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ اب بھی کسی کی آنکھ نہ کھلی!

۱۸۴۲ء میں قلعہ معلیٰ کے ریزیڈنٹ نے جو سالانہ رپورٹ، کمپنی کو بھیجی تھی اس میں لکھا تھا کہ "یہ شاہزادے، ننگ انسانیت ہیں شرم و حیا سے نفور ہیں آدمیت اور تعلیم سے کوسوں دور، یہ لوگ غریبوں سے ملتے نہیں۔ رئیس انہیں پاس بٹھاتے نہیں، اس لئے سوائے آوارگی کے اور کوئی شغل نہیں کر سکتے۔ کاہلی اور عیاشی ان دو برائیوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ نہ انہیں اپنی فکر ہے نہ اپنی اولاد کی" ایجنٹ صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ سلطان عالمگیر اورنگ زیب کے بعد کسی نے بھی اپنی عاقبت کی فکر نہیں کی۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جن شاہزادوں کو معقول وثیقے ملتے تھے اور جو قلعہ معلیٰ کے اندر محلات شاہی میں رہتے تھے، وہ بہت شائستگی اور تہذیب کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔

اکبر شاہ ثانی کو مدت العمر یہ خیال ستاتا رہا کہ موجودہ حالت نہایت ناخوشگوار ہے لیکن بیچارہ بے دست و پا تھا، یعنی اپنے ناعاقبت اندیش بزرگوں کے کئے کو بھر رہا تھا۔ چنانچہ وہ اسی طرح بردں کی جان کو روتا ہوا آغوش لحد میں جا سویا اور تمام بکھیڑوں سے چشم زدن میں نجات ہو گئی۔ راجہ رام موہن رائے کو اسی بادشاہ نے راجہ کا خطاب دیکر ولایت بھیجا تھا کہ وہاں جا کر بادشاہ انگلستان کو ہندوستان کے بے تاج بادشاہ کی دردبھری کہانی سُنا کر وظیفہ میں اضافہ کرائے۔

بہادر شاہ جس کو دنیا ظفر کے نام سے زیادہ جانتی ہے، تیموری نسل کا آخری تاجدار تھا چونکہ حکمرانی اور جہانبانی کا کام انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اس لئے "بادشاہ سلامت" اپنا وقت شاعری تصوف اور شکار میں صرف کیا کرتے تھے۔ اردو ادب پر اس نیک طینت اور درویش صفت بادشاہ کا جسقدر احسان ہے، اس کے جتانے کی نہ ضرورت ہے اور نہ موقعہ۔ ظفر کو ہم دوسرے درجہ کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ یعنی غالب اور مومن کے بعد اس کا درجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ چونکہ ساری عمر رنج و الم میں بسر ہوئی۔ اس لئے کلام میں تاسف، الم، حسرت افسوس اور ارمان کا عنصر غالب ہے آزاد نے تو اس بدنصیب بادشاہ سے شاعری کی قابلیت بھی سلب کر لی۔ اور اس کے دواوین کو ذوق کی فکر رسا کا نتیجہ قرار دیدیا، لیکن خدا کا شکر ہے آب حیات کا طلسم اب باطل ہو چکا ہے، اس لئے اس مسئلہ پر لکھنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی۔

بادشاہ عموماً دربار خاص میں رونق افروز ہوا کرتے تھے لیکن ہندو مسلم تہواروں کے موقعوں پر دربار عام میں شرف ملاقات عطا کیا کرتے تھے، واضح ہو کہ اب سے سو سال پہلے نہ اردو ہندی کی بحث تھی نہ گائے کی قربانی کا سوال تھا، نہ ہندو مسلم فساد کا کہیں نام و نشان تھا۔ ہولی، دیوالی اور دسہرہ تینوں تہوار قلعہ معلیٰ میں بڑی شان کے ساتھ منائے جاتے تھے، رمضان میں تمام لوگ ماہ رمضان کا احترام کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ کوئی شخص بازار میں علانیہ طور پر خورد و نوش کی جرأت نہیں کرتا تھا جب عید کا چاند دکھائی دیتا تو قلعہ معلیٰ سے توپیں سر ہوتیں اور عید کے دن بادشاہ سلامت ہاتھی پر سوار ہو کر جامع مسجد میں نماز کے لئے تشریف لاتے۔ شہر میں اگر کسی رئیس کے یہاں تقریب ہوتی تو بھی جہاں پناہ، از راہ شفقت، یا خود تکلیف کرتے یا مرزا فخر الملک ولیعہد کو اپنی جگہ بھیج دیتے۔ گاہے گاہے سلطان نظام الدین اولیا رح کی درگاہ پر بھی حاضر ہوا کرتے۔ برسات کے موسم میں قلعہ کے تمام لوگ بیگمات اور شاہزادے تبدیلی آب و ہوا کے لئے قطب صاحب میں قیام پذیر ہوتے تھے اور وہاں کی تقریبوں اور جلسوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔

بہادر شاہ کو آموں سے بہت شوق تھا ۱۸۵۳ء میں جبکہ اُن کی عمر ۷۸ سال کی تھی، ایک دن اسقدر آم کھائے کہ صاحب فراش ہو گئے۔ دوسرے دن افاقہ ہو گیا، اور جب سر ٹامس مٹکاف ریزیڈنٹ مزاج پرسی کے لئے آئے اور خادم کو اندر بھیجا کہ سلام عرض کر دے تو بادشاہ سلامت نے سلام کے جواب میں یہ شعر بھی کہلا بھیجا ؎

انبہ اے فرزند مجھ کو بیشتر مرغوب ہے
کچھ نہیں کرتا ضرر میرے لئے یہ خوب ہے

لیکن بادشاہوں کی بیماری بآسانی رفع نہیں ہوا کرتی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ لوگ عموماً بد پرہیز ہوتے ہیں۔ دو تین دن کے بعد شربت گلاب عرق کیوڑہ میں ملا کر پی لیا۔ پھر درد شکم کی شکایت تازہ ہو گئی اور کچھ ایسا پیچ پڑا کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ زیست سے مطلق مایوسی ہو چکی تھی لیکن قسمت میں تو غدر کا "تماشا" دیکھنا لکھا تھا، موت کس طرح آتی؟ ۹ جولائی سے ۱۸ اکتوبر تک علالت کا سلسلہ جاری رہا ۲۳ کو غسل صحت ہوا اور دربار عام منعقد کیا گیا۔ حکیم احسن اللہ خاں وزیر مختار، وکیل مطلق اور طبیب خاص کو خلعت ہفت پارچہ، تین دلنے

جواہر کے ایک ہاتھی مع عماری کے، ایک پالکی نقرئی اور "افلاطونِ دوراں" کا خطاب عطا ہوا۔

بیچارے ظفر شاہ کو کیا خبر تھی کہ جس شخص کو آج "افلاطون" کا لقب عطا کر رہا ہوں۔ یہی "مسیحا" چار سال بعد دشمن جان ومال ہی نہیں بلکہ دشمن ننگ وناموس ہو جائے گا اور "مسیحائی" کے عوض "ملک الموت" سے بڑھکر ثابت ہوگا۔

اگر تیموری خاندان کے اس دشمن کو ۱۸۵۶ء میں "مرزا فخرو" ولیعہد کے ساتھ ساتھ ہیضہ ہو جاتا تو میرا خیال ہے کہ "مرزا فرخندہ جمال" نبیرۂ بہادر شاہ متوفی ۱۸۲۸ء کا جنازہ "ترانا بیرام خاں" سے نکلنے کے عوض، قلعہ معلی کے لاہوری دروازہ سے باہر نکلتا اور جامع مسجد دہلی کا شرقی دروازہ آج بھی کھلا ہوا ہوتا۔

پروفیسر یوسف سلیم

حسین مُطربہ

اے سراپا شعریت یوں دست بر بربط ہے تو عشق تیرے ہاتھ کو گویا ہے تارِ ساز سے
تیری صورت ترجمانِ اُس نغمۂ حسرت کی ہے جو اُٹھیگا جو تری مضراب کے اعجاز سے

آبِ رُخ سے دے رہی ہے ساز کو تنویر تُو
دامنِ قرطاس پر نغموں کی ہے تصویر تُو

نورِ نغمہ ہے تری آنکھوں میں رقصاں اس طرح تیرا اندازِ تماشا بھی ہوا بربط فروش
محویت نے تجھ کو اُس رفعت پہ پہنچایا ہے آج قدسیوں نے بھی جہاں دیکھی نہیں پرِ وازِ ہوش

کیفِ نغمہ سے ترا دل اس طرح مخمور ہے
ذوقِ نظّارہ بھی تجھ کو دیکھ کر مسحور ہے

تیری خاموشی سکوتِ نغمۂ فردوس ہے زمزمہ پرواز ہے کچھ یوں ترا اندازِ یہ
مرتعش ہو جائیں تیرے ہاتھ سے گر اسکے تار روح کو میری کرے بیدار تیرا سازِ یہ

تیری موسیقی سے لذّت یاب ہو جانِ حزیں
ڈوب جاؤں تیرے نغموں کے تلاطم میں کہیں

شاکرہ صدیقی

پرواز

مشہور برطانی ہوائی جہاز آر ۱۰۱ کی تباہی نے انگلستان کی دنیائے پرواز میں ہیجان عظیم پیدا کر دیا ہے۔ انسانی ارادوں کی اس المناک ناکامی سے ایک جماعت اتنی متاثر ہوئی ہے کہ وہ پرواز کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتی ہے۔ اور اسے خودکشی کا مترادف سمجھتے ہوئے اس کی قانونی ممانعت کا مطالبہ کر رہی ہے۔

لیکن دوسری جماعت ان عارضی ناکامیوں کو مستقل کامیابی کا پیش خیمہ سمجھتے ہوئے آگے قدم بڑھائے جانے پر مصر ہے۔ اور وہ پرواز کی کامیابی میں انسانیت کی فلاح کا راز مضمر سمجھتی ہے۔ حال ہی میں انگلستان کے ایک مشہور رسالہ نے ان دو جماعتوں کے متخالف و متناقض نظریوں کو دو مقالوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ہم ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے ان مقالوں کا خلاصہ درج ذیل کرتے ہیں تاکہ وہ طرفین کے دلائل کی روشنی میں خود کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں۔

(۱) پرواز کی موافقت میں

پرواز ترقی اور کامیابی ہے۔ اور ترقی اور کامیابی ہر حالت میں اچھی چیز ہے۔ پرواز کی مخالفت اسی طرح دیوانگی کی علامت ہے۔ جس طرح لاسلکی، دخانی جہاز اور سائنس کی دوسری ایجادات کی مخالفت۔ ریل کے ابتدائی زمانہ میں اس کے خلاف بھی ایسا ہی غل مچایا گیا تھا اور اس کے متعلق بھی انہیں خطرات کا اظہار کیا جا رہا تھا جن کا آج پرواز کے متعلق اظہار کیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا تھا کہ دخانی انجن کی ایجاد جنون ہے۔ دیوانگی ہے۔ اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنا ہے اور قدرت کے کاموں میں دخل دینا ہے۔ اس قسم کا اقدام لغو ہے اور اس میں کامیابی ممکن نہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہ رائیں بیہودگی پر مبنی نہ تھیں۔ بڑی غلطی ہوگی اگر ہم پھر اس بیہودگی کا پرواز کے سلسلہ میں اعادہ کریں۔

انسان طبعی طور پر اُڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کی فطرت کا اقتضا ہے کہ وہ جس طرح سمندر پر قابض ہو چکا ہے فضا کو بھی مسخر کرلے۔

یہ سچ ہے کہ ہر سال فضائی سفر میں جو حادثے پیش آتے ہیں وہ افسوسناک ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان حادثوں سے اتنے متاثر ہوں کہ فضا کی طاقت کو ناقابل تسخیر سمجھ کر اس کے مقابلہ میں اپنے ہتھیار ڈالدیں۔ اور اپنی شکست تسلیم کرلیں۔ کیا ریلوں کا تصادم اور کانوں کا انہدام ہمیں اپنے فرائض کی ادائگی سے روک سکا ہے؟

پرواز کی مخالفت کرکے زمانہ کی گھڑی کی سوئیاں پیچھے کو پھیرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ ہم اپنی کوششوں کو پرواز کی گاڑی کا پہیا آگے کو دھکیلنے میں صرف کریں۔ فن پرواز سے دلچسپی رکھنے والے ایسا ہی کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہوائی جہاز کے انجنوں کو بڑی حد تک قابل اطمینان بنالیا ہے اور خطروں سے بچنے کے لئے بہت سے انتظامات کرلئے ہیں۔

پرواز کی خوبیوں کا دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے۔ یہ خوبیاں اتنی ہیں کہ ان کا شمار کرنا بھی دشواری سے خالی نہیں۔

ہوائی جہاز سفر کا بہترین ذریعہ ہے، ایک ہوا باز سمندروں اور پہاڑوں کو اسی طرح عبور کر سکتا ہے جس طرح کھلے میدانوں کو۔ افریقہ کے کٹھن رستے، خطرناک گھاٹیاں اور گرم ریگستان ہوائی جہازوں ہی کے ذریعہ سے طے کئے جا سکتے ہیں۔ اور وہ بھی مہینوں کی جگہ دنوں میں اور دنوں کی جگہ گھنٹوں میں۔

تجارت کی کامیابی بڑی حد تک ہوائی جہازوں کی مرہون منت ہے۔ کناڈا اور امریکہ میں جاکر دیکھو جہاں ہوائی جہاز اس سلسلہ میں بہترین کام انجام دے رہے ہیں۔ اگر کسی تجارتی ذخیرہ میں آگ لگ جائے تو فضا میں منڈلانے والا ہوائی جہاز اسے میلوں سے دیکھ کر فوراً متعلقہ محکمہ کو اطلاع دیدیتا ہے۔ اور پھر ہوائی جہاز ہی کے ذریعہ سے انتہائی سرعت کے ساتھ اس کے بجھانے کا بھی انتظام ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی بحری جہاز خطرہ میں ہو اور دیو پیکر مگرمچھ اسے ہضم کرنے کے لئے منہ کھولے بیٹھے ہوں تو فضا میں منڈلانے والا ہوائی جہاز میلوں سے اس خطرہ کو محسوس کرکے اسے مگرمچھوں کا لقمہ بننے سے بچالیتا ہے۔

طب کی گردن بھی ہوائی جہاز کے احسان سے جھکی ہوئی ہے۔ دنیا

کے بہت سے ایسے حصے ہیں جہاں اچھے معالج نہیں ملتے اور ریل کا جال بھی وہاں ابھی تک نہیں بچھایا گیا ہے۔ ہوائی جہاز کو چھوڑ کر کیا کوئی دوسرا ذریعہ بھی وہاں بروقت طبی امداد مہیا کرنے کا ہو سکتا ہے؟

اگر بالفرض دوسرے ذرائع سے کام لیا بھی جائے تو "تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود" کا مضمون ہوگا۔

کیا محکمہ ڈاک ہوائی جہاز کا ممنون احسان نہیں ہے؟ ولایات متحدہ امریکہ میں ہوائی ڈاک کو جو قبولیت عامہ حاصل ہوئی ہے وہ اس کی بہترین شہادت ہے۔ بہرکیف پرواز کی خوبیوں کا کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کبھی ہوابازوں کو جو حادثے پیش آجاتے ہیں وہ ہمارے ارادوں کو متزلزل نہیں کر سکتے۔ اگر ہم پرواز کی گذشتہ بیس سال کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈالیں تو ہمیں واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ اس قلیل زمانہ میں ہوائی جہاز نے جو ترقی کی ہے دوسرے وسایل حمل ونقل دخانی جہاز، ریل اور موٹر وغیرہ اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔

اگر ہماری ہمتیں پست نہ ہوئیں اور فن پرواز اسی رفتار سے ترقی کرتا گیا تو نصف صدی بعد یہ فن کامیابی کی اس منزل پر پہنچ جائے گا جہاں وہ ہر قسم کے خطروں سے محفوظ ہوگا۔ اس وقت ہماری آیندہ نسلیں پرواز کے متعلق ہمارے موجودہ بے بنیاد خطروں پر بلند آہنگ قہقہے لگائیں گی اور ہمارے ارادوں کی کمزوری پر حیرت و تعجب کا اظہار کریں گی۔

(۲) پرواز کی مخالفت میں

انسان فطری طور پر پرواز کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس کے جسم کا ثقل اور ان اعضا کی غیر موجودگی جو اس کے توازن کو فضا میں قائم رکھ سکیں۔ اس کے راستہ میں حایل ہیں۔ اگر وہ غیر فطری وسائل سے کام لیکر اپنی حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کریگا تو وہ فطرت سے جنگ کریگا۔ اور اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیل دیگا۔ بہترین سائنسدانوں کی مسلسل اور طویل کوششوں کے باوجود پرواز کی دنیا سے موت کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑتی۔ یہی وہ چیز ہے جو ہمارے قدم روک لیتی ہے اور ہمیں غور کرنا پڑتا ہے کہ کیا آئندہ ہمارے لئے فضا کی مہم کو جاری رکھنا مناسب ہوگا؟

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ فن پرواز نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ ابھی تک خطرہ کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ انسانی جان کے لئے ہوا کے جھونکوں میں پانی کی لہروں اور زمین کی سطح سے کہیں زیادہ خطرات ہیں۔ اگر ہم گذشتہ بیس سال کے دوران میں ہوائی سفر کرنے والوں اور ہوائی حادثات سے مرنے والوں کا تناسب معلوم کریں تو بلاشک وشبہ یہ تناسب تمام بحری و بری ذرائع سے سفر کرنیوالوں اور تمام بحری و بری حادثات سے مرنیوالوں کے تناسب سے حیرتناک طور پر زیادہ ہوگا۔

یہ ہرگز ممکن نہیں کہ فضا ہماری ایسی گذرگاہ بن جائے جیسا کہ زمین اور پانی۔ اور جب کبھی کسی مکمل ترین ہوائی سواری بنانے کی کوشش کیجائے گی تو سوائے جان اور مال اور وقت کی تضیع کے اس سے کچھ فائدہ مرتب نہ ہوگا۔ اور بعد میں پچھتانا پڑیگا کہ کاش یہ کوشش کسی مفید کام میں صرف کیجاتی۔

پرواز مدنی کے گن گانا دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فن پرواز کی ترقی سے سوائے اس کے اور کچھ مقصود نہیں ہے کہ میدان جنگ میں انسانی جانوں کی غارتگری کے لئے ایک مہلک ترین آلہ بہم پہنچایا جائے۔ ان ہوائی جہازوں سے تمدن و معیشت کی خدمت ہرگز مقصود نہیں ہے۔ پس کیا آپ کو گذشتہ تباہ کن لڑائیوں نے عبرت و نصیحت کا کوئی سبق نہیں دیا؟ اور کیا آپ آئندہ کے لئے ان کا...... انسداد کرنے کو تیار نہیں ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو آپ کو سب سے پہلے ان آلات کا خاتمہ کرنا پڑیگا جن سے لڑائی کی آگ کو ہوا دی جاتی ہے۔

ہوائی حادثات کا ریلوں کے تصادم اور کانوں کے انہدام سے مقابلہ کرنا صحیح نہیں۔ یہ حادثات انسانیت کی خدمت اور مصالح عامہ کی بہم رسانی کے سلسلہ میں پیش آتے ہیں۔ اور وہ امن وامان کی غارتگری اور تمدن و معیشت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے راستہ میں۔

اگر پرواز نے عام رواج اختیار کر لیا تو بین الاقوامی معاملات میں مزید الجھنیں پیدا ہو جائیں گی اور دنیا کی مختلف سلطنتوں کی باہمی آویزش اور زیادہ ہو جائے گی۔ بے بنیاد شبہوں پر رقیب سلطنتیں ایک دوسرے پر جاسوسی کا الزام لگائیں گی اور باہمی اعتماد جو دنیا کے امن وامان کے لئے بیحد ضروری ہے خاک میں مل جائے گا۔

اگر پرواز نے عام رواج اختیار کر لیا تو خطرناک سیاسی اور اخلاقی مجرموں کے لئے اپنے جرموں کی پاداش سے نجات پانے کے

واسطے ایک نیا راستہ کھل جائے گا جہاں سے گزرنے کے لئے انہیں کوئی پاسپورٹ نہیں دکھانا پڑے گا - اور اس طرح رعیت اور سلطنت کا مفاد خطرہ میں پڑ جائے گا - اگر پرواز نے عام رواج اختیار کر لیا تو قرنطینہ بے معنی ہو کر رہ جائیگا - ایک ملک کی بیماریاں دوسرے ملک میں بآسانی منتقل ہو جایا کریں گی اور دنیا کی صحت برباد ہو جائے گی -

اگر پرواز نے عام رواج اختیار کر لیا تو کیا اس وقت ہماری جانیں محفوظ ہونگی ؟ نہیں ہرگز نہیں - بلکہ قصبوں اور شہروں کی امن پسند آبادیوں کو ہر وقت خطرہ ہوگا کہ کوئی ساغر ناب کا دلدادہ اپنی دماغی پرواز کے سلسلہ میں جسمانی پرواز سے غافل نہ ہو جائے اور مع اپنے ہوائی جہاز کے ان کے سروں پر رقص کرتا نظر نہ آئے - اور ان کا ساغر زندگی بھی نہ چھلکا دے - کیا شراب پیکر موٹر چلانے والوں کے کارنامے آج ہمارے سامنے نہیں ؟ اگر تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیا جائے کہ پرواز میں کچھ خوبیاں بھی ہیں تب بھی وہ مخصوص خوبیاں ان تمام خرابیوں کے مقابلہ میں جن کا ہلاکت آفریں اثر تمام نظام عالم پر پڑتا ہے کچھ حقیقت نہیں رکھتیں -

چھوڑ دو، ہوائی پرواز کے دیوانوں کو تاکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ فضا میں انسانی جان کی قیمت کچھ نہیں لگتی !

چھوڑ دو، ہوائی پرواز کے دیوانوں کو تاکہ یہ اپنی گردنیں موت کے فولادی پنجہ کی گرفت میں دیدیں - مگر خبردار تم اپنی گردنوں کی حفاظت کرو !

سجاد

جذبات فکر

دل یہ فریب خوردۂ وعدۂ وصل یار ہے
گھر مرے آ گئے ہیں وہ، اور مجھے انتظار ہے

عشق کی راہ میں یہی، حسن کا بن گیا غلام
اس دل ناصبور کا، کس کو اب اعتبار ہے

واعظ شرع تو نے کیوں، رند کو کہہ دیا برا
تجھ کو خبر بھی ہے کہ یہ کس کا گناہ گار ہے

ماضی و حال ایک ہیں، میکدۂ نشاط میں
نشۂ شوق رفتہ کا اب بھی وہی خمار ہے

رو کے گلوں کی یاد میں، اپنی تو آنکھیں کھو چکا
کہتی ہے کان میں صبا، آمد نو بہار ہے

رنج و الم کا عشق میں، جب سے ہوں لذت آشنا
درد ہے درد کی دوا، غم مرا غمگسار ہے

اس دل باوفا سے اب، کیوں ہیں یہ بدگمانیاں
آپ کا جاں نثار تھا، آپ کا جاں نثار ہے

کس لئے کی تھی تم نے فکر، مرگ رقیب کی دعا
ماتم غیر میں وہ بت، اب بھی تو سوگوار ہے

سید ابن الحسن فکر
ایم اے

باغبان

اسل ن...... سنگتروں کے باغیچہ میں پھل بیچے گئے تھے، بہت تھوڑے خریدار جمع ہوئے، ایک میں تھا، ایک میرا پڑوسی اور ایک نوجوان ہیرم فروش، جب خرید و فروخت ہو چکی تو ہم پھاٹک کے پاس بیٹھ کر مختلف معاملات پر گفتگو کرنے لگے، اپریل کے گرم دنوں میں باغ کے اندر بیٹھنا، چڑیوں کی نغمہ سرائی سننا، اور آدمیوں کی چہل پہل دیکھنا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔

باغبان ایک قابل احترام بوڑھا شخص تھا۔ اس کے بھولے بھولے گال اور چہرہ پر انتہا بیٹھا ہوا تھا، وہ خاموش تھا لیکن ہماری گفتگو توجہ سے سن رہا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہم سے کسی دلچسپ قصہ کے سننے کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ روشن خیال اور اچھا آدمی تھا۔ وہ اسے بہت پسند کرتا تھا کہ اس کی باتیں سنجیدگی اور پوری توجہ سے سنی جائیں۔

میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ بہادر شخص بڑا بدمعاش ——— یہ بات میرے ہمسایہ نے ایک مزدور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہی جو پانی کا ایک پیپا اٹھائے ہوئے لئے جا رہا تھا، گذشتہ ہفتہ اسی شخص پر شہر میں ڈاکہ ڈالنے کا الزام لگایا گیا تھا لیکن معلوم ہوا کہ اس کا دماغ صحیح نہیں ہے، اس لئے بری کر دیا گیا، مگر ذرا اس کے تھوبڑے کو تو دیکھو کیا وہ خونخوار نہیں معلوم ہوتا؟ روس میں اس زمانہ میں اکثر ناکارہ لوگ بری کر دئے جاتے ہیں۔ صرف اس بنا پر کہ وہ مریضانہ حالت یا کسی اور خرابی کا ثبوت دے دیتے ہیں۔ مجرموں کی ایسی بریت اور اسقدر نرمی کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ یہ لوگوں کو بد اخلاق بناتی ہے۔ اور انصاف کی قدر نہیں رہتی۔ کیونکہ لوگ جرم کی کوئی سزا نہیں پاتے ہمارے زمانہ میں شکسپیر کا یہ قول صادق آتا ہے کہ ہمارے بدکاری کے عہد میں نیکی کو خود بدی سے معافی مانگنا چاہیئے۔

ہیرم فروش نے کہا، "تم بالکل سچ کہتے ہو کیونکہ منصف جب مجرموں کو بری کر دیتے ہیں تو قتل اور غارتگریاں زیادہ ہو جاتی ہیں۔

باغبان نے ہماری طرف مخاطب ہو کر کہا۔

حضرات! میں بری کرنے والے فیصلوں کا احترام کرتا ہوں۔ میں اخلاقی یا انصاف کی بے حرمتی کرنے سے نہیں ڈرتا، برخلاف اس کے اپنے دل میں اطمینان محسوس کرتا ہوں۔ اس وقت جبکہ میرا ضمیر مجھ سے کہتا ہے کہ منصفوں نے کسی مجرم کو بری کرنے میں غلطی کی ہے۔ تو بھی میں اپنے آپ کو فتحمند سمجھتا ہوں، آپ ذرا غور فرمائیے کہ اگر منصفین گواہوں یا وکیل کی بحث سے زیادہ انسان پر اعتماد کرتے ہیں۔ تو یہ "اعتماد" بجائے خود تمام مروجہ خیالات سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا۔ یہ اعتماد وہی چند لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو مسیح کو مانتے اور ان پر ایمان لاتے ہیں۔

اچھا خیال ہے ——— میں نے کہا۔

بیشک اچھا ہے لیکن نیا نہیں ہے، مجھے یاد ہے کہ کسی وقت میں نے اسی مضمون کے متعلق ایک کہانی بھی سنی ہے جو بہت ہی دلچسپ ہے ——— باغبان نے کہا اور مسکرایا ——— یہ کہانی میری دادی نے سویڈش زبان میں بیان کی تھی۔ روسی زبان میں اچھی نہیں معلوم ہوگی لیکن ہم نے کہا، نہیں آپ بیان کر ہی دیجئے۔

اس نے سگریٹ جلایا اور کہانی شروع کی :-

ایک چھوٹے سے شہر میں ایک آدمی رہا کرتا تھا، اس کی نہ بیوی تھی اور نہ بچے اور نہ وہ زیادہ خوبصورت ہی تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا اور لوگوں کا علاج کیا کرتا تھا، وہ ہمیشہ افسردہ اور خاموش رہا کرتا تھا صرف ضروری بات کرتا، عورت مرد جو آتے ان کے سلام کا جواب ہاتھ سے دیتا تھا، اس کی زندگی بہت سادہ بلکہ درویشانہ تھی۔ لیکن تھا وہ بہت بڑا عالم، دن رات غور و فکر، کتب بینی، اور علاج معالجہ میں مصروف رہا کرتا۔ شہر کے لوگ اسے اچھی طرح جانتے تھے اور بہت خوش تھے کہ خدا نے ان کے لئے ایسا آدمی پہنچا دیا جو ان کا علاج کرنا جانتا ہے۔ وہ فخر کرتے تھے کہ ہم میں ایک ممتاز آدمی موجود ہے، اگرچہ وہ اجنبی اور پردیسی تھا لیکن کچھ روز بعد تمام شہر والوں سے محبت کرنے لگا، وہ خود سل کا مریض تھا لیکن جب کوئی غریب آدمی اسے بلانے آتا تو اپنی بیماری اور کمزوری کو بھول کر اس کے ساتھ اونچے اونچے مقامات پر چلا جاتا، نہ اسے گرمی کی پروا ہوتی نہ جاڑے کی، نہ بھوک کا خیال ہوتا، نہ پیاس کا، فیس کبھی لی نہیں،

بلکہ حاجتمندوں کو دوا بھی مفت دیدیا کرتا، ایک اور عجیب بات تھی کہ مریضوں میں سے کوئی مرجاتا تو وہ قبرستان تک جنازے کے ساتھ جاتا اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ ملکر خوب روتا ۔

شہر والوں کے لئے وہ بہت جلد ضروری اور لازمی شخص ہو گیا، وہ آپس میں کہا کرتے تھے کہ ہم بغیر اس شخص کے پہلے کس طرح زندہ رہ سکے، ان کی شکر گذاری حد سے زیادہ تھی، بوڑھے اور بچے، اچھے اور بُرے، ایماندار اور بدمعاش خلاصہ یہ کہ سب اس کی عزت کرتے تھے ۔

اس شہر اور اس کے نواح میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس کے ساتھ برائی کرنا تو کجا برائی کا خیال بھی کر سکے، جب وہ باہر جاتا تو گھر کے دروازے کھلے چھوڑ جاتا ۔ کیونکہ اسے یقین کامل تھا کہ کوئی شخص میری چیز نہیں چرائیگا ۔ وہ اکثر چوروں اور ڈاکوؤں کے علاج کے واسطے گھنے جنگلوں میں گیا اور ذرا خطرہ محسوس نہیں کیا ۔ ایک مرتبہ کسی بیمار کو دیکھکر رات گئے گھر واپس آ رہا تھا کہ جنگل میں اس پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا لیکن جب اسے پہچانا تو بہت شرمندہ ہوئے اور سلام کر کے اس سے پوچھا "کیا آپ کھانا کھائیں گے" لیکن اس نے جواب دیا "نہیں" تمام ڈاکو شہر تک اس کے ساتھ آئے وہ خوش تھے کہ ان کو ایک بڑے شخص کی خدمت کا موقعہ ملا ۔ اس کے علاوہ مجھے یاد ہے کہ دادی اماں بیان کرتی تھیں کہ جانور بھی اسے پہچانتے تھے اور دیکھ کر خوش ہوتے تھے ۔

اور یہ آدمی جو اپنی مقدس زندگی کی وجہ سے ہر بدی کے لئے روک تھا ۔ جس کو چور اور ڈاکو بھی دوست رکھتے تھے ۔ ایک دن صبح کو مرا ہوا پایا گیا، وہ خون سے لتھڑا ہوا تھا اور اس کی کھوپڑی کھل گئی تھی، اور اس کے زرد چہرہ پر خوف نہیں بلکہ تعجب کی علامتیں نمایاں تھیں ۔ اس واقعہ سے شہر والوں کو جسقدر صدمہ ہوا اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں ۔ مایوسی کی حالت وہ اپنی آنکھوں کا اعتبار نہیں کرتے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھتا تھا کہ کیا کوئی اس شخص کو قتل کر سکتا ہے؟

منصفوں نے نعش کا معائنہ اور مقدمہ کی تحقیقات کر کے کہا کہ ہم کو قتل کی تمام علامتیں نظر آتی ہیں، لیکن ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو ہمارے معالج کو قتل کر سکے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی قسم کا قتل نہیں ہے اور ثبوت کی علامتوں کا اجتماع محض ایک اتفاق ہے ہم قیاس کرتے ہیں کہ معالج اندھیرے میں خود اس گڑھے میں گرا اور ایسی شدید ضرب لگی کہ مرگیا ۔

شہر کے باشندوں نے بھی یہ رائے قبول کر لی ۔ اور اسے دفن کر دیا ۔ کوئی شخص یہ خیال نہیں کرتا تھا کہ وہ قتل کیا گیا ہے، کیونکہ ایسے شخص کا وجود ہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا جو باوجود اپنی انتہائی شرارت، بدکرداری اور سنگدلی کے اسے قتل کرنے کی جرأت کرے آخر بے حسی اور سنگدلی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ۔

اتفاق سے لوگوں نے اس کے قاتل کا پتہ چلا لیا ۔ وہ کوئی آوارہ گرد شخص تھا اور بارہا سزا بھگت آیا تھا اور اپنی بدمعاشی کی وجہ سے مشہور تھا ۔ وہ شراب خانہ میں اس معالج کی گھڑی فروخت کر رہا تھا ۔ اس پر شک کیا گیا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا ۔ اس کے گھر کی تلاشی لی گئی، وہاں ایک قمیص ملی جس پر خون کے نشان تھے اور اس مقتول کا ایک خنجر دستیاب ہوا جس پر اس کا نام کھدا تھا ۔ اب ثبوتِ جرم کے لئے اور کیا درکار ہے؟ ملزم جیلخانہ پہنچا دیا گیا ۔ شہر والے بیحد برہم تھے اور کہتے تھے ۔ ناقابلِ یقین، ایسا نہیں ہو سکتا، لوگوں کو احتیاط چاہیئے کہ ان سے غلطی نہ ہو جائے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جرم کی علامتیں غلط ثابت ہوتی ہیں ۔

مقدمہ کی تفتیش کے وقت ملزم سختی سے انکار کرتا تھا ۔ لیکن ہر چیز اس کے خلاف تھی اور اس کے جرم کو ثابت کرتی تھی منصفوں کی گویا عقل جاتی رہی تھی کوئی دس مرتبہ انہوں نے روداد کا مطالعہ کیا ۔ آخر کار "منصف اعلیٰ" نے قاتل کی طرف خطاب کر کے کہا کہ

اے مجرم منصف تم کو اس معالج کا قاتل قرار دیتے ہیں ۔ اور تمہارے لئے حکم دیتے ہیں ....

منصف اعلیٰ "قتل" کہنا چاہتا تھا کہ کاغذ اس کے ہاتھ سے گر پڑا جس پر فیصلہ لکھا گیا تھا اس نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا ۔

"نہیں اگر میں نا منصفانہ فیصلہ کرونگا تو خدا مجھ کو سزا دیگا"

"میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ شخص قصوروار نہیں ہے اور میرے خیال میں ایسا کوئی شخص موجود نہیں ہے جو اس کا قاتل سمجھا جائے ۔"

باقی منصفوں نے اعتراف کیا اور قاتل چھوڑ دیا گیا ۔ کسی شخص نے منصفوں کی اس نا انصافی پر ملامت نہیں کی ۔ دادی نے یہ بھی کہا کہ ایک انسان پر اعتماد کرنے کی وجہ سے خدا نے تمام شہر والوں کے قصور معاف

کردے۔

جب لوگ یہ یقین کرتے ہیں کہ انسان اس کی (خدا کی) تصویر ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور اگر کوئی انسان کی حقیقت کو بھول جاتا ہے اور کتے سے بدتر سمجھتا ہے تو وہ ناراض ہوتا ہے، بدی کرنے والا فیصلہ شاید شہر کے باشندوں کے لئے مضر ہو لیکن آپ یہ بات تسلیم کریں گے کہ ایک انسان پر اعتماد کا کسقدر اچھا اثر پڑتا ہے۔

اعتماد جو کبھی بے ثمر نہیں رہتا وہ ہمارے دلوں میں شریفانہ احساسات پیدا کرتا ہے اور ہم کو ہر انسان سے محبت اور اس کا احترام کرنے کی ترغیب دیتا ہے، جو بات ہے وہ یہ ہے۔

باغبان نے اپنا بیان ختم کر دیا، میرا ہمسایہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن باغبان نے ایک ایسا اشارہ کیا جس کا یہ مفہوم تھا کہ وہ اعتراضات پسند نہیں کرتا۔ اور ہمارے پاس سے جاکر پھر کام میں مصروف ہو گیا۔

(چیخوف)

شعری انصاری

غزل

لطفِ نہاں سے جب جب وہ مسکرا دیئے ہیں
مَیں نے بھی زخم دل کے اُن کو دکھا دیئے ہیں

کچھ حرفِ آرزو تھا کچھ یادِ عیشِ رفتہ
جتنے تھے نقش دل میں، ہم نے مٹا دیئے ہیں

فرطِ غم والم سے جب دل ہوا ہے گریاں
اُس نے عنایتوں کے دریا بہا دیئے ہیں

دیکھے ہیں تیرے تیور دھوکا نہ کھائیں گے اب
اُٹھتے تھے ولولے کچھ، ہم نے دبا دیئے ہیں

اِس دلنشیں ادا کا مطلب کبھی نہ سمجھے
جب ہم نے کچھ کہا ہے وہ مسکرا دیئے ہیں!

کچھ شوخ کر دیا ہے چھیڑوں سے ہم نے تم کو
کچھ حوصلے ہمارے تم نے بڑھا دیئے ہیں

کیا کوئی تجھ کو دیکھے پردہ اُٹھانے والے
تو نے تجلّیوں کے پردے گرا دیئے ہیں

کرتا ہوں وحشت اُن سے عرضِ نیاز ہر دم
اِس کام کے طریقے دل نے بتا دیئے ہیں

رضا علی وحشت

ٹامس ہارڈی

شاعر یا فسانہ نگار؟

ٹامس ہارڈی شاعر تھا یا افسانہ نگار؟ یہ ایک نہایت حل طلب سوال ہے۔ یہ بات کہ اسے ویسٹ منسٹر ایبے میں دفنایا گیا۔ اس کی شہرت عام اور بقائے دوام کی کفیل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ فرانسس کیرے جو کہ شعراء کی صف میں ڈاکٹر جانسن کے پہلو بہ پہلو دفن ہے۔ آج دس فی صدی اشخاص بھی نہیں جانتے کہ وہ کون تھا ولیم بلیک جو کہ اپنی زندگی میں انگلستان کا مایۂ ناز شاعر تھا۔ آج ویسٹ منسٹر ایبے میں اس کی قبر کے نشان کے متعلق ایک بورڈ لگا ہوا ہے جس پر لکھا ہے

"شاعر یہیں کہیں دفن ہے۔"

ان مثالوں سے میرا مقصد یہ ہے کہ کسی اعلیٰ شخصیت کی قابلیت کا صحیح معیار نہ صرف اس کے ماحول زمانہ میں بلکہ کسی آئندہ زمانہ میں بھی نہیں قائم کیا جا سکتا۔ معاصرین کا فیصلہ آخری فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔

ہارڈی کی شہرت بحیثیت ناولسٹ نہایت آہستہ رفتار سے بام ثریا تک پہنچی کیونکہ اس کے رقت انگیز اور دلگداز افسانے انگریزی ادب پر نہایت آہستہ آہستہ حاوی ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ اس کی شخصیتِ عظیم جملہ انگریزی لٹریچر پر چھا گئی اور اس نے جو کچھ بھی تصنیف کیا مقبول ہو گیا۔

مسئلہ پیش نظر یہ ہے کہ ہارڈی نے کیوں اپنی عمر کے آخری تیس سال شاعری میں صرف کئے؟ ایک نکتہ رس نقاد نے یوں لکھا ہے:۔

"اگر ہارڈی نے بحیثیت فسانہ نگار شہرت حاصل نہ کی ہوتی تو اس کی شاعری کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر کبھی نہ دیکھتا۔"

ہارڈی کی تربیت اور تعلیم بحیثیت معمار ہوئی تھی چنانچہ اس کا سب سے پہلا مضمون "میں نے اپنا گھر کس طرح بنایا" رسالہ چیمبر ۱۸۶۵ء میں اس بات کا شاہد ہے اس کا سب سے پہلا افسانہ ڈسپریٹ ریمیڈیز ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا لیکن میکملن اینڈ کو سے اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ اس سے پیشتر بھی اس نے ایک ناول بھیجا تھا مگر اس کمپنی کے منیجر نے یہ لکھ کر واپس کر دیا تھا "ابھی اور مشق کی ضرورت ہے"۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ افسانہ ڈسپریٹ ریمیڈیز ایک حد تک کافی مقبول ہوا۔ لیکن ہارڈی اپنے ایک خط میں لکھتا ہے کہ یہ کتاب کامیابی کی حد تک نہیں پہنچی۔ رسالہ "سپیکٹر" نے نہایت مضحکہ آمیز رنگ میں اس پر تنقید کی، تاہم بحیثیت تصنیف اول ہونے کے جسقدر اس کی فروخت ہوئی وہ کامیابی کہلائی جا سکتی ہے۔ "ٹنسلے" لکھتا ہے "چونکہ اس کی تصنیفِ اول اپنے مصنف کی شخصیتِ عظمیٰ کے راز کو بے نقاب کر رہی تھی اور اس کے تیور کہہ رہے تھے کہ اس کا لکھنے والا ایک دن دنیا کا ایک بہترین مصنف ہوگا۔ اس لئے میں نے اس کے دوسرے ناول "انڈر دی گرین ووڈ ٹری" کے حقوق طبع حاصل کر لئے۔ میرے نزدیک یہ نثر کا ایک نادر ترین نمونہ تھا اور میں نے ابتدا میں اسے مجلد ایڈیشن میں شائع کیا، لیکن مقبول نہ ہوا بعد ازاں میں نے مختلف سستے ایڈیشنوں میں۔ شائع کیا جو کہ ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔

ہارڈی نے جب فار فرام میڈنگ کراوڈ اپنا عمدہ ترین افسانہ قسط وار رسالہ کارن ہل میں بھیجنا شروع کیا تو ملک بھر میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ لیکن ہارڈی گمنام طور پر اقساط شائع کرواتا رہا۔ بعد ازیں جب یہ افسانہ کتابی صورت میں شائع ہوا تو ادبی دنیا میں ایک حیرت برپا ہو گئی۔ اس کتاب کے بعد ہارڈی کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے انگلستان کے طول و عرض میں لوگ بھول گئے کہ وہ ایک معمار تھا اب وہ افسانہ نگاری کا بہترین قائد خیال کیا جانے لگا۔ جنوبی انگلستان ویسیکس اس کے افسانوں کا میدانِ تخیل واقع ہوا۔ اس کے بعد اس کا شاہکار... ریٹرن آف دی نیٹو رونما ہوا جس سے انگلستان کے حلقۂ افسانہ نگاران میں ایک سنسنی پیدا ہو گئی۔ ادبی مذاق میں ایک خاصہ انقلاب پیدا ہو گیا اور ہارڈی کا ذاتی جوہر عیاں ہوا۔ اس کے بعد "جوڈ" اور "ٹیس" دونوں افسانے معرض ادب میں اسقدر چمکے کہ ہارڈی کی شخصیت

بحیثیت افسانہ نگار ستایش خیال کی جانے لگی۔

"جوڈ" ایک ایسا افسانہ ہے جس پر امریکہ اور انگلستان میں تنقید کا طوفان ٹوٹ پڑا۔ کیونکہ یہ ایک ٹریجڈی ہے جس سے یورپ کی مسرتناک فضا پر حسرت و یاس کے سیاہ بادل چھا گئے اس کا پلاٹ اسقدر دردناک اور دہشت انگیز ہے کہ انسان آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا اور پڑھنے والے کی مسرت انگیز قوتیں زائل ہو جاتی ہیں۔ وہ سین کسقدر رلا دینے والا ہے جب فلاکت زدہ جوڈ کو اپنی ماں کی زبانی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ وہ زار و قطار روتا ہے اور فرطِ کرب میں ماں سے کہتا ہے۔

"پیاری ماں! اس حالت میں جبکہ آسمان ہم پر ظلم و ستم ڈھا رہا ہے اور زمانہ کی فضا ہمارے لئے ناسازگار ہے تم نے بچہ پیدا کرنے کی خواہش کیوں کی۔ آہ بچہ پیدا ہونے پر ہمارے گھر کی فضا کسقدر ہیبتناک ہو جائے گی"۔ اس کے بعد وہ اپنے چھوٹے بھائی اور بہن دونو کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیتا ہے اور پھر خودکشی کر لیتا ہے۔

ہارڈی کی تصنیفات کے صفحے الٹتے جائیے تو آپ کو اس کا مرکزی تفکر صرف دو باتوں میں ملیگا۔ افسانے کی ریخ آور رفتار اور عبارت کا حسین نباہ، غالباً اسے یقین ہو گیا تھا کہ کسی چیز کی خوبی ظاہر کرنے کے لئے اس کی برائی اور تاریک پہلو کو خوب روشن کیا جائے۔ اور انسان کے اخلاق اور اسکی شخصیت پر چار چاند لگانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسانی کمزوریاں اور سافل خامیاں بے نقاب کی جائیں۔ اور اس کی تصنیفات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خدا کی سلطنت میں شیطان کی سازش ایک ازلی و ابدی شے ہے اور اس سازش میں حصہ لئے بغیر انسان منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا خصوصاً "جوڈ" میں اس نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ کرۂ ارض پر "کینہ وری" "بدباطنی" اور ضرر رسانی کی روح ہر وقت خدا کے مدِ مقابل رہتی ہے اور شیطانی طاقتیں عموماً خداوندی طاقتوں کا مقابلہ کرتی نظر آتی ہیں۔

امریکہ کے ایک رسالہ میں شائع ہوا تھا کہ "ٹیس" اور "ریٹرن آف دی نیٹو" دونوں افسانے اس کی اعلیٰ تصانیف ہیں۔ اور "جوڈ" اور ڈسپریٹ ریمیڈیز اسفل ہیں۔ "جوڈ" کو غالباً اس کی انتہائی یاس انگیزی کی وجہ سے برا کہا گیا ہے ورنہ مصنف کے مطمحِ نظر کے مطابق وہ اس کا بہترین شاہکار ہے۔

"جوڈ" اس کا آخری افسانہ ہے اور جب یہ رسالہ میں قسط وار نکلنا شروع ہوا تو اس پر تمام انگلستان اور امریکہ میں سخت نکتہ چینی ہوئی۔ ہارڈی نے ایڈیٹر رسالہ کو لکھا کہ وہ "جوڈ" کی قسطوں کا سلسلہ بند کر دے کیونکہ آئندہ اقساط میں وہ افسانہ کے مرکزی اور انتہائی تخیل تک پہنچنے والا ہے اور اسے علم نہیں کہ اس کا قلم اس کو تخیل کی کس قلمرو میں لے جائے لیکن ایڈیٹر کے اصرار پر اسے ختم کرنا ہی پڑا۔ جب یہ افسانہ کتابی صورت میں شائع ہو گیا تو انگلستان اور امریکہ کے رسالوں کے صفحے کے صفحے اس کی تنقید میں بھرے ہوئے نظر آئے۔ ایک امریکن عورت گلڈ نے جس نے "جوڈ" کے خلاف قلم اٹھایا، اس کتاب کی تردید میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی اور کہتے ہیں کہ اسی عورت کے پے در پے مضامین کی وجہ سے ہارڈی نے افسانہ نگاری کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا۔ ایک اخبار میں وہ لکھتی ہے:۔

"ہارڈی کی ادبی اور روحانی موت"

"مصنف نے اپنے ہاتھوں سے اپنی شہرت خاک میں ملا دی"

"کوئی اخبار "جوڈ" کو شائع کرنے کی اجازت نہیں دیگا"

"بربریت اور دحشت کی نادر ترین مثال"

"نہایت گندی ذہنیت کا مظاہرہ"

لیکن جلدی ہی "جوڈ" کا حقیقی رنگ لوگوں پر کھل گیا اور اس کی نہاں خوبیاں آشکارا ہو گئیں اور انگلستان کے کونہ کونہ میں وہ کتاب ہارڈی کی زندگی میں ہی مقبول ہو گئی اور متذکرہ بالا عورت نے ہارڈی کو معافی کے خط لکھے اور مصنف سے بالمشافہ تبادلۂ خیالات کیا وہ لکھتی ہے۔

"اگر میں ہارڈی سے پہلے ملاقات کر لیتی تو میرے قلم سے ایسے زہر آلود مضامین نہ نکلتے، بات دراصل یہ تھی کہ میں اس وقت ہارڈی کا مفہوم نہ سمجھ سکی"

لیکن ہارڈی اس نکتہ چینی سے اسقدر رنجیدہ خاطر ہو گیا کہ اس نے افسانہ نگاری بالکل ترک کر دی اور اپنی زندگی کے باقیماندہ تیس سال شاعری میں صرف کئے۔ اس کی پہلی نظم ۱۸۷۵ء میں جنٹلمین میگزین میں شائع ہوئی ایک جگہ ہارڈی لکھتا ہے:۔

"میں نے اپنی زندگی کے پچیس سال عوام کو خوش کرنے کے لئے افسانہ نگاری میں صرف کئے اور باقیماندہ تیس سال میں میں نے اپنے اطمینانِ قلب کے لئے شعر نگاری کی"

لیکن اس کا مطمح نظر یعنی یاس آشنائی اور دنیا کے ہر واقعہ کے تاریک پہلو کو مدِ نظر رکھنا شاعری اور شعریت میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اس میں شک نہیں کہ ہم نے اسے بحیثیت افسانہ نگار دفن کیا ہے۔ لیکن ممکن ہے ایک صدی کے بعد اس کو بحیثیت شاعر دوبارہ زندہ کیا جائے۔ کیونکہ زمانے کا معیار بدلتے دیر نہیں لگتی، کسے کیا معلوم کہ آج کے فلسفیوں کے نظریوں کی کل تردید کر دی جائے جیسا کہ کل کے فلسفیوں کو آج از سرِ نو زندہ کیا جا رہا ہے۔

ہارڈی فطرت انسانی کو سب سے زیادہ سمجھنے والا تھا۔ قدرت کے راز ہائے سربستہ میں اسے خاص دخل تھا لیکن جب قدرت مسرت زا رنگ میں ہو تو وہ اس سے کبھی بھی متفق نہ ہو سکا۔ گناہ کے اندھیروں اور حسرت و یاس کی تاریکیوں میں اُسے ایک خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔

(ترجمہ)

خلیل بی اے

انقلاب

عروج کا دور آ رہا ہے، جو ذرہ ہے آفتاب ہوگا
روش زمانہ کی کہہ رہی ہے کہ اِک بڑا انقلاب ہوگا

فلک سے برسیں گے وہ شرارے، زمین وقفِ تپش ہوگی
سکونِ خلوت کدہ کا خوگر ستم کشِ اضطراب ہوگا

ہوا ہے اِک داغ دل میں پیدا، خدا اُسے بخت ور بنائے
جو بچ گیا تو اندھیرے گھر کا یہی کبھی آفتاب ہوگا

نقاب پرتو ہے یہ تجلّی کہ ایک عالم کو بیخودی ہے
نہ جانے کیا حشر ہوگا برپا جو وہ کبھی بے نقاب ہوگا

کروں تو کیا شکوۂ تغافل کہ خود نہیں جرأتِ تکلّم
اجازتِ عرضِ حال بھی ہو تو گفتگو میں حجاب ہوگا

یہ عاشقی کا رواجِ کہنہ جہاں سے اُٹھ جائیگا سراسر
نہ حُسن افسوں طراز ہوگا نہ قلب کو پیچ و تاب ہوگا

دلِ جنوں آشنا سے کہدو کہ رنگِ آشفتگی نہ چھوڑے
سُنے نہ کچھ عقل کی نصیحت نتیجہ ورنہ خراب ہوگا

اِدھر کہاں آئے آپ واعظ؟ یہ فصلِ گل اور نجم گھر پر
کہیں کسی میکدے میں بیٹھا رہینِ لطفِ شباب ہوگا

نجم ندوی

عقل و عشق

سطح بیں! تجھ کو نہیں معلوم اسرارِ حیات
دیکھتا ہے عقل کی آنکھوں سے انوارِ حیات؟

عقل کیا ہے؛ ذہنِ انساں کے تدبّر کا جمال
عقل کیا ہے؛ صنعتِ غور و تفکّر کا جمال

عقل جُز فکرِ تحیّر آفریں کچھ بھی نہیں
عقل کی تخیُّل و تشکیلِ حسیں کچھ بھی نہیں

زندگی اعمال کے آتشکدے کا نام ہے
زندگی جوشِ جنوں کے ولولے کا نام ہے

زندگی مائل نہیں ہوتی کبھی افکار پر
زندگی تو جان دیتی ہے ازل سے دار پر

زندگی اظہارِ سوزِ زندگی کا نام ہے
زندگی اِک اضطرابِ دائمی کا نام ہے

مانگ پروانے سے ذوقِ احترام زندگی!
سیکھ اہلِ عشق سے رازِ دوامِ زندگی

عشق کی دیوانگی فرزانگی کی جان ہے
عشق کی وحشت جلالِ زندگی کی شان ہے

توڑ دیتا ہے جنونِ عشق قانونِ فنا؛
سرد ہو جاتا ہے رُعبِ عشق سے خونِ فنا

کربلا میں عشق نے اسلام زندہ کر دیا
عاشقوں نے کٹ کے حق کا نام زندہ کر دیا

گو تدبّر بھی ہے قوموں کی ترقی کا کفیل
گو خرد کی روشنی بھی ہے ہدایت کی دلیل

لیکن اے ہمدم گدازِ قلبِ ہستی کی قسم
مجھ کو صہبائے غمِ ملّت کی مستی کی قسم

عشق میں مضمر ہیں اسرارِ دوامِ زندگی
عشق سے ہوتی ہیں قومیں شاد کامِ زندگی

عادم

انگلستان کے اخبارات
اور
ہندوستان

آجکل ہندوستان اور انگلستان کے تعلقات بہت خراب ہو رہے ہیں۔ ایک دفعہ مسٹر پیک نے جو برٹش ایسوسی ایشن کے پریزیڈنٹ تھے، ایسوسی ایشن کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "ہندوستان اور انگلستان کے باہمی تعلقات کی ناخوشگواری کا بہت بڑا سبب ایک دوسرے کے معاملات میں دلچسپی کا فقدان اور لاعلمی ہے۔ اور تعلقات کو سدھارنے کا بہترین ذریعہ یہی ہے کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے معاملات میں دلچسپی لیں اور ایک دوسرے کی مشکلات پر ہمدردی اور انصاف سے غور کریں۔" ایک دوسرے کے حالات کا ہمدردانہ مطالعہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ فریقین دیانتداری کے ساتھ اس کے لئے کوشش کریں اور اخبارات جو رائے عامہ کو بنانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں نیک نیتی کے ساتھ اس کے لئے کوشاں ہوں۔

اب تک جو اختلاف کی خلیج دن بدن وسیع ہو رہی ہے اور تعلقات دن بدن خراب ہو رہے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ انگلستان کے عام اخبارات کا رویہ ہندوستان کے معاملات کے متعلق اس قدر انصاف پسندانہ نہیں جسقدر ہونا چاہیئے۔ عام طور پر ان میں رواداری مفقود ہے اور تنگدلی اور تعصب کا اثر غالب ہے اور خصوصاً جہاں ہندوستانیوں کے جذبات اور رائے عامہ کا تعلق ہو وہاں پر تو ان کا رویہ اور بھی قابل اعتراض ہو جاتا ہے۔

انگریزی میں ایک مثال ہے:-

narrow minds and great
Empires cannot go together

حاکمانہ شان و عظمت اور تنگدلی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ ہندوستان کے متعلق جو مضامین انگلستان کے اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے ہندوستان کے حالات سے بالکل ناواقف ہیں۔ حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں لوگوں کو باخبر بنانا ہے اور رائے عامہ کو درست کرنا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے ہندوستان پر مضامین لکھنے والوں کے لئے معیار قابلیت ہی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے معاملات سے قطعی ناواقف ہوں کیونکہ معمولی معمولی باتیں اور عام اعداد و شمار جو معمولی کیلنڈر و ٹیبل سے بھی معلوم ہو سکتے ہیں اُن میں بھی لاعلمی کا اظہار ہوتا ہے اور مضمون نگار کے دل میں جو کچھ آتا ہے نہایت بے تکلفی سے لکھ دیتے ہیں اور اس اخبار کے ناظرین اُن مضامین کو سو فیصدی درست سمجھکر پڑھتے ہیں۔ ان اخبارات کا مطالعہ کریں تو ان میں بعض دفعہ ایسی مضحکہ خیز باتیں ہوتی ہیں جنہیں پڑھکر غصہ بھی آتا ہے اور ہنسی بھی۔ مثلاً یہ کہ مرہٹے اور موپلے ایک ہی قوم ہیں یا یہ کہ اکالی سکھوں کی ایک ذات ہے۔

چند ہی دن ہوئے انگلستان کی ایک مشہور سیاح خاتون روزیٹا فاربس نے لکھا کہ "امام حسینؑ کی شادی حضرت نبیؐ کریم کی بیٹی سیدہ فاطمہؓ کے ساتھ ہوئی تھی۔ اور کوفہ کے پٹھانوں نے اپنے بادشاہ معاویہ کے حکم سے انہیں اپنے شہر سے نکال دیا تھا۔" نعوذ باللہ کسی نے ایسے ہی موقعہ پر کہا تھا ؎

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا
الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا

کہاں واقعہ کربلا اور کہاں معاویہ۔ کہاں کوفہ اور کہاں پٹھان۔ اور لطف یہ ہے کہ سیاح موصوفہ یہ بھی جانتی ہیں امام حسینؑ آنحضرتؐ کے نواسے ہیں۔ پھر بے تکلفی سے یہ بھی لکھ دیا کہ ان کی شادی آنحضرتؐ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ معاذ اللہ۔

جب تک یہ صورت حالات ہے کیا کبھی بھی یہ امید کیجا سکتی ہے کہ دونوں ممالک کے تعلقات خوشگوار ہو سکتے ہیں؟۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ کے اخبارات کا رویہ ہندوستان کے متعلق بہت بہتر ہے وہ جب بھی ہندوستان کے متعلق کچھ لکھتے ہیں وسعت قلب اور انصاف کے ساتھ لکھتے ہیں۔

جن دنوں پرنس آف ویلز ہندوستان تشریف لائے تھے ان دنوں لنڈن کے ایک اخبار نے لکھا کہ ہندوؤں کے اعلیٰ خاندانوں کی عورتوں نے شاہزادہ کی آمد پر اپنی وفاداری کا اظہار پبلک میں ناچ کر اور گا کر کیا۔ وہ لوگ جو ہندوستان کے حالات سے واقف ہیں انہوں نے ان ہتک آمیز مضامین پر یقیناً نفرت کا اظہار کیا ہوگا۔ آپ اندازہ کریں کہ ان مضامین کا لاکھوں ناظرین پر کیا اثر ہوا ہوگا جس ملک میں ایک معمولی سے معمولی مزدور بھی یہ پسند نہیں کریگا۔ کہ اپنی بیوی یا لڑکیوں کو کسی بادشاہ کی آمد پر پبلک میں ناچ اور گانے کی اجازت دے۔ اور وہ اس کو اپنی توہین خیال کریگا۔ وہ جس وقت اخبار میں پڑھتا ہے تو حیران رہجاتا ہے کہ کیا یہی وہ ہندوستانی عورت ہے جس کی شرم وحیا اس وقت بھی مشہور تھی جبکہ یورپ وحشت اور بربریت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اور تہذیب کے نام سے بھی ناآشنا تھا اور کیا وہ پرنس آف ویلز کی آمد پر وفاداری کے جذبہ میں ایسی بے خود ہوئی کہ پردہ، شرم وحیا سب کو یک قلم خیرباد کہدیا۔ یہ اخبارات ہندوستان میں بھی آتے ہیں کیا ایسے مضامین دونوں ممالک کے تعلقات کو کبھی بھی خوشگوار بنا سکتے ہیں۔ اگر ایک دوسرے کے حالات ہمدردی سے مطالعہ کرنے کی کوشش کیجاتی تو ایسی باتیں بآسانی رک سکتی تھیں۔

پچھلے سال جب مسٹر گاندھی نے قانون نمک کے خلاف مشہور تاریخی سفر اختیار کیا تو میرے ایک دوست نے جو ان دنوں میڈیکل تعلیم کے لئے انگلستان گئے ہوئے تھے بتلایا کہ وہاں پر بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ مہاتما جی باقاعدہ آلات جنگ سے مسلح ہونگے۔ مگر جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ مہاتما جی گرفتار ہو گئے ہیں تو انہیں بیحد مایوسی ہوئی کہ کوئی بندوق وغیرہ بھی نہیں چلی اور مہاتما جی اسقدر خاموشی اور آسانی سے گرفتار ہو گئے۔

انگلستان کے اخبار نویسوں کی ہندوستان کے معاملات میں زیادہ دلچسپی نہ لینے کی وجہ یہ بھی ہے کہ جو خبریں انہیں ہندوستان کے متعلق پہنچتی ہیں وہ حکومت کے ذریعہ پہنچتی ہیں اول تو وہ بالکل مختصر ہوتی ہیں دوسرے انہیں ایسے خشک اور غیر دلچسپ رنگ میں لکھا جاتا ہے کہ پڑھنے والوں میں قطعاً دلچسپی پیدا نہیں ہوسکتی۔ وہ خبریں اور مضامین جو غیر سرکاری ذرائع سے انگلستان کے اخبارات کو بھیجے جائیں یا تو وہ واپس کر دیئے جاتے ہیں یا ردی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتے ہیں۔

جب سے ہندوستان میں اصلاحات کا نفاذ ہوا ہے انگلستان کے بعض اخبارات نے اپنے نامہ نگار بھی ہندوستان میں رکھے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ ان پر خرچ بھی کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ نامہ نگار وہی لوگ ہیں جو انگلو انڈین اخبارات میں کام کرتے ہیں اور یہ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے اخبار کی پالیسی کے مطابق مضامین اور خبریں بھیجیں۔ اور ایسے نامہ نگاروں سے کبھی بھی انصاف اور غیر جانبداری کی توقع نہیں ہوسکتی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ انگلستان میں ایسے اخبارات بھی ہیں جو ہندوستان کے معاملات پر انصاف، غیر جانبداری اور ہمدردی سے لکھتے ہیں۔ گو بدقسمتی سے ایسے اخبارات کی تعداد بہت کم ہے۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ایسے مضامین لکھنے والوں کو دوسرے نامہ نگاروں کی نسبت کم معاوضہ ملتا ہے۔ مگر ان کے لئے یہ معاوضہ کیا کم ہے کہ ان کا ضمیر انہیں ملامت نہیں کرتا۔ اور یہ کہ انہوں نے اپنی بساط کے موافق دونوں ممالک کے تعلقات کو سدھارنے کی کوشش کی اور اس طرح ملکی خدمت کا حق ادا کیا۔

برٹش ایسوسی ایشن کے پریزیڈنٹ کا مشورہ تھا کہ "ایک دوسرے کے حالات پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ بیج ایسی زمین میں بویا گیا جس میں وہ ضائع ہو گیا۔ انگلستان کی یونیورسٹیوں میں کبھی کوئی کتاب ایسی نہیں رکھی گئی جو ہندوستان کی تاریخ، سیاسیات اور معاشرت وغیرہ سے تعلق رکھتی ہو۔ نہ وہاں پر کبھی اس قسم کے لیکچروں کا اہتمام ہوا ہے۔

اگر ہندوستان کوئی نیا ستارہ ہوتا جو ابھی معلوم ہوا ہو یا کوئی ایسا علاقہ ہوتا جو ستارہ وینس پر حال ہی میں دریافت ہوا ہو یا کوئی ایسا جانور ہوتا جو پہلی دفعہ نظر آیا ہو تو انگلستان کے اخبارات اسے آسمان پر اٹھا لیتے۔ مگر بدقسمتی سے ہندوستان وہ عظیم الشان ملک ہے جس کی قسمت کی باگ ڈور عرصہ سے انگلستان کے ہاتھ میں ہے۔

عبدالوہاب عمر

بھوت

۵ دسمبر کو مجھے ملازمت کے سلسلے میں داناپور سے کانپور آجانا پڑا، ماں باپ، بیوی بچے، بھائی بہن، عزیز و اقارب سے علیحدہ ہوکر اجنبی جگہ میں قیام کرنا بہت تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے، طبیعت کو کسی طرح چین نصیب نہیں، اور نہ کسی کام میں طبیعت لگتی ہے۔ ہوٹل کے پھیکے اور بدمزے کھانے پر زندگی کا مدار ہے، رہنے کے لئے وہی ہوٹل کا تنگ کمرہ اور بس! کالج سے ۴ بجے پڑھا کر جب قیامگاہ واپس آتا ہوں تو اس وقت سے لیکر صبح کے ساڑھے نو بجے تک زندگی وبالِ جان معلوم ہوتی ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ ملازمت ترک کرکے سیدھا داناپور سدھاروں، لیکن اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی کا خیال کرکے اور یہ خیال کرکے کہ ہمارے کسبِ معاش کا ذریعہ یہی ایک ملازمت ہے۔ مجبور ہو جاتا ہوں۔

ادھر ساجدہ کا اصرار کہ مجھے کانپور بلا لیجئے، آپ کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہوا؟ آپ کو وہاں سخت تکلیف ہوتی ہوگی، میاں محسن کی طبیعت پھر ان دنوں ناساز ہے۔ ایک ماہ کے دوران قیام میں خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک درجن سے زائد خطوط اسی مضمون کے آئے، اور طرّہ یہ کہ ایک خط میں چار چار پانچ پانچ جگہ یہی فرمائش۔ میں خود اس تنہائی سے بیزار ہو چکا تھا اور اسی تلاش میں تھا کہ کوئی اچھا سا مکان کرایہ پر ملجائے تو سرِدست ساجدہ، میاں محسن اور سلیمن دایہ کو بلا لوں۔

(۲)

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے بڑی جستجو کے بعد آبادی سے کچھ دور پر ایک سہ منزلہ مکان دس روپے ماہوار پر مل گیا، پختہ مکان تھا۔ اوپر کے چھ کمرے نہایت وسیع، ہوادار اور ہر طرف سے روشن تھے۔ نیچے کے کمروں میں ایک کمرہ البتہ ذرا تاریک تھا، پانی کا پائپ، اور بجلی کی روشنی بھی لگی ہوئی تھی، پنکھے کے متعلق مالک مکان نے وعدہ کیا تھا کہ ایک مہینہ کے اندر اندر لگ جائیگا۔ طبیعت کے مناسب مکان ملجانے کی بڑی خوشی ہوئی، اور زیادہ خوشی اس امر کی ہوئی کہ کانپور جیسے شہر میں اور سہ منزلہ عمارت کا کرایہ صرف دس روپیہ۔

اگلے روز ساجدہ کے نام نہایت مسرت کے ساتھ ایک خط لکھدیا کہ میں ۶ جنوری کو داناپور پہنچوں گا، اور ۷ کو روانہ ہو جاؤنگا۔ کانپور آنے کے لئے تم تیار رہو۔

(۳)

مکان دستیاب ہو جانے کے بعد میں نے ہوٹل میں رہنا غیر مناسب سمجھا، اور خادم کے معرفت وہاں سے اپنا کل اسباب منگوا لیا۔ تقریباً پانچ بجے میں نے اس نئے مکان کا پہلی دفعہ قفل کھولا اور اندر داخل ہوا۔ ہمارے نئے کانپوری دوست پروفیسر محفوظ صاحب بھی ہمراہ تھے۔ مکان سنسان سا معلوم ہو رہا تھا۔ اور ہر چہار طرف سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ محفوظ صاحب بولے "آخر یہ مکان اتنا ویران کیوں نظر آرہا ہے؟" میں نے اُن کے جواب میں کہا کہ عرصہ دراز سے غیر آباد ہے، ویرانگی کی یہی وجہ ہے۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ ہم لوگوں نے مکان کو اچھی طرح دیکھ بھال لیا، بعض بعض جگہ مرمت کی ضرورت تھی اس کی اطلاع صاحبِ مکان کو دیدی گئی۔

محفوظ صاحب سے گھنٹوں اِدھر اُدھر کی گفتگو رہی۔ اس کے بعد وہ اگلے دن صبح آنے کا وعدہ کرکے چلے گئے۔ میری طبیعت چار پانچ روز سے مضمحل تھی۔ آج ان کے جانے کے بعد ہی خفیف سا بخار آگیا۔ اس لئے تفریح کے لئے شام کو گھر سے باہر نہ نکل سکا۔ وہیں پڑے پڑے کچھ دیر تک اخبار دیکھا، اس کے بعد ہوٹل کا ملازم کھانا لیکر آیا۔ کھانا کھایا، اور خلاف عادت نو ہی بجے بستر پر دراز ہو گیا۔

۱۲ بجے آنکھ کھلی تو باہر سے زنجیر ہلانے کی آواز آئی، میں نے بلند آواز میں کہا "محفوظ صاحب! ٹھیریئے آتا ہوں"۔ اس کے بعد دروازہ کھولا تو کسی کا پتہ نہ تھا۔ محفوظ صاحب کے اس مذاق پر سخت غصہ ہوا۔ داہنے بائیں ہر طرف آگے بڑھکر دیکھا کسی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ چپ چاپ چارپائی پر آکر لیٹ رہا، آدھے گھنٹے کے بعد پھر وہی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھولا لیکن پہلی مرتبہ کی طرح پھر کسی کا پتہ نہ تھا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ محلّہ کے شریر لڑکوں کی کرتوت ہے۔ ابھی چارپائی پر لیٹنے بھی نہ پایا تھا کہ پھر وہی زنجیر ہلانے کی آواز آئی۔ اب کی مرتبہ میں چپ چاپ چارپائی پر لیٹا رہا۔ یہ سلسلہ جنبانی" ایک گھنٹہ تک قائم رہی۔ اس کے بعد مجھے

نیند آگئی۔

(۴)

آج صبح ساجدہ محسن اور سلیمن کو ساتھ لیکر کانپور واپس آیا۔ کانپور میں بیوی اور بچہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر جسقدر مسرور ہوا، اس کے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ وہی مکان جس میں دو گھڑی رہنا مصیبت معلوم ہوتا تھا اب اس سے علیحدہ ہونے کو جی نہیں چاہتا، یقین مانیئے اس سے قبل میری زندگی صرف نفس کے "آمد و شد" کا نام رہگئی تھی۔ لیکن خداوند کریم کی عنایت سے اب میں اپنے کو صحیح معنوں میں زندہ پا رہا ہوں۔

(۵)

اس وقت ڈھائی بجے ہونگے، جاڑے کی رات ہے، ہوا سائیں سائیں چل رہی ہے۔ میں سب سے اوپر کی منزل میں سویا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شخص اسی تاریک کمرہ سے نکلکر صحن میں کود رہا ہے۔ خیال ہوا کہ کوئی چور ہے۔ داہنے ہاتھ میں ریوالور اور بائیں میں برقی لیمپ لیکر نیچے اُترنا چاہا۔ ابھی دوسری ہی منزل پر تھا ایسا معلوم ہوا کہ وہ شخص جس کمرے سے نکلا تھا اُسی میں گھس گیا، نیچے اُتر کر میں نے صحن میں تمام طرف روشنی ڈالی، پھر کمرہ کا رُخ کیا وہاں بھی روشنی پھینکی لیکن کچھ پتہ نہ چلا، آخر مجبور ہو کر سونے کے کمرہ میں واپس آیا اور بہت دیر تک اپنے توہم پر ملامت کرتا رہا۔

صبح سویرے اُٹھا، غسل کرنے کے بعد ناشتہ کیا، اور اپنے ریڈنگ روم میں جانا چاہا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میری سرج کی نئی شروانی پر کسی نے دوات کی ساری سیاہی الٹ دی ہے، ساجدہ کو بلاکر دریافت کیا کہ سیاہی کیسے گری؟ وہ صاف انکار کرنے لگی۔ سلیمن کو بلایا اس سے پوچھا وہ قسم کھا کر کہنے لگی کہ میں نے تو رات سے اس کمرہ میں قدم تک نہیں رکھا ہے۔

مجھے غصہ آگیا میں نے تڑپ کر کہا تو آخر یہ سیاہی شیروانی میں لگی کیسے؟ جبکہ وہ اتنی اوپر لٹکی ہوئی تھی کہ محسن اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا اسے گرایا کس نے؟ کیا کوئی بھوت آکر گرا گیا ہے؟

سلیمن اس کے جواب میں قسم کھانے لگی، ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ دوات رکھی ہوئی تھی میز پر پھر شروانی میں سیاہی کیسے لگ گئی۔ بہت دیر تک اس کے اسباب پر غور کرتا رہا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اتوار کا دن تھا۔ کالج سے فرصت تھی، میں اپنے فسانہ "شہید آزادی" کی تکمیل کر رہا تھا، اتنے میں ساجدہ ہانپتی ہوئی میرے قریب جو چارپائی تھی اُس پر آکر گری، وہ صورت سے خوفزدہ معلوم ہو رہی تھی۔ پندرہ منٹ کے بعد جاکر اس نے بتایا کہ میں باورچیخانہ سے واپس آرہی تھی دوسری سیڑھی پر جونہی قدم رکھا ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے پیر پکڑ لیا۔ پیچھے پھر کر دیکھا تو کسی کا پتہ نہ تھا، بڑی کوشش کے بعد تیسری سیڑھی پر قدم رکھا تو اس نے پھر پیر پکڑ لیا، یہ سلسلہ آخری سیڑھی تک قائم رہا۔ اس کے بعد میں بے تحاشہ دوڑ کر یہاں چلی آئی۔

میں نے کہا لاحول ولا قوۃ یہ سب تمہارا وہم ہے۔ سیڑھی کے پاس بھلا کون ہے جو تمہارا پیر پکڑیگا؟

ساجدہ اسکو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اس نے کہا تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ دیکھئے اب تک میرا دل دھڑک رہا ہے۔

میں نے ہنس کر کہا، تو کیا بھوت تھا؟ بھولی ساجدہ یہ سنکر خموش ہوگئی۔

(۶)

شام کے وقت جبکہ میں محسن کو گود میں لئے ہوئے گلی میں ٹہل رہا تھا، میرے ایک پڑوسی میرے سامنے آئے، اُنہوں نے سلام کیا اور کہنے لگے ذرا ادھر تشریف لائیے گا، آپ سے ایک بات عرض کرنی ہے۔

میں نے اُن کے جواب میں کہا "بہتر" اور وہیں اُن کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔

وہ کہنے لگے، آپ کو اس مکان میں آئے ہوئے کتنے روز ہوئے ہیں؟۔

میں نے کہا۔ ابھی صرف سات روز

وہ۔ آپ کو اس مکان میں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے؟

میں۔ آخر یہ سوال مجھ سے آپ کیوں کر رہے ہیں؟

وہ۔ ہمارے سامنے اس مکان میں کتنے ہی کرایہ دار آئے لیکن مستقل طور پر کیا ایک ہفتہ بھی کوئی نہیں ٹھہرا، کوئی دوسرے اور کوئی تیسرے ہی دن چلتا بنا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس مکان میں بھوت اور خبیث روحیں رہا کرتی ہیں جو کہ کرایہ دار کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتی ہیں۔ اور عجیب خوفناک حرکات کرتی ہیں۔ رات کے وقت سارے مکان میں کودتی پھرتی ہیں۔ جو شخص زینے پر چڑھتا ہے اس کا پیر پکڑ لیتی ہیں۔ دن کے وقت بجلی روشن کر دیتی ہیں۔ تمام

رات کسی کو سونے نہیں دیتیں۔ دروازہ پہ کھڑے ہو کر گھنٹوں زنجیر کھٹکھٹاتی ہیں۔ آخر غریب مجبور ہو کر دوسرے ہی دن مکان خالی کر دیتا ہے۔ تعجب ہے کہ آپ کیونکر ایک ہفتہ رہ گئے؟ بس یہی پوچھنا تھا۔

میں نے ہنس کر کہا۔ جناب! میں بھوت اور خبیث روح کا قائل نہیں، اور اگر بفرض محال ان کے وجود کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ میرا بگاڑ کیا سکتے ہیں۔ ریوالور ہمارے گھر میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ زنجیر کھٹکھٹانا، رات کے وقت کودنا، زینہ پہ پیر پکڑ لینا وغیرہ واقعات مجھے بھی پیش آئے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ محلہ کے کسی واقفکار آدمی کا کام ہے، جو ہم لوگوں کو ڈرانا چاہتا ہے۔ یا یہ چاہتا ہے کہ اور لوگوں کی طرح ہم لوگ بھی مکان چھوڑ دیں۔ بہرحال یہ بتائیے کہ اس مکان میں یہ خبیث روحیں کب سے رہتی ہیں؟

وہ مفصل واقعہ یہ ہے کہ یہ مکان راجکشور نامی ماڑواڑی کا تھا۔ راجکشور اور پیارے کے درمیان غایت درجہ کی دوستی تھی، راجکشور جب اپنے وطن کو جانے لگا تو لبطور امانت اس مکان کو پیارے کے سپرد کر تا گیا۔

راجکشور کے جانے کے بعد پیارے اپنی بیوی کے ساتھ اس مکان میں عرصہ تک رہا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک مکان میں قفل لگا رہا، محلہ والوں نے سمجھا کہ پیارے ان دنوں اپنی سسرال گیا ہوا ہے۔ لیکن تھوڑے ہی دن کے بعد مکان سے تعفن آنے لگی۔ لوگوں کو شبہ ہوا، پولیس بلائی گئی، دیکھا گیا تو ایک طرف پیارے کی لاش رسی میں لٹک رہی تھی، اور دوسری طرف اس کی بیوی کا سر تن سے جدا تھا۔ اور دونوں کی لاش سڑ رہی تھی، کل لوگوں نے بالاتفاق یہ رائے قائم کی کہ پیارے نے اپنی بیوی کو قتل کر کے خودکشی کر لی، اس واقعہ کے بعد سے ان دونوں کی روح بھوت بنکر اس مکان میں رہنے لگی۔

ہمسائے کی یہ تقریر میرے قائم کردہ خیالات میں کچھ تغیر پیدا نہ کر سکی، ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب میں ان حرکات پر جو خبیث روحوں کی طرف منسوب کی جاتی ہیں بہت زیادہ غور کرنے لگا، اور اس جستجو میں رہا کہ آخر واقعہ کیا ہے؟

یوں تو آئے دن کبھی پکا پکایا کھانا غائب ہو جاتا، کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی آدمی مکان کی کل چیزوں کو اٹھا اٹھا کر پھینک رہا ہے۔ کبھی کسی کی پیر چھپل سنائی دیتی، اور ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی چل رہا ہے لیکن چلنے والے کا نام و نشان تک نہ ملتا، کبھی رات بھر زنجیر ہلانے کی آواز آتی، مگر ایک روز ایسا واقعہ ہو گیا، جس کے بعد مجھے ہمسائے کی باتیں ایک ایک کر کے تسلیم کر لینی پڑیں۔ حسب معمول ۴½ بجے گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے مکان کے گرد کچھ لوگ جمع ہیں، سلیمن دروازہ پہ کھڑی ہماری راہ تک رہی ہے، ساجدہ کا روتے روتے برا حال ہو گیا ہے۔ اور محلہ کی دو چار عورتیں اس کو تسلی دے رہی ہیں۔ دروازہ پر پہنچتے ہی سلیمن نے کہا "ارے غضب ہو گیا، ایک بجے سے محسن غائب ہے"۔

تین سال کے بچے کا جو گھر سے باہر قدم تک نہ رکھتا ہو تین ساڑھے تین گھنٹے تک غائب رہنا واقعتہً خدشہ سے خالی نہ تھا۔ طرح طرح کے خیالات یکے بعد دیگرے آنے لگے، ایک مرتبہ یہ خیال ہوا کہ ڈاکو پکڑ کر لے گئے ہونگے، پھر یہ بات دل میں کھٹکی کہ ممکن ہے گھر کے سامنے جو کنواں ہے اس میں گر گیا ہو، لیکن اس کی جگت بہت اونچی تھی اس پہ تو وہ چڑھ بھی نہیں سکتا تھا۔ نئی جگہ ہونے کی وجہ سے اور بھی پریشانی ہوئی۔ محفوظ صاحب کو بلوایا۔ انہوں نے آنے کے ساتھ ہی کہا، کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ انشاء اللہ محسن ضرور مل جائے گا میں دس بارہ آدمیوں کو شہر کے مختلف حصوں میں بھیجتا ہوں۔ آپ تھانہ میں رپٹ لکھا دیجئے۔

عین مغرب کے وقت ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ یہاں سے ایک میل کے فاصلہ پہ ایک برگد کا درخت ہے اسی پر محسن بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے اس کہنے پر مجھے غصہ بھی آیا کچھ ہنسی بھی آئی، میں نے کہا آخر تین سال کا بچہ درخت پر کیسے چڑھ گیا؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟ مگر وہ اصرار کرنے لگا کہ چلکر دیکھ تو لیجئے۔ پروفیسر صاحب نے جو کچھ حلیہ بتایا تھا اس کے بالکل مواقف ہے۔

بہت اصرار کرنے پر میں بادل ناخواستہ اوٹھنا ہی چاہتا تھا کہ پروفیسر محفوظ آ گئے۔ ان سے یہ واقعہ بیان کیا گیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مجھے یقین تھا کہ اس آدمی کو دھوکا ہوا ہے، اور اس نے کسی دوسرے لڑکے کو محسن سمجھ لیا ہے۔ پروفیسر صاحب کا بھی یہی خیال تھا۔ راستے بھر عجب خلجان رہا۔ خیر کسی نہ کسی صورت سے درخت کے قریب پہنچے۔ ابھی کچھ فاصلہ ہی تھا لیکن میں نے محسن کو پہچان لیا، خوشی کے مارے آنکھ سے آنسو نکل پڑے، درخت کے نیچے پہنچے تو وہاں تماشائیوں کا ہجوم تھا، اور میاں محسن اوپر دالی ڈال پر خموش بیٹھے ہوئے تھے، لوگوں سے معلوم ہوا کہ یہ بچہ ۱½ بجے سے یہاں ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس درخت پر بھوت رہا کرتے ہیں جو آ کے

دن اسی طرح کی حرکات کیا کرتے ہیں۔ رات کے وقت کوئی اس درخت کے نیچے سے نہیں گزرتا ہے۔ ابھی تیسرے روز کا واقعہ ہے اسی طرح ایک عورت کو جہاں یہ بچہ بیٹھا ہوا ہے وہیں لاکر بٹھا دیا تھا۔

بھوت کا مسکن ہونے کی وجہ سے کوئی درخت پر چڑھنے اور محسن کو اتارنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ بڑی مصیبت کے بعد خدا خدا کر کے اسے اتار گیا۔ اس کے بعد گھر پہنچے، یہاں اب تک رونا پیٹنا مچا ہوا تھا ان کو دیکھ کر عید ہو گئی۔

اس مکان کو خبیث روحوں کا مسکن سمجھنے کے لئے گذشتہ واقعات ہی کافی تھے، مگر محسن کا غائب ہو جانا غضب ہو گیا۔ یوں تو اس واقعہ کا اثر تھوڑا یا بہت کل لوگوں پر پڑا مگر سب سے زیادہ اس اثر کو جس نے قبول کیا وہ ساجدہ تھی۔

(۷)

دپ، دپ، دپ، دپ، ایک ماہ کے بعد آج پھر خبیث روح کے پیر کی آہٹ معلوم ہوئی۔ بھوت سیدھا اپنے کمرہ میں داخل ہوا وہی کمرہ جو سب سے زیادہ تاریک تھا۔ ابھی پندرہ منٹ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ دوسرے صاحب کے پیر کی آواز معلوم ہوئی۔ وہ بھی اسی طرح کمرہ میں چلے گئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک مکمل خاموشی رہی، اس کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ دونوں آپس میں لڑ رہے ہیں، یہ جنگ غالباً نصف گھنٹہ تک جاری رہی اس کے بعد کمرہ سے ایک دھیمی آواز آئی کہ

"اب ہم لوگ اس مکان میں کبھی نہیں آئینگے"۔

اور دونوں نہایت تیزی کے ساتھ واپس چلے گئے۔

اس واقعہ کو دس سال ہوتے ہیں، میں مع اہل وعیال ابتک اسی مکان میں مقیم ہوں۔ اس عرصہ میں آجتک خبیث روح نے اس مکان کا رُخ نہیں کیا۔ اور نہ کوئی ایسی بات پیش آئی جو اس کی طرف منسوب کی جا سکے۔

مسعود حسن داناپوری

احساسات

علم - ادراک - معرفت کہ شہود   کوئی قوّت مری ہو ہے محدود
طُور پر تجھ سے ہمکلام ہوئے   جلوہ موسیٰؑ ترا نہ دیکھ سکے
کوئی مستِ شرابِ وحدت بھی   رُوبرو تیرے ہو سکا نہ کبھی

تجھ کو یہ مُشتِ خاک کا پُتلا
سچ تو یہ ہے سمجھ نہیں سکتا

عقل پر میری ڈال کر پردے   مجھ کو بیگانہ کر دیا مجھ سے
رازِ ہستی بنا دیا مجھ کو تو نے   مجھ سے تو نے چھپا دیا مجھ کو
مَیں ہوں پردہ نشیں کہ پردا ہوں   نہیں معلوم کون ہوں کیا ہوں

ہے اندھیرا چراغ کے نیچے
قلب میں روشنی کے ظلمت ہے

شارق دہلوی

عرب

ڈاکٹر پال ہیریسن امریکہ کے مشہور مشنری ڈاکٹر ہیں۔ آپ چودہ سال تک عرب کے مختلف مقامات پر بطور مشنری ڈاکٹر اور سکول ماسٹر کام کرتے رہے ہیں۔ عرب اور اہلِ عرب پر آپ کے خیالات کی امریکہ اور یورپ میں بہت قدر ہوئی ہے۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت منصف مزاجی سے تعصب کو بالائے طاق رکھ کر لکھا ہے + (توفیق حسن مقطی)

اس اجنبی سیاح کو جو عرب کی سیاحت کر رہا ہو بہت کم چیزیں اتنی تعجب خیز معلوم ہونگی جیسی کہ ایک عرب کی جسمانی خصوصیات جو کہ اسے اس حریف فضا کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتی ہے جس میں کہ اس نے پرورش پائی ہے۔ میانہ قد۔ لاغر اندام۔ نمایاں اور کم و بیش خمیدہ ناک، اور شاندار سیاہ چمکتی ہوئی آنکھیں جو روح کی گہرائیوں تک پہنچنے کی قدرت رکھتی ہیں اس کی جسمانی خصوصیات ہیں۔ عرب ایک باز کی مانند ہے، اس کا دبلا اور مضبوط جسم تعب برداشت کرنے کے لئے بنا ہوا ہے۔ اس کے چہرہ کے شکن محنت اور مشقت کی زندگی کا بیّن ثبوت پیش کرتے ہیں اور ان فرحتوں سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں جن کا ہم میں سے اکثر کے لئے ہونا ایک لابدی امر ہے۔

عربوں کی قوت برداشت مسلّمہ طور پر بہترین اور عظیم ترین شے ہے۔ ایک اجنبی اونٹ کرایہ پر لیکر سفر کرتا ہے اور عرب تمام دن اونٹ کو صحرا میں پیدل لے جاتا ہے۔ بارہ یا سولہ گھنٹے کے سفر کے بعد سوار مغربی اس عرب کے مقابلہ میں، جس نے نہ صرف تمام سفر پیدل طے کیا ہے بلکہ جس نے رہنما کا کام بھی دیا ہے، بہت زیادہ تھک جاتا ہے۔ چلنے میں دنیا کی کوئی قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بعض اوقات عربوں کی رفتار ناقابلِ یقین حد تک پہنچ جاتی ہے۔ حصا اور قطیعف کے درمیان ایک صحرائی راستہ تقریباً سو میل لمبا ہے۔ بعض خبر رسانوں نے اس فاصلہ کو دو دن میں عبور کیا ہے!

عرب بہترین سکاوٹ ہے۔ اس کی سماعت اور بصارت ہم سے بہتر نہ ہو مگر اس کی قدرتی قابلیتیں اور تمام عمر کی مشق صحرا کو اس کے لئے ایک کھلی ہوئی کتاب بنا دیتی ہے۔ جب سفر کیا جاتا ہے اس وقت صحرائی اخبار پڑھا جاتا ہے "آخاہ! تین دن ہوئے یہاں سے ہرنوں کی ایک ڈار کا گذر ہوا تھا۔ اور ..... ایک بھیڑیا ان کا پیچھا کر رہا تھا۔" یہ تو ابجد خواں عرب بھی بتا سکتے ہیں۔ تجربہ کار عربوں کی قابلیت اس سے بڑھ چڑھ کر ہوتی ہے۔ "میاں عبداللہ دیکھنا چار دن ہوئے یہاں سے ابن خالد کا قافلہ گزرا ہے۔ اس کے ساتھ بارہ اونٹ اور پانچ آدمی تھے۔" "اونٹ کافی لدے ہوئے تھے؟" "نہیں صرف تین پر سامان تھا وہ بھی بہت ہلکا .... دو پر کھجوریں تھیں اور ایک پر چاول.... اور ہاں بیچارے کی وہ اونٹنی جو اس نے سال بھر ہوا ابن علی سے تین سو ریال میں خریدی تھی لنگڑی ہو گئی ہے۔" اس خبر پر تمام قافلہ افسوس اور ہمدردی کے کلمات کہیگا۔ احمق مغربی کے ساتھ کافی دماغ سوزی کے بعد بھی عرب ان علامات کے سمجھانے میں کامیاب نہ ہوگا لیکن اگر کوئی شخص ایسا طریقہ تحریر ایجاد کرے کہ جس کی رو سے 'الف' کی شکل ہرن کے کھر کے نشان جیسی ہو 'ب' کی شکل بھیڑیئے کے پنجے کے نشان جیسی ہو اور 'ج' کی شکل جمل کے پاؤں کے نشان کی مانند ہو تو عرب چند گھنٹوں میں لکھنا اور پڑھنا سیکھ لیگا۔

اس کمال کی مہارت میں مختلف قبیلوں کا الگ الگ درجہ ہے مگر آل مرہ اس علم کے استاد مانے گئے ہیں۔ کویت کے پولیٹیکل ایجنٹ مرحوم کپتان ولیم شیکسپیر نے اس قبیلہ کے ایک رہنما کے امتحان کا واقعہ لکھا ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ صحرائی سفر کیا اور اپنے ساتھ ایسے آلے لئے جو سمت کے بتانے میں کام آتے ہیں۔ وہ اپنے سفر کا نقشہ بھی بناتے رہے کچھ دن سفر کرنے کے بعد انہوں نے اپنے رہنما سے پوچھا کہ بتاؤ ہمارے کیمپ کس سمت میں ہیں؟" تمام راستہ بہت پیچیدہ تھا مگر رہنما نے تھوڑے سے وقفہ کے بعد کہا۔ "کیمپ اس سمت میں ہونا چاہیئے۔" اور یہ کہکر اُس نے ٹھیک اس سمت کی طرف ہاتھ اٹھایا جو آلوں اور نقشے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

اسی رہنما کے بارے میں اس سے کہیں عجیب و غریب واقعہ کپتان صاحب مذکور نے قلمبند کیا ہے۔ ایک دفعہ قافلہ میں پانی کی کمی ہو گئی اور آس پاس پانی ملنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ مجبوراً سب نے ایک گاؤں

کی طرف لوٹنے کی صلاح کی۔ مگر اسی رہنما نے کہا کہ "واپس جانے میں ہمارے ۴ دن ضائع ہونگے۔ ہمارا کام بہت ضروری ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو اس سمت میں دو دن کے سفر کے بعد ہمیں پانی مل جائے گا۔" کپتان صاحب نے پوچھا تمہیں کامل یقین بھی ہے کہ پانی ضرور مل جائیگا" کپتان صاحب نے سوچا کہ پانی کے نہ ملنے میں خود رہنما کی جان کا بھی خطرہ ہے۔ لہٰذا اس کی وفاداری میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ قافلہ اس رہنما کی رہبری میں چل پڑا۔ دو دن کے بعد دوپہر کے وقت اس جیتی جاگتی قطب نما نے کہا کہ بظاہر وہ جگہ یہی معلوم ہوتی ہے۔" چنانچہ قافلہ سے تقریباً سو فیٹ ہٹ کر اس نے ایک جگہ سے چند ہی انچ ریت کھودا ہوگا کہ پانی نکل آیا۔ اس مقام پر کوئی ایسا نشان نہیں تھا جو کسی مغربی کو اس جگہ کے پہچاننے میں مدد دے۔ کپتان صاحب نے پوچھا کہ تم نے اس پانی کو کب دیکھا تھا؟

"تین سال ہوئے۔" "اس درمیان میں کبھی تمہیں یہاں آنے کا اتفاق ہوا؟"

"کبھی نہیں!"

ان سچے واقعات کو سنکر اس قصہ کا بھی یقین کرنا پڑتا ہے کہ اسی قبیلہ کے ایک عرب کو ڈاکو رات کے وقت آنکھیں باندھ کر صحرا میں سے لے گئے تھے اور اس نے موقع پاکر اپنا ایک روپیہ ریت میں دبا دیا تھا۔ چنانچہ دو سال کے بعد اسی جگہ سے اس نے اپنا روپیہ نکال لیا!۔

اس عجیب و غریب قابلیت کے علاوہ جو چیز ایک مغربی کو تعجب میں ڈال دیتی ہے وہ عربوں کی مہمان نوازی ہے۔ جسقدر احترام مہمان کا اہل عرب کرتے ہیں اس کی مثال روئے زمین پر اور کسی قوم میں نہیں ملتی۔ مہمان خواہ کافر ہی کیوں نہ ہو نہایت عزت کا مستحق خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اسی طرح میزبان کے حقوق بھی ہیں۔ عرب میں سیکڑوں خوفناک مظالم ہوتے ہیں اور کسی قانون کی شمہ بھر پرواہ نہیں کی جاتی مگر جس کا نمک کھا لیا جاتا ہے اس سے بے وفائی کرنا قطعاً ناممکن ہے امیر غریب شریف اور بدمعاش سب اس اصول کی پابندی کرتے ہیں۔

یہ قصہ عربوں میں بہت مشہور ہے کہ ایک چور کسی شخص کے مکان میں گھس گیا اور مختلف سامان اکٹھا کرنے کے بعد اسے ایک چھوٹا سا خوبصورت ڈبہ نظر پڑا۔ اس نے بڑی مشکل سے اسے کھول لیا۔ اندر ایک اور ڈبہ تھا۔ چور نے اُسے بھی کھولا۔ اس دوسرے ڈبے میں بھی ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا۔ اسی طرح مختلف ڈبے کھولنے کے بعد اسے ایک پڑیا ملی جس میں ایک سفید رنگ کا سفوف تھا۔ چور نے اسے چکھا، جو شے اس قدر احتیاط سے رکھی ہوئی تھی وہ نمک تھا۔ نمک چکھتے ہی چور نے تمام مال و متاع وہیں چھوڑ کر گھر کی راہ لی۔ کہ اب اس مکان سے اس کے لئے کوئی چیز چرانا ناممکن تھا۔ چوری اس شخص کے نزدیک کوئی ..... عیب نہ تھا۔ اگر موقعہ پڑ جاتا تو قتل سے بھی گریز نہ کرتا۔ مگر نمک کھانے کے بعد چوری کرنا اس کے لئے بدترین گناہ تھا۔

حال میں ہی ایک عرب شیخ کے لڑکے کی شادی ہوئی تھی۔ دعوت کے لئے چار سو بھیڑیں اور نوے اونٹ حلال کئے گئے تھے۔ چاولوں کا اندازہ اسی سے لگا لیجئے کہ کسقدر خرچ ہوئے ہونگے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مہمانوں کے جانوروں کو چارہ بھی دیا گیا۔ مہمان عرب کے تمام حصوں سے آئے تھے۔ ہر مہمان کو اس کی حیثیت کے مطابق تحفہ دیا گیا۔ اکثر کو نقد روپے بھی دئے گئے۔ یہ باتیں ایک مغربی کے لئے بہت حیران کن ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ اہل عرب کی مہمان نوازی تمام روئے زمین کی اقوام کو چیلنج کرتی ہے۔

عرب نہایت سادہ مزاج ہوتا ہے۔ اس کی سادگی بعض اوقات نہایت بھلی ہوتی ہے۔ اس کے دماغ میں بیک وقت دو باتوں کا سمانا محال نظر آتا ہے۔ یہ تکلفات سے بری کسی ہستی سے مرعوب ہونا نہیں جانتا۔ ایک بار ایک بدو نے برٹش پولیٹیکل ایجنٹ کو "ارے! ادھر دیکھ!" کہکر مخاطب کیا۔ جب اسے بتایا گیا کہ یہ شخص بہت بڑے رتبہ والا ہے تو اس بیچارے کی سمجھ میں نہ آسکا کہ اس نے اس انگریز کی کیا بیعزتی کر دی۔

جو اس کے دل میں ہوتا ہے وہی اس کی زبان پر بلا تردد آ جاتا ہے۔ ایک دفعہ میں صحرا میں سے گزر رہا تھا۔ یہاں کچھ حصہ کافی سرسبز نظر آیا اپنے رہنما سے مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کچھ عرصہ کے لئے برائے نام بارش ہوجاتی ہے اور ان دنوں وہاں کچھ سبزی بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ میں نے کہا "پھر اس جگہ سے چراگاہ کا کام کیوں نہیں لیا جاتا؟" اس نے جواب دیا کہ کنوؤں کی غیر موجودگی کی وجہ سے جانوروں کا رکھنا محال ہے۔ میں نے پوچھا کہ کنویں کھودنے کی کوشش کیوں نہیں کی جاتی؟ "کئی بار کوشش کی گئی مگر پانی نہیں ملا۔" عرب نے ذرا چڑ کر جواب دیا۔ میں نے کنوؤں کی گہرائی وغیرہ کے بارے

میں چند سوالات کئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ میرا رہنما میرے اسقدر سوالات سے تنگ آگیا تھا۔ اس نے اخیر میں یہ کہا کہ مجھے یقین ہے کہ اگر کوشش کیجائے تو یہاں سے پانی دستیاب ہو سکتا ہے۔"

میں اس عجیب غیر متوقع جواب پر سخت حیران ہوا مگر میرے دوسرے ساتھی نے جس نے ہماری گفتگو کا آخری حصہ سُن لیا تھا میری حیرت کو رفع کر دیا۔ اس نے جھڑک کر ہمارے رہنما سے پوچھا۔ "اس بکواس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ کئی دفعہ کوشش کرنے پر یہاں سے پانی کا ایک قطرہ کبھی میسر نہیں ہوا؟" اُس نے میری موجودگی کی پرواہ کئے بغیر نہایت لاپرواہی سے کہا کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے مگر یہ شخص خواہ مخواہ سوالات کئے جاتا تھا جب میرے سچ بولنے نے اسے مطمئن نہیں کیا تو میں نے ایسی بات کہدی جس سے کہ گفتگو ختم ہو جائے؛ تکلف اور تصنع سے یہ صحرانشین بالکل بری ہیں۔ جو کچھ اُنہیں کرنا ہوتا ہے بغیر جھجک کے کر بیٹھتے ہیں اور جو ان کے دل میں ہوتا ہے بغیر کسی روک ٹوک کے فوراً زبان پر آجاتا ہے۔ ایک دن میں کویت کے بازار میں سے گذر رہا تھا کہ ایک بدو میرے پاس آیا اور بغیر کسی تمہید کے کہنے لگا۔ "اپنا منہ کھولو!" گویا میں بھی کوئی اونٹ تھا کہ جس کی جب مرضی ہو بلا تکلف میرا منہ کھول لے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا "خیر ہے تم میرا منہ کیوں کھلواتے ہو؟" "اپنا منہ کھولو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" "مگر بھائی بیچ بازار کے تم میرے منہ میں کیا دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا کوئی انوکھی چیز ہے؟" بدو میری اس قدر فالتو گفتگو سے تنگ آگیا تھا اس نے چڑ کر کہا۔ میاں اپنا منہ کھولو میں نے کوئی سونے جیسی چیز دیکھی تھی۔" میں نے اپنا منہ کھول دیا اور اس نے بڑے اشتیاق اور حیرت سے میرے منہ کو تکنا شروع کیا۔ "عبداللہ عبدالکریم خالد۔ عمر یہاں آؤ۔" ذراسی دیر میں میں حیرت زدہ عرب ناظرین سے گھر گیا۔ میں کئی بار بہت عجیب اور پریشان کن حالات میں رہ چکا ہوں۔ مگر ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا کہ بیچ بازار درجن بھر آدمیوں میں اپنا منہ کھولے کھڑا رہوں۔ خوب جی بھر کر دیکھ لینے کے بعد اس بدو نے پوچھا۔ "یہ دانت ایسا ہی پیدا ہوا تھا؟" "نہیں میں نے ایک دانت کے ٹوٹ جانے پر لگوایا تھا۔" مجھے یقین ہے اس رات کئی ایک لوگوں کو کاذب کا خطاب ملا ہوگا۔ جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر اپنی بیویوں سے سونے کے دانت کا ذکر کیا ہوگا۔

امریکن مشن کی اکثر خواتین کو صاف گوئی کے عجیب وغریب تجربہ ہوتے ہیں۔ اہلِ عرب نہایت بے تکلفی سے سوال کر بیٹھتے ہیں:

کیا واقعی تم کنواری ہو؟ مگر تمہاری عمر یقیناً شادی کے لائق ہے۔ کم از کم بیس سال ہوگی۔" "نہیں پچیس سال۔" "پھر تم اب تک بغیر خاوند کے کیوں ہو؟ تم کافی خوبصورت ہو۔ کیا تمہارا مزاج اتنا بُرا ہے کہ کوئی بھی تم سے شادی کرنا پسند نہیں کرتا؟"

اہلِ عرب غیر ممالک کے رسم ورواج کو سمجھ نہیں سکتے۔ ایک دفعہ میں ابنِ سعود کے بلانے پر ریاض جارہا تھا۔ قافلہ دس آدمیوں پر مشتمل تھا اور ہمارا رہنما ایک بوڑھا آدمی تھا۔ جس نے غالباً پہلے کبھی کسی غیر ملکی کو نہیں دیکھا تھا۔ ایک دن اس بوڑھے نے مجھے فجر کی نماز کے وقت ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ وہ نہایت غصہ میں بھرا ہوا میر قافلہ کے پاس گیا اور اس سے خوف۔ نفرت اور غصّہ کے لہجہ میں کہا "یہ سفید رو شخص نماز نہیں پڑھتا۔" میر قافلہ نے اسے نہایت نرم لہجہ میں سمجھایا کہ یہ صاحب ایک بہت بڑا ڈاکٹر ہے اور ریاض میں بیماروں کے علاج کے لئے ابن سعود کے بلانے پر جارہا ہے۔" مگر بوڑھا بار بار یہی کہتا رہا کہ لیکن یہ شخص نماز نہیں پڑھتا۔ غالباً بڑے میاں کو یہ خیال ہوگیا ہوگا کہ ایسے شخص کے ہمسفر ہونے کی وجہ سے جو نماز نہیں پڑھتا یقیناً کارواں پر کوئی بلا نازل ہوگی۔ دورانِ سفر میں جب کبھی وہ مجھے دیکھ لیتا فوراً اپنا منہ پھیر لیتا۔ سفر کے اختتام سے ایک روز پہلے میں نے دیکھا کہ وہ بوڑھا اپنی عباسی رہا ہے۔ مگر سوئی اور دھاگا نہ ہونے کی وجہ سے تنکے سے کام چلا رہا تھا۔ میں فوراً اس کے پاس ایک سوئی اور کچھ سیاہ دھاگا لیکر گیا اور اس سے کہا:۔

"یا ابی (اے میرے باپ) تمہیں سوئی اور دھاگے کی ضرورت ہے۔ لو اس سے اپنا کام چلاؤ۔ اگر اور دھاگے کی ضرورت پڑے تو لے لینا، مگر میری سوئی واپس دے دینا۔"

بوڑھے نے سوئی لے لی۔ مگر بڑی دیر تک حیران ہوتا رہا کہ ایک ایسا شخص جو نماز نہیں پڑھتا کیونکر اسقدر خوش اطوار ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی اور اپنے بیٹے کی عباسی دو دفعہ مجھ سے اور دھاگا مانگ کر سی۔ اور اخیر میں سوئی میرے حوالے کر دی۔ اس کے بعد پھر کبھی اس نے میری طرف دیکھ کر منہ نہیں پھیرا۔ آجتک مجھے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ سفر کے اہتمام پر کوئی متعصب سے متعصب عرب بھی مجھ سے نفرت کرتا ہو۔ عربوں سے نہ دبنا چاہیئے اور نہ کسی طرح ان پر اپنی برتری کا اظہار کرنا چاہیئے۔ بلکہ بالکل ہم مرتبہ ہوکر

ملنا چاہیئے۔ یہ بات بہت جلد عربوں کو موہ لیتی ہے۔ شروع شروع میں جب عرب ہسپتال میں آتا ہے تو اس طرح چلاتا ہے "او کافر تو کہاں ہے؟ آ مجھے دوا دے۔" لیکن دورانِ علاج میں بہت جلد او کافر سے او حکیم پر اُتر آتا ہے۔ اور جب عرب دوستی پر اُتر آتا ہے پھر اس سے بڑھ کر اصلی معنوں میں ہمدرد دوست دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکتا۔

ایسے بہت سے دلچسپ واقعات ذہن میں ہیں جن سے مندرجہ بالا ہمدردی اور محبت کا ثبوت ملتا ہے۔ مگر فی الحال طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتا ہوں۔ اگر یہ مضمون دلچسپ ثابت ہوا تو انشاء اللہ آئندہ مزید خیالات اور واقعات پیش کرونگا۔ لوگ زمین کھود کھود کر دھاتیں نکالتے ہیں جو بہت کار آمد ہوتی ہیں۔ لیکن یاد رکھئے دنیا میں پٹرول کوئلہ اور لوہے سے بھی زیادہ کار آمد چیزیں ہیں۔ ان اقوام میں ایسے ایسے دفینے ہیں جو ہماری زندگی کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔ کانیں کھودنا اور ہمیں طے کرنا اتنا دلچسپ اور مفید نہیں ہے جتنا کہ ایسی قوموں میں گھل مل کر ان کے درست حالات سے واقف ہونا۔

توفیق حسن مسقطی

جذبات

گو تری محفل سے او بیداد گر جاتا ہوں میں — دیکھ کیا تفتہ جگر، آشفتہ سر جاتا ہوں میں

جستجوؤں پر ثباتِ زیست کا ہے انحصار — جستجوئیں ختم ہوتی ہیں تو مر جاتا ہوں میں

شوقِ بے پایاں کی کوشش کا کوئی حاصل بھی ہے؟ — اے فریبِ آرزو آخر کدھر جاتا ہوں میں؟

کیوں اُٹھاتا ہے مجھے محفل سے او بیداد گر؟ — آگیا ہوں، رنگِ محفل دیکھ کر جاتا ہوں میں

تیری خواہش سوز نظروں کے تصوّر پر نثار — منزلِ احساسِ ہستی سے گزر جاتا ہوں میں

زندگی کی راہ پُر آفات ہے لیکن عدمؔ!!
ہر کٹھن منزل سے وحشت میں گزر جاتا ہوں میں

عدمؔ

دیوانِ غالب

سازِ حجاب

(غالب کی بارہویں غزل کی شرح)

غزل

۱۔ محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا (موعظت)

۲۔ رنگِ پریدہ صبحِ بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا (علم النفس)

۳۔ تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا (آرٹ اور علم النفس)

۴۔ صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جانگداز کا (تہذیب الاخلاق)

۵۔ ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا (آرٹ)

۶۔ کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اُس گرہ نیم باز کا (تہذیب الاخلاق)

۷۔ تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا (علم النفس)

تمہید۔ یہ غزل مرزا صاحب کے مخصوص اندازِ بیان یعنی "اجتماعِ اضداد" کی نمایاں مثال ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دنیا کی ہر وہ شے جو بظاہر حجاب ہے اہلِ بصیرت کے لئے پردۂ ساز کی طرح ہے۔ مفہوم مسلسل نہیں ہے۔

مفہوم۔ (۱) اہلِ بصیرت کے لئے دنیا کا ہر حجاب پردۂ ساز ہے۔

تشریح۔ محرم بمعنی واقف۔ نواہائے راز بمعنی پوشیدہ بھیدوں کی آوازیں۔ یعنی پوشیدہ بھید۔ حجاب بمعنی پردہ یا آڑ۔ پردۂ ساز باجے کا پردہ جس سے آواز پیدا ہوتی ہے، اس دوسرے پردے اور حجاب کے معنی میں تجنیس لفظی کا پردہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ نغمہائے راز سے انسان ناآشنا ہے۔ ورنہ ہر چیز جو بظاہر حجاب ہے دراصل حجاب نہیں بمصداق ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست صنعتِ پروردگار

(۲) **مفہوم**۔ عاشق کی پریشانی سے معشوق شگفتہ خاطر ہوتا ہے۔

تشریح۔ رنگِ پریدہ = اُڑا ہوا رنگ اردو میں "منہ پر ہوائیاں اڑنا" ایسی ہی حالت کو کہتے ہیں صبح بہار نظارہ یعنی نظارۂ صبح بہار۔ موسم بہار کی صبح کو طرح طرح کے پھول کھلا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ وقت ایک خاص کیفیت لئے ہوتا ہے اور چونکہ میری پریشانی دوست کی خوشی اور شگفتہ خاطری کا باعث ہے یعنی جب میں پریشان ہوتا ہوں تو وہ اور بھی اپنے ناز و انداز دکھاتا ہے۔ اِس لئے میرے منہ پہ ہوائیاں اُڑنا اُن کے گلہائے عشوہ و ناز کے کھلنے کی دلیل ہے اور اسی وجہ سے میرا رنگِ پریدہ نظارۂ صبح بہار ہے۔

"مرے چہرے پہ زردی آپکے چہرے پہ سرخی ہو" (جا سر دمرہی لیس ہو بی)

(۳) **مفہوم**۔ دوست کی اغیار نوازی اور احباب فراموشی ستم ہے۔

تشریح۔ نظرہائے تیز تیز یعنی گھورنے والی نگاہیں۔ مژہ ہائے دراز بمعنی لمبی "لمبی پلکیں (لمبی پلکیں خوبصورت سمجھی جاتی ہیں)

مطلب یہ ہے کہ جب تم غیروں کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہو تو وہ نگاہیں میرے دل پہ رشک و حسد کے نشتروں کا کام کرتی ہیں کہ کاش مجھے بھی نظر بھر کے دیکھ لیتے اور میرے ارمان نکل جاتے۔ ایک عامیانہ شعر بطور تمثیل بے موقع نہ ہوگا ؎

ہنس کے غیروں سے گفتگو کرنا
مدعا ہے جلا کرے کوئی

رشک کا سبب یا تو یہ ہے کہ تمہاری تیز نگاہیں مجھے بے بس کر دیتی ہیں مگر اغیار پر اُن کا کوئی اثر نہیں ہوتا یا یہ کہ اغیار ان نگاہوں سے لطف اٹھاتے ہیں اور میں محروم رہتا ہوں۔

(۴) **مفہوم**۔ اگر خدا صبر و ضبط کی قوت نہ پیدا کرتا تو زندگی محال ہو جاتی۔

ملہ ادبی دنیا اکتوبر ۱۹۳۰ء

تشریح - صرفہ یعنی قابو - ضبط یعنی برداشت - طعمہ بمعنی لقمہ - نفسِ جانگداز بمعنی جان کو گھلا دینے والا نفس - یہ استعارہ قابلِ غور ہے - انسان کا جسم شمع تصور کیا گیا ہے اور "آہ" اُس کی لَو یا شعلہ -

مطلب یہ ہے کہ اگر مجھ میں صبر و ضبط کی قوت نہ ہوتی تو ایک ہی آہِ آتشیں میرے جسم کو شمع کی طرح پگھلا کر بہا دیتی یا یہ کہ دنیا کی کوئی ایک ہی مصیبت مجھے مٹانے کے لئے کافی ہوتی -

(۵) **مفہوم** - دنیا جوشِ محبت کا مظہر ہے -

تشریح - بادہ بمعنی شراب یعنی شرابِ محبت - شیشہ بمعنی بوتل یعنی جسمِ انسان ملاحظہ ہو حافظ کا یہ شعر ؎

دوش دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند

گلِ آدم بسرشتند و بپیمانہ زدند

بساط بمعنی پھیلاؤ یعنی کائنات - شیشہ باز، بازیگر یا مداری ... یا بھانمتی کو کہتے ہیں جو تماشا کرتے ہوئے بوتل کو اُچھال کر کبھی سر پر رکھ لیتا ہے کبھی سینہ پر اسی طرح سب کو اپنے کرتب دکھاتا ہے - یہاں شیشہ سے مراد انسان ہے - بادہ سے مطلب شرابِ محبت - گوشۂ بساط یعنی دنیا جو کائنات کا ایک کونہ ہے اور شیشہ باز خالقِ بے نیاز کو کہا گیا ہے جس نے تماشاہ گاہِ عالم میں اپنی قدرت کے تماشے دکھلائے -

مطلب یہ ہے کہ محبت ہی کی بدولت دنیا آباد اور مخلوق دلشاد ہے - اس شعر پر ایک دلچسپ کارٹون بن سکتا ہے - وہ یہ کہ ایک فرش بنایا جائے اُس پر شراب سے بھری بوتلیں اُچھلتی کودتی دکھلائی جائیں مگر اتنی جدت اور کر دی جائے کہ بوتلوں کے ہاتھ پیر بنا دیئے جائیں اور ان کے منہ بشکل انسان کر دیئے جائیں کسی کے سر پر ہیٹ ہو کسی کے سر پر عمامہ، کہیں ترکی ٹوپی، کہیں گاندھی کیپ - کسی کے لمبی داڑھی ہو کسی کے لمبی مونچھیں - کوئی کرزن فیشن ہو۔

(۶) **مفہوم** - دور اندیش لوگوں کے دل بغیر کسی کام کو پورا کئے ہوئے قرار نہیں لیتے -

تشریح - کاوش بمعنی کاہش ہندی محاورہ = "کھود کرید" یا تقاضا یعنی مطالبہ مانگ - ناخن پر گرہ نیم باز کا قرض ہے یعنی ناخن نے چونکہ صرف آدھی گرہ کھولی ہے - اس لئے آدھی بے کھلی گرہ ابھی بطور مطالبہ باقی ہے اور یہی بقایا قرض ہے -

مطلب یہ ہے جب کوئی کام ادھورا رہ جاتا ہے تو دور اندیش لوگوں کے دل اس کو پورا کرنے کا تقاضا ہر وقت کیا کرتے ہیں کہ بقیہ کام بھی انجام دینا چاہئے -

(۷) **مفہوم** - صبر و ضبط کی کمی کی وجہ سے رازِ حقیقت کے خزانے افشا ہو جاتے ہیں۔

تشریح - تاراج - لوٹ (لوٹیروں کی لوٹ نہیں بلکہ فوجیوں کی لوٹ) کاوشِ غمِ ہجراں یعنی رنجِ فراق کی خلش - گہر ہائے راز یعنی رموزِ حقیقت

مطلب یہ ہے کہ (صبر و ضبط نہ ہونے کی وجہ سے) فراق کی تکلیفوں نے دل کے مخفی خزانے لوٹ لئے اور اس طرح دل کے بھید ظاہر ہو گئے -

خلاصہ - عاشق کی پریشانی سے معشوق کا خوش ہونا - دوست کا اغیار نواز اور احباب فراموش ہونا، عاشق کا صبر و ضبط سے کامیاب اور بے صبری سے ناکام ہونا وغیرہ بظاہر کیفیاتِ حجاب ہیں مگر ان میں جو لطف پوشیدہ ہے اس کا اندازہ اہلِ بصیرت ہی کو ہو سکتا ہے -

گنجینۂ گوہر

(غالب کی تیرہویں غزل کی شرح)

غزل

۱- بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا (تعارف و دعا)

۲- شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدہ کا در کھلا (استعارہ و تشبیہ)

۳- گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا (زبان و محاورہ)

۴- گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا (اخلاق و[illegible])

۵- ہے خیالِ حُسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا (تصوف)

۶- منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے رخ پر کھلا (بیان)

. . . .

۷- در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا　　(بیان)

۸- کیوں اندھیری ہے شب غم؟ ہے بلاؤں کا نزول
آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا　　(شاعری)

۹- کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا　　(زبان)

۱۰- اُس کی اُمت میں ہوں مَیں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا　　(نعت)

تمہید - اس قصیدہ نما غزل میں ہر شعر "نجم رخشندہ" یا چمکتے ہوئے تارے کی طرح حاملِ انبساط ہے - مرزا صاحب کی اس غزل کے اکثر اشعار عام شعرائے اردو کے اشعار کی طرح ہیں - اِس لئے نہ تو اشعار میں فلسفیانہ نکات ہیں نہ ان کا مفہوم مسلسل ہے -

(۱) **مفہوم** - بادشاہ کے یہاں مشاعرہ شروع ہوا - خدا اس بزمِ سخن کو قائم رکھے -

تشریح - گنجینۂ گوہر بمعنی موتیوں کا خزانہ یعنی اشعار - اس مطلع میں اُن مشاعروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ کے یہاں قلعۂ معلّیٰ دہلی میں ہفتہ وار ہوا کرتے تھے -

مطلب صاف ہے -

(۲) **مفہوم** - رات ہوئی اور نہایت تکلف سے مشاعرہ شروع ہوا -

تشریح - انجم رخشندہ بمعنی چمکتے ہوئے تارے یعنی اشعار - تکلف بمعنی خوبی - بتکدہ کا در کھلا، قاعدہ ہے کہ بتکدہ کا دروازہ کھلنے پر (جو عموماً شام کو کھلتا ہے) آرتی دکھائی جاتی ہے (آرتی دکھانا ہنود کے یہاں جزوِ عبادت ہے) آرتی میں ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے گھی کے چراغ روشن ہوتے ہیں - یہاں بتکدہ سے مطلب مشاعرہ ہے اور بتوں سے شعرا جو "انجم رخشندہ" یعنی اشعار سے لطف اندوز ہوتے ہیں -

مطلب یہ ہے کہ رات ہونے پر مشاعرہ شروع ہوا اور اشعار کے ستارے چمکنے لگے -

(۳) **مفہوم** - دوست نما دشمن کا اعتبار نہیں -

تشریح - دشنہ بمعنی چھری - دیوانوں کی فصد لی جاتی ہے تو جنون جاتا رہتا ہے -

مطلب یہ ہے کہ دوست جو فصد لینے کے لئے بظاہر نشتر لئے معلوم ہوتا ہے آستین میں چھری چھپائے ہوئے ہے تاکہ موقع پا کر قتل کرے - شعر کا دوسرا مصرعہ محاورہ "مارِ آستین" کی تشریح ہے -

(۴) **مفہوم** - دوست کا بے تکلف ہونا ہی بڑی بات ہے -

تشریح - پری پیکر = پری کا سا جسم رکھنے والا یعنی نازک اندام کھلا یعنی بے تکلف ہوا - علم عروض میں اس قسم کی ردیف کو معمولہ کہا گیا ہے - (نیز ملاحظہ ہو شعر نمبر ۶)

مطلب یہ ہے کہ باوجود معشوق کی باتیں نہ سمجھ پا اس کا بھید نہ پانے کے میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ وہ مجھ سے بے تکلف ہوا اور ہنسنے بولنے لگا -

(۵) **مفہوم** - حقیقی حسن کا خیال عبادت یا ذریعۂ نجات ہے -

تشریح - خیالِ حسن = حسن کا تصور - یہاں حسن سے مراد حقیقی حسن ہے - حسنِ عمل = سعادت و عبادت یعنی کارِ خیر - خلد کا ایک در گور کے اندر کھلا ہے یعنی نجات حاصل ہو گئی - (اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ عبادت گذار لوگوں کی قبر میں جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جائے گا جس سے بہشت کے مناظر نظر آئیں گے)

مطلب یہ کہ خدا جو خالقِ حسن ہے اور سب سے بڑھ کر حسین ہے اس کا خیال میرے لئے ذریعۂ نجات ہو گیا -

(۶) **مفہوم** - اُن کے چھپنے پر جو عالم ہے وہ ظاہر ہیں نہیں -"

تشریح - نقرہ "دیکھا ہی نہیں" تعریف کا پہلو لئے ہوئے ہے یعنی "واہ وا" "کیا کہنا" - نقاب = پردہ "اب دلّی والے نقاب کو بالاتفاق مونث استعمال کرتے ہیں" (حضرت بیخود) قاعدہ ہے کہ گورے گالوں پر سیاہ زلفیں اچھی معلوم ہوتی ہیں مگر مرزا صاحب کہتے ہیں - کہ حسنِ حقیقت نہ دیکھنے پر بھی ایسا دلفریب ہے کہ رخسار پر زلفوں کے بکھرنے سے زیادہ پرلطف معلوم ہوتا ہے بمصداق ؎

"وہ ہر تصوّر سے دور رہکر بھی ہر تصوّر میں آرہے ہیں"

(۷) **مفہوم** - وعدہ کیا لیکن میری آمادگی دیکھ کر پھر خلاف ہو گئے -

تشریح - پھر گیا - یعنی مکر گیا - شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں مسافر کی طرح بستر باندھے ہوئے اس کے در پر گیا اور در پہ پڑ رہنے کی خواہش قبول ہوئی لیکن جیسے ہی قیام کے لئے بستر کھولا تو بدگمانی کی وجہ سے مکر گیا -

(۸) **مفہوم** - شبِ غم کی اندھیری بلاؤں کے نزول کی دلیل ہے -

تشریح - شبِ غم = مصیبت کی رات - نزول - ورود - اترنا

میدۂ اختر یعنی ستارے۔

مطلب سوال و جواب میں ہے یعنی: سوال شبِ غم اندھیری کیوں ہے؟ جواب: بلاؤں کے نزول کی وجہ سے ستارے آج آسمان کی طرف بلاؤں کے اترنے کا تماشا دیکھ رہے ہیں دنیا کی طرف دیکھتے تو روشنی ہوتی۔ اصل مطلب یہ ہے کہ شبِ غم نہایت تیرہ و تار ہے۔

(۹) **مفہوم** - غربت میں حوادث بے چین رکھتے ہیں۔
غربت: مسافرت۔ پردیس میں رہنا۔ حوادث: اندوہناک واقعات۔ دوسرے مصرعہ میں ایک رسم کی طرف اشارہ ہے کہ جس خط میں کسی کی موت کا واقعہ لکھا جاتا ہے تو اس خط کے ایک کونے کو سیاہ کر دیتے ہیں یا کتر دیتے ہیں اور لفافہ کو آدھا کھلا ہوا رکھتے ہیں۔
مطلب صاف ہے۔

(۱۰) **مفہوم** - میں سب سے زیادہ عالی مرتبہ پیشوا کی ملت میں ہوں اس لئے میرے کام نہیں رک سکتے۔

تشریح - اُمّت یعنی ملت۔ شہ مخفف ہے شاہ کا اشارہ ہے اہل اسلام کے پیشوا جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آپ ایک مرتبہ رات کو آسمان پر تشریف لے گئے۔ اور خدا کے حضور تک پہنچے۔ اس رات کو "شبِ معراج" کہا جاتا ہے) گنبدِ بے در یعنی وہ گنبد جس میں کوئی دروازہ نہیں یعنی آسمان۔ گنبد بے در کھلا یعنی آنحضرت صلعم آسمان پر گئے، اس شعر میں الفاظ "بند" اور "کھلا" جو پہلے اور دوسرے مصرعوں کے آخر میں ہیں صنعت تضادِ معنوی رکھتے ہیں۔ ایسے صنائع لانا مرزا صاحب کا حصّہ ہے۔
مطلب صاف ہے۔ یہ مقطع نعتیہ ہے اور نعت میں بھی حسنِ طلب پنہاں ہے۔

سید مقبول حسین احمدپوری

نالۂ تپش

زندگانی کیا ہے امیدوں کا اک پیغام ہے — موت کیا ہے عزمِ ترکِ آرزو کا نام ہے

شہرتِ کعبہ کہیں ہے ذکرِ بتخانہ کہیں — حُسن اُن کا مایلِ تسکینِ شوقِ عام ہے

تم جو چاہو گے وہ ہوگا تم نے جو چاہا ہوا — بات پھر کیا ہے مری تقدیر کیوں بدنام ہے

ہے ستم آمادہ اُن کی ہر نگاہِ التفات — ہر سکونِ دل ہمارا اضطراب انجام ہے

دیدنی ہے اہتمام بے حجابیِ حُسن کا — ہوش کی دنیا لئے دل لرزہ بر اندام ہے

ہو کے بیخود اُن کے جلووں کا نظارہ کیجئے — دیکھ کر بیہوش ہو جانا تو رسمِ عام ہے

دردِ اُلفت کی عنایت سے تپشؔ میرے لئے
حاصلِ صد زندگانی موت کا پیغام ہے

تپشؔ مین پوری

طبّی دُنیا

کشمکش حیات

زندگی کی گھمسان جنگ میں انسان ہر طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا ہے۔ پس اُسے چاہیئے کہ وہ ان دشمنوں کی مدافعت کیلئے ہمیشہ مسلح رہے۔ اس جنگ کے کئی رُخ ہیں۔ دشمن اَن گنت ہیں۔ جن کی شکلیں ہیبتناک، جن کے اسلحہ خوفناک، اور جن کے حملے تباہ کن ہیں۔ ایسے قوی دشمن کے مقابلے میں ہمارا قلعہ صرف ایک ڈھانچہ ہے۔ جو مثل حباب کمزور ہے۔ وہ قلعہ کیا ہے جو اتنے سارے دشمنوں کا نشانہ بنا ہوا ہے؟ جسم انسانی! جو آن واحد میں گر کر فنا ہو سکتا ہے۔ اگر بروقت خبرگیری نہ کی جائے تو اں بھی واحد دشمن اپنے شدید حملوں سے انسان کو قبر کے گڑھے تک پہنچانے کے لئے بہت کافی ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ جراثیم امراض جو انسان کے قدرتی دشمن ہیں۔ چاروں طرف فضا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور بہت سے خود اس کے جسم میں موجود ہیں۔ یہ موقعہ کے منتظر جراثیم ہمیشہ حملہ کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

قدرت کی ستم ظریفیوں کو دیکھو بارش خشک سالی، زلزلے، قحط و متعدی امراض ایک طرف اور نحیف و کمزور، لاغر و ناتوان انسان دوسری طرف۔ مگر پھر بھی انسان ان کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور ان اغراض کی تکمیل کے لئے وہ زندہ رہتا ہے جن کے لئے قدرت نے اسے پیدا کیا ہے۔

انسان کو اپنی قوت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے جو درحقیقت متذکرہ بالا قومی دشمنوں سے قوی تر ہے۔ کثیر التعداد دشمنوں اور ان کی صف آرائیوں کو دیکھ کر بظاہر اُن کا مقابلہ دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انسان کو جینا ہے! اس لئے اُن کے مقابلے کو اس طرح مسلح ہو جائے کہ وہ ہر ممکن حملہ کو رد کرنے میں مناسب ذریعوں سے کامیاب ہو سکے۔

اس مطلب کے حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس ہر موقع کے لئے ضروری ہتھیار موجود ہوں۔ اُسے جسمانی توانائی کے ساتھ دماغی صحت اور شستہ عادات و اطوار کی سخت ضرورت ہے تاکہ بیرونی اور اندرونی خطرات کو روک سکے۔

فطرت کی مخالف قوتوں اور جراثیم امراض سے مقابلہ کرنا اور ان پر حاوی ہو کر کم سے کم مضرت رساں بنانا زیست کے لئے لازمی شے ہے۔ اس کے لئے خاصی توانائی اور دلجمعی کی ضرورت ہے جو ایسے ماحول میں ناممکن ہے جو امراض پرور اور صحت و عافیت سے کوسوں دور ہو۔

تنازع للبقا کے لئے انسان ایسے وسائل ڈھونڈھ نکالے کہ جس سے وہ جسم اور روح میں توازن قائم کر سکے اور ان دونوں کے مزاج عقلی کو قائم رکھنے کے لئے صحت و عافیت کے دشمنوں کو برباد و مفتوح کرے اگر یہ ممکن ہو جائے تو ایک صحت مند جسم میں صحت مند دماغ کا قدیم مقولہ صادق آسکتا ہے۔ انسانی آبادی کی انفرادی شخصیتوں کا فنا ایک معمولی امر ہے۔ لیکن سب سے نسل انسانی کے تباہ ہونے کے امکان کو مٹانا ہمارا کام ہے۔ اور اس طرح یہ ہر انسان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس مقدس جنگ میں اپنی سی کوشش کرے اور اپنی اولاد اور آنے والی نسلوں کو زمانہ ماضی سے بلند معیار صحت پر پہنچائے تاکہ آنیوالی نسلیں تباہی سے بچیں۔

محمد رضا بانزید پوری حیدرآباد دکن

سائنس کی دُنیا

ہوائی جہاز

جب ہم الف لیلیٰ کے قصّوں میں اُڑان قالین کا تذکرہ پڑھتے ہیں تو ہمیں فوراً یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے۔

جب حضرت سلیمانؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ کا تخت ہوا میں اُڑتا تھا تو ہر تعلیم یافتہ آدمی یہی کہتا ہے "ناممکن"

مگر آج آپ نے دیکھ لیا کہ سوت کا قالین نہیں، لکڑی کا تخت نہیں بلکہ لوہا ہوا میں اُڑتا ہے۔

ہمارا مقصد اس مضمون میں یہ دکھانا ہے کہ انسان کس طرح ترقی اور کوشش کرتے کرتے اس منزل اعلیٰ پر پہنچ گیا کہ اس نے پرندوں کو اپنا محکوم بنا لیا اور اگر واقعی فرشتے ہوا میں اُڑتے ہیں تو میں کہونگا کہ وہ کس طرح انسان سے فرشتہ بنگیا اور خدا کے (اگر خدا آسمانوں میں ہے۔) نزدیک تر ہو گیا۔

جب انسان نے پرندوں کو ہوا میں اُڑتے دیکھا تو اُسے خیال ہوا "ہیں! میں اشرف المخلوقات اور یہ جانور میرے اوپر کو گذر جائیں اور میں بیٹھا دیکھا کروں نہیں میں بھی اڑونگا"

بس اس "نہیں میں بھی اُڑونگا" نے سارا کام بنا دیا۔ انسان نے کوشش شروع کی اور آخر کار کامیابی کے بام رفیع پر پہنچ کر ہی دم لیا۔

غبارے ایک مدت مدید سے اُڑائے جاتے ہیں اور دراصل یہ پہلا قدم تھا جو انسان نے اس عقدہ کو حل کرنے کے لئے اٹھایا تھا۔

تحقیقات سے اتنا پتا چلتا ہے کہ سب سے پہلا غبارہ چین کے دارالسلطنت پیکن میں ۱۳۰۶ء میں) بادشاہ کی تخت نشینی کے وقت اُڑایا گیا۔ اس بات کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ انھوں نے اس کو کس ترکیب سے اُڑایا۔

دراصل انسان کی پہلی کوششیں غلط اصول پر مبنی تھیں۔ اس نے صرف ایک ایسی مشین بنانے کے لئے اپنی قوتوں کو خرچ کیا جو ہوا میں اوپر اُٹھ سکے۔ فرض کر لیجئے کہ ایسی مشین تیار ہو جاتی ہے مگر وہ اس وقت تک بالکل فضول ہے جبتک وہ اس پر اس کی حالت پرواز میں قابو نہ رکھ سکے اور اپنا اور مشین کا توازن ہوا میں قائم نہ کر سکے۔

مثال کے طور پر آپ سمجھ لیجئے کہ آپ ایک آدمی کو جو سائیکل پر چڑھنا نہ جانتا ہو سائیکل کی گدّی پر بٹھا کر دھکا دے دیں تو وہ صرف چند گز چل کر گر پڑیگا۔ یہی حال ان لوگوں کا ہوا جنھوں نے عجلت کے ساتھ مشینیں بنائیں اور بغیر سوچے سمجھے اُڑنے کی کوشش کی۔

ان کوششوں میں راہبوں نے کافی حصہ لیا۔ ان لوگوں کے پاس وقت اور بے فکری دونوں چیزیں تھیں۔

اولیور نامی ایک راہب نے پرواز کے واسطے ایک مشین بنائی۔ اور اس کا امتحان کرنے کے لئے ایک اونچے مینار پر چڑھ کر ہوا میں جست لگائی۔ وہ کچھ دیر توازن قائم رکھنے میں کامیاب ہو گیا، مگر ہوا کے ایک جھونکے نے اس کا کام خراب کر دیا وہ زمین پر گرا اور اسے سخت چوٹ آئی۔

ایک اور راہب مراآسن نے بارھویں صدی عیسوی میں اڑنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے لئے پر بنائے اور بازوؤں سے باندھکر ایک مینار پر چڑھ گیا۔ جب باد موافق کا جھونکا آیا تو اس نے جست لگا دی۔ وہ ایک پرندے کی طرح ہوا میں اُڑا۔ مگر توازن قائم نہ رکھنے کے سبب سے زمین پر آرہا اور اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔

پندرھویں صدی عیسوی میں لیناآرڈو نے جو کہ مختلف فنون میں دستگاہ رکھتا تھا اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک مشین بنائی مگر چونکہ اس کے پاس کوئی حرکت دینے والی قوت نہیں تھی اس لئے اسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔

لینارڈو اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ اُڑنے میں توازن قائم رکھنے کی از حد ضرورت ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کی طرح یہ خیال نہ کرتا تھا کہ اگر انسان ایک دفعہ کچھ سیکنڈ کے لئے اُڑنے میں کامیاب

ہو گیا تو وہ بغیر کسی مشین کی امداد کے از خود ہوا میں توازن قائم رکھ سکیگا۔
اس نے خود ایک جگہ لکھا ہے "پرواز کنندہ کے دھڑ کو آزادیٔ حرکت حاصل ہونی چاہیئے۔ تاکہ وہ توازن قائم رکھ سکے۔"

اس نے اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر لیا تھا جسے آجکل کا ہر پرواز کنندہ اپنے خیال میں رکھتا ہے وہ یہ کہ "ہوا میں کافی اونچائی پر اُڑنا چاہیئے تاکہ اگر اتفاقاً توازن جاتا رہے تو اسے پھر قائم کرنے کے لئے کافی وقت اور جگہ مل سکے۔"

اس نے ایک اور مشین بنائی جس کے ذریعہ سے آدمی دو پروں کو (جو پرندے کے پروں کی طرح حرکت کے ساتھ ساتھ بند ہوتے اور کھل جاتے تھے) ہلا سکے اور اس طرح پرندوں کی نقل کر سکے مگر اسے بھی مکمل کامیابی نہ ہوئی۔

اس زمانہ سے انیسویں صدی عیسوی تک برابر کوششیں ہوتی رہیں۔ اور ناکام رہیں کیونکہ اکثر لوگوں نے اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ ہوا میں توازن قائم رکھنا بہت ضروری ہے۔ ایک چڑیا کا بچہ ہرگز نہیں اُڑ سکتا جب تک وہ اس توازن پر پورا عبور حاصل نہ کرے۔

بہت سے لوگوں نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ وہ ہوا میں اُڑ سکتے ہیں اور اس طریقے سے بڑے لوگوں اور بادشاہان وقت کو اپنی طرف متوجہ کر کے ان سے بہت سا روپیہ اینٹھا۔ مگر جب امتحان کا وقت آیا تو وہ ناکام رہے۔ بعض گر کر مر گئے۔ بعض کے چوٹیں آئیں اور بعض ہمیشہ کے لئے خجالت اور شرمندگی کی آماجگاہ بن گئے۔

(باقی آئندہ)

جیواد
(میرٹھ کالج)

غزل

یہی ادائے حجاب ستم طراز رہے — کوئی رہے نہ رہے جلوہ گاہ ناز رہے
وہ شمع شمع نہیں جل کے جو پگھل نہ اُٹھے — مزا تو جب ہے طبیعت میں اک گداز رہے
حقیقت اپنی جو پوچھو تو تھے حقیقت ہم — جہاں میں بن کے مگر پردۂ مجاز رہے
سمانا کوزہ میں دریا کا ہے محال محال — یہ دل کا ظرف کہاں ہے کہ راز راز رہے
یہ ناز اب ہے تری بے نیازیوں کی قسم — نیاز مند ترے سب سے بے نیاز رہے
غریب دل کا سہارا غریب دل کا علاج — یہی بہت ہے ترا در وچارہ ساز رہے

سر نیاز نہ سجدے سے اُٹھ سکا نشتر
خوشا نصیب کہ ہم پائمالِ ناز رہے

نشتر سندیلوی

نقد و نظر

روحِ جذبات مجموعۂ کلام حضرت اکبر حیدری - حجم ۱۰۲ صفحے، کاغذ اعلیٰ، لکھائی، چھپائی عمدہ، تقطیع متوسط - قیمت عہ پتہ :- مولینا عشرت رحمانی اڈیٹر نیرنگ دہلی -

دنیا کی ہر چیز متغیر ہے - منقلب ہے اور دراصل یہی اس کی بے ثباتی کی بہترین دلیل ہے - شاعری بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتی تھی - ایک زمانہ تھا کہ لوگ زلف اور چوٹی کی شاعری کو سنتے تھے اور سر دھنتے تھے اور ایک زمانہ ہے کہ اس کے خلاف نفرت کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں - گلشن شاعری کے نئے باغبان نئی پود لگا رہے ہیں - جس میں بلند پایہ جذبات کے رنگ برنگے دلآویز پھول تو موجود ہیں مگر ذوقِ سلیم کو زخمی کرنے والے بازاری مضامین کے کانٹے ہیں -- ان نئے باغبانوں میں جناب اکبر حیدری امتیازی شان رکھتے ہیں - مذکورہ بالا کتاب آپ کے بلند پایہ تخیلات کا مرقع ہے - اس کی نظمیں نہ صرف مدح پرور ہیں بلکہ پرانی لکیر کے فقیر شاعروں کے لئے پیغام عمل بھی ہیں - آج کل کالج کے طالب علموں میں شعر گوئی کا ذوق متعدی مرض کی طرح بڑھ رہا ہے - ضرورت ہے کہ اس بڑھتے ہوئے ذوق کو فحش گوئی سے پاک رکھا جائے اور ان میں شعر گوئی کا سلجھا ہوا مذاق پیدا کیا جائے - اس لئے ہم پنجاب یونیورسٹی سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ روحِ جذبات کو اپنے نصاب میں داخل کر کے اپنے فرض کو پورا کرے - کتاب کے ساتھ مؤلف کی رنگین تصویر بھی ہے -

دُنیائے راز مجموعۂ کلام حضرت رازؔ چاند پوری - حجم ۱۱۲ صفحے کاغذ لکھائی چھپائی اعلیٰ، تقطیع چھوٹی، قیمت عہ طلبا سے ۱۲ ملنے کا پتہ :- حضرت مؤلف بالسمنڈی کانپور -

حضرت رازؔ کے نام سے دنیائے ادب ناواقف نہیں ہے - آپ ان چند شعرا میں سے ایک ہیں جو جذباتِ انسانی کی صحیح، موثر، دلکش مگر سادہ تصویر کامیابی کے ساتھ کھینچ سکتے ہیں - زیرِ نظر کتاب آپ ہی کے کلام کا مختصر و منتخب مجموعہ ہے - کتاب حسب ذیل عنوانوں پر مشتمل ہے - خیالستان - رموز و نکات - سرِ دلبران - دامنِ گلچیں - ہر عنوان کے ماتحت متعدد بلند پایہ نظمیں جو حسنِ تخیل، ندرتِ بیان - اور لطف محاکات کا نمونہ ہیں درج کی گئی ہیں - بلاشبہ یہ نظمیں شاعری کی دنیا میں قابلِ قدر اضافہ ہیں - شروع میں جناب اثرؔ لکھنوی کے قلم سے نکلا ہوا ۱۸ صفحے کا ایک مقدمہ ہے - جس میں حضرت رازؔ کے کلام کی خصوصیات پر ایک ہلکی مگر دلآویز روشنی ڈالی گئی ہے - مؤلف کی تصویر بھی زینتِ کلام ہے -

شیون و جوابِ شیون از حضرت آشفتہ لکھنوی و حضرت سراج لکھنوی - ۴۴ صفحے - چھوٹی تقطیع - کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت نامعلوم، پتہ دفتر رسالہ مبصر لکھنؤ -

حضرت حکیم آشفتہ اڈیٹر مبصر لکھنؤ دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں آپ لکھنؤ کے ان شیوا بیان شاعروں میں سے ہیں - جن کی اعجاز بیانی سے لکھنؤ کی پرانی ادبی روایات آج بھی زندہ ہیں -

آپ نے علامہ اقبال کے شکوہ کے طرز پر مگر اس سے بہت علیحدہ ہو کر بارگاہ الٰہی میں اسلامیان ہند کی خستہ حالی پر ایک موزوں و مقفیٰ شیون کیا - حضرت سراج لکھنوی نے بارگاہ الٰہی کی ترجمانی کرتے ہوئے اس شیون کا موثر اور دلنشیں پیرایہ میں سبق آموز جواب - دیا - دونوں بزرگوں کے کلام میں زور ہے - تخیل میں بلندی ہے، طرزِ ادا میں شگفتگی ہے اور زبان میں پاکیزگی ہے - جن صاحبان نے شکوہ اور جواب شکوہ پڑھا ہے ہم ان سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ شیون اور جواب شیون بھی پڑھیں اور تقلید میں جدت کا نظارہ دیکھیں -

مریادا پرشوتم رام از جناب نفیس خلیلی - ۱۲۰ صفحے، چھوٹی تقطیع کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ - مجلد پارچہ قیمت عہ، پتہ نفیس بک ایجنسی کوچہ سندھی خاں کوتوال امرتسر -

شری رام چندر جی کی زندگی ہندوستان کی قدیم تاریخ کا ایک سنہری باب ہے - اس اطاعت گزار بیٹے، بہادر سپاہی اور فقیر منش بادشاہ کی کہانی آج ہزاروں برس گزرنے کے بعد بھی بچہ بچہ کی زبان پر ہے - زیرِ نظر کتاب میں اسی کہانی کو لطیف اور پاکیزہ اردو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے چونکہ اس کتاب کا مؤلف ایک مسلمان ہے - اس لئے ہم اس کتاب

کو ہندوستان کی موجودہ تاریک فرقہ وارانہ فضا میں روشنی کی ایک چمک سمجھتے ہیں۔ وہ چمک جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتحاد اور یکجہتی کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہندو اور مسلمان اہلِ قلم ایک دوسرے کے مذہبی پیشواؤں کا احترام کرنا سیکھ جائیں اور ان کی خوبیوں کو سراہنے میں ناجائز تنگ نظری سے کام نہ لیں تو ہندوستان سے فرقہ وارانہ لڑائیوں کی لعنت بہت جلد دور ہو جائے۔

ہم جناب نفیس خلیلی کو اس سلسلہ میں پیش قدمی کرنے پر قابلِ مبارکباد سمجھتے ہیں۔ کیا ہندو شعرا میں سے کوئی بزرگ اس کتاب کا جواب دینے کی کوشش کریں گے؟

بانگِ دِل مجموعۂ کلام استاد امام الدین صاحب گجراتی۔ حجم ۱۲۶ صفحے۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی متوسط۔ تقطیع متوسط۔ قیمت عہ۔

مذکورہ بالا کتابوں کو دیکھنے کے بعد جب یہ مجموعہ سامنے آیا تو ایسا معلوم ہوا کہ نظر انتہائی بلندیوں سے گر کر انتہائی پستیوں میں جا پہنچی ہے۔

شاعری کے متعلق جناب مؤلف کا نظریہ یہ ہے کہ شاعر کی مثال معمار کی سی ہے۔ شعر مکان ہے اور الفاظ اینٹیں ہیں جس طرح معمار کو اینٹوں کے توڑنے جوڑنے کا پورا اختیار ہے اسی طرح الفاظ کی توڑ جوڑ قطع و برید تقدیم و تاخیر تذکیر و تانیث جمع و واحد کے متعلق شاعر آزاد ہے۔ استاد صاحب کا تمام کلام اسی نظریہ کے مطابق مرتب کیا گیا ہے۔ اور آپ نے الفاظ و معانی کی اینٹوں کی اپنی فکرِ نارسا کی کنی سے وہ مرمت کی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب ادبی حیثیت سے شائع نہیں کی گئی بلکہ اس کا مقصد تھکے ہوئے دماغوں کو ذوقِ تفریح بہم پہنچانا ہے۔ جناب استاد کی تصویر بھی شامل کتاب ہے۔

محمد علی جوہر مؤلف مولینا عشرت رحمانی مدیر نیرنگ دہلی ناشر دفتر نیرنگ دہلی۔ سائز کراؤن ضخامت تقریباً پورے دو سو صفحات۔ تصاویر پانچ۔ قیمت بارہ آنہ

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مغفور کی وفات کے بعد ملک میں ان کی چند سوانح حیات مختصر پیمانہ پر شائع ہوئیں۔ لیکن مولانا عشرت رحمانی نے جو رئیس الاحرار کے ہم وطن بھی ہیں اور خاندان رئیس الاحرار سے بخوبی واقف۔ حضرت مولانا کی یہ سوانح عمری مختصر طور پر اسقدر جامعیت کے ساتھ مرتب کی ہے کہ دوسری کتابیں اس کے ہم پلہ نہیں ہو سکتیں۔ ترتیب میں خاص سلیقہ برتا گیا ہے اور اس انداز میں مرتب کی گئی ہے کہ شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد مولانا کی زندگی کے ہر دور کی کیفیت آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ شروع میں مولانا کے پچاس سالہ خود نوشت حالات بھی درج ہیں اور آخیر میں مضامین جوہر کا نہایت اعلیٰ انتخاب مع کلام جوہر درج ہے۔ مولانا کے خطبات اور مقدمہ کا اقتباس بھی شامل ہے۔ اختتام پر مشرق و مغرب کے اکابرین کے اقوال مولانا محمد علی کی ذات گرامی کے متعلق اور نامور شعرا کی تعزیتی نظمیں درج ہیں۔ قیمت کی کمی کے لحاظ سے بھی کتاب قابلِ قدر ہے۔

کلید روزگار حجم تقریباً ۵۰ صفحے، کاغذ لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ تقطیع خورد۔ قیمت عہ۔ پتہ۔ مینجر مطبع مجتبائی میرٹھ۔

یورپ اور امریکہ کی خوشحالی اور ہندوستان کی بدحالی کا راز صرف اس بات میں مضمر ہے کہ اول الذکر ممالک نے تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا ہے اور آخر الذکر نے ملازمت کو۔ ملازمت کتنی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو اس کی ترقی محدود ہے مگر تجارت کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ تجارت انہی چیزوں کی کامیاب ہو سکتی ہے جو اپنی مصنوعات ہوں۔

پیش نظر کتاب میں ویسلین، ہیزلین، دیا سلائی، خضاب، طلسمی پریس، امرت دھارا وغیرہ تقریباً پچاس ایسی مفید اور کارآمد صنعتوں کا ذکر ہے جن کی ہندوستان کے ہر گھر میں روزانہ ضرورت پڑتی رہتی ہے اور جن کی وجہ سے ہر سال ملک کا لاکھوں روپیہ غیر ملکی کارخانوں کی نذر ہو کر ہندوستان کے افلاس میں اضافہ کرتا ہے۔ مؤلف نے بڑی محنت اور روپیہ صرف کر کے ان نسخوں کو جمع کیا ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ ان میں سے کسی ایک نسخہ کے ذریعہ ایک ہوشیار آدمی سو روپیے ماہوار کما سکتا ہے۔ ملک کے نوجوان جو نوکریوں کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں۔ ان چیزوں کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی اور اپنے وطن کی مالی حالت درست کریں۔ کتاب کی قیمت اگرچہ ظاہری حیثیت سے زیادہ معلوم ہوتی ہے مگر باطنی خوبیوں کے اعتبار سے زیادہ نہیں۔

نقاد

دنیائے ادب

ہندی

گوڈڑ سائیں

"سائیں! او سائیں!!" ایک لڑکے نے پکارا۔ سائیں گھوم گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک آٹھ برس کا لڑکا اسے پکار رہا ہے۔ آج کئی روز بعد اس محلہ میں سائیں دکھائی دیا ہے۔ سائیں بیراگی تھا ——— مایا نہیں، موہ نہیں۔ لیکن کچھ دنوں سے اس کی عادت پڑ گئی تھی کہ دوپہر کو موہن کے مکان پر جاتا۔ اپنے دو تین گندے گوڈڑ رکھکر اُنہیں پر بیٹھ جاتا اور موہن سے باتیں کرتا۔ جب کبھی موہن اسے غریب اور بھیک مانگنے والا سمجھکر، ماں سے چپکے سے، باپ کی نظر بچا کر کچھ ساگ روٹی لاکر دیدیتا، تب اُس سائیں کی شکل سے خوشی ظاہر ہونے لگتی تھی۔ گوڈڑ سائیں اس وقت دس برس کے لڑکے کی طرح اسے بڑے شوق سے کھا لیتا اور اسی پر قناعت کرتا۔

ایک دن موہن کے والد نے دیکھ لیا۔ وہ بہت ناراض ہوئے۔ وہ کٹر آریہ سماجی تھے، "ڈھونگی فقیروں" سے انہیں ایک نیچرل چڑھ تھی۔ موہن کو ڈانٹا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ باتیں نہ کیا کرے۔ سائیں ہنس پڑا، چلا گیا۔

اُس کے بعد آج کئی دن بعد سائیں آیا اور وہ جان بوجھ کر اس لڑکے کے مکان پر نہیں گیا، لیکن لڑکا اپنے مدرسہ سے لوٹ رہا تھا، اس نے دیکھ کر پکارا ——— اور وہ لوٹ بھی آیا۔

"موہن!"

"تم آجکل آتے نہیں؟"

"تمہارے بابا خفا ہوتے ہیں۔"

"نہیں، تم روٹی لے جایا کرو۔"

"بھوک نہیں لگتی!"

"اچھا کل ضرور آنا ——— بھولنا مت!"

اتنے میں ایک دوسرا لڑکا سائیں کا گوڈڑ لیکر بھاگا۔ گوڈڑ لینے کو سائیں اُس لڑکے کے پیچھے دوڑا۔ موہن کھڑا دیکھتا رہا۔ سائیں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

چوراہے تک دوڑتے دوڑتے سائیں کو ٹھوکر لگی، وہ گر پڑا۔ سر سے خون بہنے لگا۔ چڑانے کے لئے جو لڑکا گوڈڑ لیکر بھاگا تھا وہ ڈر کر ٹھٹھک گیا۔ دوسری طرف سے موہن کا باپ آرہا تھا، اس نے اُسے پکڑ لیا، اور دوسرے ہاتھ سے سائیں کو پکڑ کر اٹھایا۔ شریر لڑکے کے سر پر چپتیں پڑنے لگیں۔ سائیں گھبرا گیا۔

"مت مارو! مت مارو!! چوٹ لگتی ہوگی!" سائیں نے کہا! اور لڑکے کو چھڑانے لگا۔

"تب چیتھڑے کے لئے دوڑتے کیوں تھے؟" موہن کے باپ نے سائیں سے پوچھا۔

سر پھٹنے پر بھی جسے رونا نہ آیا تھا، وہی سائیں لڑکے کو روتے دیکھ کر رونے لگا۔ اس نے کہا "بابا! میرے پاس دوسری کون چیز ہے جسے دیکر ان 'رام روپ بھگوان' کو خوش کرتا؟"

"تو کیا تم اس لئے گوڈڑ رکھتے ہو؟"

"اس چیتھڑے کو لیکر بھاگتے ہیں 'بھگوان' اور میں ان سے لڑکر چھین لیتا ہوں، رکھتا ہوں پھر انہیں سے چھنوانے کے لئے، یا اُن کے خوش کرنے کے لئے! سونے کے کھلونے تو اُچکّے بھی چھین لیتے ہیں، مگر چیتھڑوں پر بھگوان ہی دیا کرتے ہیں!" اتنا کہہ کر لڑکے کا منہ پونچھتے ہوئے، ساتھی کی طرح، گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے سائیں چلا گیا۔

موہن کے باپ نے تعجب سے کہا "گوڈڑ سائیں! تم صرف گوڈڑ سائیں نہیں ——— گوڈڑی کے لعل ہو!"

(پرت دھون) کنھیا لال

عربی

دربار اموی میں ایک فاطمی لڑکا

حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو جب خلافت ملی تو لوگ دُور دُور سے مبارکباد دینے کے لئے دربار خلافت میں حاضر ہوئے۔ دربار اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ قائم تھا، امیرالمومنین تخت خلافت پر متمکن تھے، امراء صف در صف اپنے اپنے مرتبوں کے مطابق مرصع کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، مختلف قبیلوں کے معمر سردار یکے بعد دیگرے مبارکباد عرض کرنے کے لئے دربار میں حاضر ہو رہے تھے۔ کہ ایک بے ریش وبروت نوعمر حجازی لڑکا اپنے قبیلہ کی طرف سے مبارکباد عرض کرنے کے لئے آگے بڑھا، خلیفہ نے کہا اے لڑکے! کسی اپنے سے بڑی عمر والے سردار کو گفتگو کے لئے پیش کر۔

لڑکے نے جواب دیا اے امیرالمومنین جب خدا اپنے بندے کو اس کو یاد کرنے والا دل اور بولنے والی زبان عطا کر دے تو وہ گفتگو کا مستحق ہے، اور اے امیرالمومنین اگر فضیلت عمر کے لحاظ سے ہوتی تو اس وقت امت میں جو آپ سے بڑی عمر والے ہیں وہ تخت پر بیٹھے ہوتے۔

امیرالمومنین لڑکے کی معقول گفتگو سے مرعوب ہو گئے اور اُنہوں نے کہا اے لڑکے تو کیا کہنا چاہتا ہے؟

لڑکے نے ادب کے ساتھ جواب دیا حضور والا ہم مبارکباد عرض کرنے آئے ہیں۔ خدا نے آپ جیسا عادل خلیفہ مقرر کرکے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔

امیرالمومنین نے آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اے لڑکے مجھے کچھ نصیحت کر۔

لڑکے نے جرأت کے ساتھ جواب دیا، بہت سے ایسے بادشاہ گزرے ہیں جو خدا کے حلم پر مغرور ہو گئے اور نہ سمجھے کہ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ خوشامدی مصاحبوں نے ان کو رعایا کے حالات سے غافل کرکے نفس پروری میں پھنسا دیا۔ بیشک ایسے لوگ جلتی ہوئی آگ کا ایندھن ہیں۔ اے امیرالمومنین ہماری دعا ہے کہ آپ ایسے لوگوں میں شامل نہ ہوں۔ اور آپ کا حشر امت کے نیک لوگوں کے ساتھ ہو۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز لڑکے کی فصاحت حکمت اور جرأت سے بہت متعجب ہوئے۔ آپ نے اس کی عمر اور حسب نسب پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ خاندان نبوت کا ایک گُلِ نودمیدہ ہے اور اس نے ابھی اپنی عمر کی محض دس بہاریں دیکھی ہیں۔

(مورخ)

انگریزی

محبّت وعظمت

اُونہہ! ایسے پست فطرت انسان کا میرے سامنے کیا مذکور جو داستان کا ہیرو ہے پر فخر کرے!——

ہماری جوانی کی عشق بیز مہمات ہماری سچی عظمت وشان کی تاریخ ہیں!

ایک مست شباب نونہال کے لئے جنگل کا ایک پھول قسمتوں کے سُنہرے ہاروں سے کہیں زیادہ قابلِ قدر ہے اُطرّے اور کلغیاں اس پیشانی کے لئے نہیں نہیں جن پر جھُرّیاں آگئی ہوں۔ جس طرح ایک مرجھائے ہوئے پھول کے رخسارے پر ابر بہار کے قطرے بے رونق معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح مُخطّط پیشانی پر عظمت وشوکت کا تاج بھی بُھندا اور بے محل نظر آتا ہے!!

میری نگاہ میں تو ایسے ہاروں، ایسے تاجوں اور ایسے طُرّے اور کلغیوں کی ذرا بھی عزت نہیں جن کا مقصد صرف شان ہو ——